

مارچ 2026

یکدہنری

شعاع



بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

ڈاکس اپ

03172266944

باقی محمود ریاض

مدیر تنظیم — اختر ریاض

مدیر — رخصتہ جمیل

مدیر قلم — امت الصبوح

فلاحی ڈون — شاہین رشید

قانونی مشیر — نور الدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ بکلائزر

مارچ 2026
جلد 39 نمبر 07
قیمت 150 روپے



آہ نیم کش، آسیہ دتیس خان 124

روشنی سائمنہ تھی، صدقہ عمر 62



شکر نعمت، نگہت اعظمی 100

مُسکراہٹ عید، اُمّ اقصیٰ 172



چھوٹی سی بات، عمارہ احمد 55

قراڑیے، دانیہ سیح 58

چاٹ مسالہ، حیرا خان 118

6

اقبال عظیم
عبدالحمید صدیقی

8

ادارہ



یمنی احمد سے ملاقات، شاہین رشید 25

جب تجھ سے نانا، س. ظ 13



بہاریں عید کی، ادارہ 18



دھوپ و دیکھ، موسم عزیز 32

گنگا کنارے، نعیمہ تان سلطان 152

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، افسانہ کو کسی بھی اخبار سے نہ شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹیلی ویژن چینل پر ڈراما کی شکل میں اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



روزنامہ پاکستان کی سہ ماہی
 قیمت (سالانہ) ————— 1,800 روپے
 امریکی پینٹ ہاؤس ————— 50000 روپے
 سالانہ اشتہار کی قیمت —————
 subscriptions@khawateendigest.com

MEMBER
 APNS
 CPNE
 رکن آل پاکستان نوز بچہ رسوائی
 رکن کونسل آف پاکستان نوز بچہ ڈائریکٹرز

گڈی آپا، گوشہ جہاں 189
 عید کی خوشیاں، نظیر فاطمہ 97



غزل، حسن نقوی 196
 نظم، ناہید مری 196



خطبات و کتابت کا پیگہ
 ماہنامہ شمع
 37- ارگودیا لاکھ پور

خط آپ کے، ادارہ 29

197 ادارہ، مسکراہٹیں 198 شگفتہ جاہ،

208 واصفہ سہیل، سوچ کے پیکوان 200 واصفہ سہیل، کھٹا کسی پتہ

210 ادارہ، خوبصورت تہنہ 201 امت الصبور، تارخ کے جھوکے

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
 Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com



شعاع مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں

یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو آپ رمضان المبارک کے آخری عشرے کی عبادتوں کے ساتھ ساتھ عید کی تیاریوں میں مصروف ہوں گی۔

جب بندے اللہ تعالیٰ کا حکم بجالاتے ہوئے رمضان المبارک کے روزے رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی رحمت و بخشش نازل فرماتا ہے اور انہیں انعام میں عید کا دن عنایت فرماتا ہے۔ عید کے لغوی معنی خوشی کے ہیں اس لیے اس دن کو عید کا نام دیا گیا۔

عید اجتماعی تہوار ہے۔ اس کے رنگ تب ہی نکھرتے ہیں جب سب خوش ہوں۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالیں۔ کچھ لوگ عید کی خوشیاں خریدنے کی سکت نہیں رکھتے۔ سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے وہ کسی کے سامنے دست سوال بھی دراز نہیں کر سکتے۔ خاموشی اور رازداری کے ساتھ ان کی مدد کر کے دعائیں کیئیں تاکہ ان کی سفید پوشی کا بھرم قائم رہے۔

خصوصاً اپنے مستحق عزیز و اقارب اور رشتہ داروں کا خیال رکھیے۔ اس کا دوا ہر اجر ہے۔

آپ سب کو ادارہ شعاع کی جانب سے دلی عید مبارک

ہماری دعا ہے کہ روز عید آپ کے لیے اور آپ سے منسلک افراد کے لیے بے شمار خوشیاں اور محبتیں لے کر آئے۔

اس شمارے میں

- ☆..... صدف عمر کا مکمل ناول..... روشنی سامنے تھی
- ☆..... آسہ رئیس کا مکمل ناول..... آہ نیم کش
- ☆..... ام اقصیٰ اور نگہت اعظمی کے ناولٹ
- ☆..... عمارہ صفدر، دانیہ سمیع، حرا خان، نظیر فاطمہ اور گوشتی جمال کے افسانے
- ☆..... نعیمہ ناز اور مریم عزیز کے ناول
- ☆..... بہاریں عید کی..... قارئین سے سروے
- ☆..... یمنی احمد سے ملاقات
- ☆..... معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ دستک
- ☆..... پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

سبحانہ تعالیٰ



مدِ شکر کہ یوں دردِ دہاں حمدِ خدا ہے
وہ سب سے بڑا، سب سے بڑا، سب سے بڑا ہے
اس کا کوئی ثانی، نہ مشابہ، نہ مقابل
وہ سب سے جدا، سب سے جدا، سب سے جدا ہے
کافر ہو کہ مسلم، کوئی مشرک ہو کہ مومن
وہ سب کا خدا، سب کا خدا، سب کا خدا ہے
وہ خالقِ کونین بھی، رزاقِ جہاں بھی
وہ ربِّ مٹی، ربِّ پتھر، ربِّ پانی ہے
یہ رنگ، یہ خوشبو، یہ بہاریں، یہ فضا میں
سب اس کی عطا، اس کی عطا، اس کی عطا ہے
معراجِ عبادت بھی، معراجِ سخن بھی
صرف اس کی ثنا، اس کی ثنا، اس کی ثنا ہے
اقبالِ لیے جاؤ سدا نامِ خدا کا
بھول کی بنا، غم کی دعا، دکھ کی ٹٹا ہے
اقبالِ عظیم



نگاہِ خلق و نگاهِ خدا گما، بنے
میں کہہ رہا ہوں کہ وہ مرکزِ نگاہ بنے
جہاں پناہ بنے اور کج گماہ بنے
قلامِ ان کے، دہلے کے سربراہ بنے
وہ ذاتِ پاک جو مہمانِ عرشِ اعظم ہو
نہ کیوں نشانِ شرفِ رشکِ جزویا بنے
ہیں آسمانِ نبوت کے انبیاءِ مہتاب
خدا کے فضل سے لیکن وہ رشکِ مام بنے
خبر ان سے ملی لا الہ الا للہ
وگرنہ پہلے تو بُت بھی مرے الہ بنے
ترے اشارۃ ابرو پہ ہائے قرباں
قدمِ قدم پہ مجھے مانعِ گناہ بنے
اسی کے دامنِ رحمت میں ہے جہاں اسکی
بروزِ عشر بھی جو دامنِ پناہ بنے
جدا لہِ مددِ حق



نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں: میں اپنا پیٹ بھوک کی شدت سے زمین پر ٹیک دیتا تھا اور (اسی طرح بعض دفعہ) بھوک کی شدت سے میں اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا۔ ایک روز میں اس راستے پر بیٹھ گیا جہاں سے لوگ گزرتے تھے۔ چنانچہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ (میرے پاس سے) گزرے تو میں نے ان سے کتاب اللہ کی ایک آیت کے متعلق پوچھا۔ میں نے تو ان سے اس لیے پوچھا تھا کہ وہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں، لیکن وہ گزر ہی گئے اور کچھ نہ کیا۔ پھر میرے پاس سے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ گزرے تو میں نے ان سے قرآن مجید کی ایک آیت کے متعلق پوچھا۔ میں نے تو ان سے بھی اسی لیے پوچھا تھا کہ وہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں، لیکن وہ بھی گزر گئے اور انہوں نے بھی کچھ نہ کیا۔

پھر میرے پاس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مجھے دیکھا اور مسکرائے اور میرے چہرے اور دل کی کیفیت کو جان گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”ابو ہریرہ“

میں نے کہا: ”حاضر اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ساتھ آؤ۔“ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم چل پڑے۔ میں

بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہولیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ میں نے اجازت طلب کی تو مجھے بھی اجازت مرحمت فرمادی اور میں بھی اندر چلا گیا۔

وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا ایک پیالہ پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔

”یہ دودھ کہاں سے آیا؟“

گھر والوں نے کہا: ”فلاں مرد یا فلاں عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہدیہ بھیجا ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”ابو ہریرہ!“ میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (فریے) حاضر ہوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اہل صفہ کے پاس جاؤ اور انہیں میرے پاس بلا لاؤ۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اہل صفہ (درس گاہ نبوی کے طلباء) اسلام کے مہمان تھے۔ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، گھر بار تھا نہ کوئی مال اور نہ کسی اور کا سہارا۔ جب بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقے کی کوئی چیز آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بھیج دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس میں سے کچھ نہ لیتے۔ اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ہدیہ آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بلا بھیجتے اور خود بھی اسے استعمال فرماتے اور انہیں بھی اس میں شریک فرماتے۔ چنانچہ اپنی اس عادت مبارکہ کے مطابق

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اہل صفہ کو بلا لاؤ۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر میں سوچنے لگا (کہ ایک پیالہ دودھ ہے اور میں بھوک کی شدت سے غم حال ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پلانے کے بجائے فرما رہے ہیں کہ اہل صفہ کو بلا لاؤ۔)

میں نے (دل میں) کہا۔ اس دودھ سے اہل صفہ کا کیا بنے گا! میں اس بات کا زیادہ حق دار ہوں کہ میں اتنا پی لوں جس سے میں طاقت حاصل کر لوں۔ چنانچہ جب وہ آئیں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ہی حکم دیں گے کہ میں انہیں دوں، اور مجھے امید نہیں کہ اس دودھ کا کچھ حصہ مجھے بھی ملے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بغیر چارہ نہیں۔

چنانچہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق) میں ان (اہل صفہ رضی اللہ عنہم) کے پاس آیا اور انہیں بلایا، تو وہ سب آئے اور اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دے دی اور وہ گھر میں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”اے ابو ہریرہ!“

میں نے کہا۔

”حاضر ہوں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ پیالہ پکڑو اور انہیں دو (بای باری پیش کرو)۔“

چنانچہ میں نے پیالہ لیا اور ایک ایک آدمی کو دینے لگا۔

ایک کو دیتا، تو وہ پیتا یہاں تک کہ سیراب ہو جاتا، پھر وہ پیالہ مجھے لوٹا دیتا۔

میں وہ دوسرے کو دیتا، پس وہ پیتا حتیٰ کہ سیراب ہو جاتا، پھر وہ پیالہ مجھے لوٹا دیتا۔

پھر (اگلا آدمی) پیتا اور سیراب ہو کر مجھے واپس لوٹا دیتا۔

یہاں تک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا اور سب لوگ پی کر سیراب ہو چکے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ پکڑا اور اس پر ہاتھ رکھا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا!

”اے ابو ہریرہ!“

میں نے کہا۔ ”حاضر ہوں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اب میں اور تم ہی باقی رہ گئے۔“

میں نے کہا۔ ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے سچ کہا۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بیٹھ جاؤ ادھر، پیو!“

چنانچہ میں بیٹھ گیا اور دودھ پیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا۔ ”اور پیو۔“

میں نے پھر پیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے ”پیو!“ (اور میں پیتا رہا) یہاں تک کہ میں نے کہا۔

”قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا! اب میں کوئی گنجائش اس کے لیے اسے اندر نہیں پاتا۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اچھا مجھے دکھاؤ۔“ چنانچہ وہ پیالہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور اس کا نام لیا اور (سب کا) بچا دودھ پی لیا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل

- (1)۔ اس میں معجزہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اصحاب صفہ کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کا خیال رکھنے کا بیان ہے۔
- (2) نبی صلی اللہ علیہ وسلم صدقے کی نہیں

اور رات کو اٹھنا بھی نہایت گراں گزرتا ہے، پھر نرم
بستر پر نیند بھی زیادہ گہری آتی ہے۔

عیادت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے
ہوئے تھے کہ ایک انصاری آدمی آیا اور آپ صلی
اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، پھر وہ واپس جانے لگا تو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے انصار کے بھائی! میرے بھائی سعد
بن عبادہ کا کیا حال ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہیں۔“
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم
میں سے کون ان کی عیادت کے لیے تیار ہے؟“

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے
اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھ
کھڑے ہوئے اور ہم دس سے کچھ اور پر تھے۔

ہمارے پاس جوتے تھے نہ موزے، ٹوپیاں ہمیں نہ
تھیں۔ اس شوریلی زمین میں ہم پیدل چل رہے
تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچ گئے۔ چنانچہ
ان کے گھر والے، ان کے پاس سے پیچھے ہٹ
گئے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور
صحابہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، وہ ان
کے قریب ہو گئے (مسلم)

فوائد و مسائل

(1) اس حدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ
نے اپنی جو کیفیت بیان کی ہے، اس کی مناسبت
باب ہے واضح ہے کہ ان میں کس قدر غربت اور
سادگی تھی۔

(2) دوسرا نکتہ اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اپنا
بھائی کہا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کے
ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رشتہ دینی اخوت

کا بھی ہے۔

(3) جگہ تنگ ہو تو گھر والوں کو چاہیے کہ
مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کے لیے جگہ خالی
کر دیں تاکہ وہ مریض کے پاس چند لمحے بیٹھ کر
مریض کی عیادت کر لیں۔

مال جمع کرنا

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت
ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اے فرزند آدم! اگر تو زائد از ضرورت مال
اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا تو تیرے مال کے لیے
بہتر ہوگا اور اگر تو اسے روکے گا تو تیرے لیے برا
ہوگا اور برابر سراپر مال پر تو ملامت کے لائق نہیں
ہوگا۔ اور (خرچ کرنے کی ابتدا ان لوگوں سے کر
جن کے اخراجات زندگی کا ذمہ دار تو ہے۔“ (اسے
ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث
حسن صحیح ہے)

(1) اس میں جہاں اپنی اور اپنے اہل و عیال
کی ضرورت کے مطابق مال رکھنے کی اجازت بلکہ
تاکید اور حکم ہے، وہاں دوسری طرف ضرورت سے
زائد مال کو ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کا
استحباب بھی ہے۔

(2) مال کے روکے رکھنے کو ان کے حق
میں برا قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ دنیا اور
آخرت دونوں جگہ صحیح نہیں۔ دنیا میں دولت کے
ارتکاز (جمع کرنے) سے گردش دولت رک جاتی
ہے۔ جس سے معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا
ہوتی ہیں اور آخرت میں تو اس بخل کا انجام بد واضح
ہی ہے۔

(3) بعض علما کے نزدیک سالانہ زکاۃ کی
ادائی کے بعد مزید خرچ کرنا ضروری نہیں۔ لیکن صحیح
ترہات یہ ہے کہ زکاۃ کی ادائی کے بعد بھی اگر کسی
کے پاس دولت موجود رہے اور اہل حاجت بھی
اس کے علم میں ہوں تو ان پر خرچ کرنا اس کے لیے

اور رات کو اٹھنا بھی نہایت گراں گزرتا ہے، پھر نرم بستر پر نیند بھی زیادہ گہری آتی ہے۔

عیادت

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک انصاری آدمی آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، پھر وہ واپس جانے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اے انصار کے بھائی! میرے بھائی سعد بن عبادہ کا کیا حال ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہیں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم میں سے کون ان کی عیادت کے لیے تیار ہے؟“
چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم دس سے کچھ اوپر تھے۔ ہمارے پاس جوتے تھے نہ موزے، ٹوپیاں تھیں نہ قمیصیں۔ اس شوریلی زمین میں ہم پیدل چل رہے تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچ گئے۔ چنانچہ ان کے گھر والے، ان کے پاس سے پیچھے ہٹ گئے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، وہ ان کے قریب ہو گئے (مسلم)

فوائد و مسائل

(1) اس حدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے اپنی جو کیفیت بیان کی ہے، اس کی مناسبت اس سے واضح ہے کہ ان میں کس قدر غربت اور سادگی تھی۔

(2) دوسرا نکتہ اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اپنا بھائی کہا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رشتہ دینی اخوت

کا بھی ہے۔

(3) جگہ تنگ ہو تو گھر والوں کو چاہیے کہ مزاج پر ہی کے لیے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کر دیں تاکہ وہ مریض کے پاس چند لمحے بیٹھ کر مریض کی عیادت کر لیں۔

مال جمع کرنا

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”اے فرزند آدم! اگر تو زائد از ضرورت مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا تو تیرے مال کے لیے بہتر ہوگا اور اگر تو اسے روکے گا تو تیرے لیے برا ہوگا اور برابر سراب مال پر تو ملامت کے لائق نہیں ہوگا۔ اور (خرچ کرنے کی ابتدا ان لوگوں سے کر جن کے اخراجات زندگی کا ذمہ دار تو ہے۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے)

(1) اس میں جہاں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت کے مطابق مال رکھنے کی اجازت بلکہ تاکید اور حکم ہے، وہاں دوسری طرف ضرورت سے زائد مال کو ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کا احتباب بھی ہے۔

(2) مال کے روکے رکھنے کو انسان کے حق میں برا قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ صحیح نہیں۔ دنیا میں دولت کے ارتکاز (جمع کرنے) سے گردش دولت رک جاتی ہے۔ جس سے معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور آخرت میں تو اس بخل کا انجام بد واضح ہی ہے۔

(3) بعض علما کے نزدیک سالانہ زکاۃ کی ادائیگی کے بعد مزید خرچ کرنا ضروری نہیں۔ لیکن صحیح تر بات یہ ہے کہ زکاۃ کی ادائیگی کے بعد بھی اگر کسی کے پاس دولت موجود رہے اور اہل حاجت بھی اس کے علم میں ہوں تو ان پر خرچ کرنا اس کے لیے

مستحب ہی نہیں، ضروری ہے۔

فوائد و مسائل

(1) کامیابی آخرت میں اللہ کی رحمت و مغفرت سے شاد کام ہونا ہے اور اللہ کی رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ اگر بدقسمتی سے انسان کا دامن دولت اسلام سے خالی ہے تو دنیا بھر کے خزانے بھی اسے اخروی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔ بلکہ دنیا سے آنکھیں موند لینے کے بعد عذاب الہی کے شکنجے میں کس دیا اور جہنم کی بیڑیوں میں اسے جکڑ دیا جائے گا اور یوں یہ ناکام ترین انسان ہوگا۔

(2) اسی طرح بقدر کفاف (روزمرہ ضرورت کے مطابق) روزی کے ساتھ قناعت و استغفار کامل جانا بھی امن و سکون کی ضمانت ہے۔ ورنہ دنیا کی حرص اور زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی خواہش اور کوشش انسان کا سکون چھین لیتی ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تو ٹگری زیادہ ساز و سامان کا نام نہیں بلکہ اصل تو ٹگری نفس کی تو ٹگری ہے۔

زید

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی راتیں متواتر بھوکے گزار دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو بھی رات کا کھانا میسر نہ ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر روٹی، جو کی روٹی ہوتی۔ (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے)

فوائد و مسائل

اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے زہد اور تنگ دستی کا تذکرہ ہے۔

☆☆

کافی ہے

حضرت عبید بن حصن انصاری عظمیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جو شخص تم میں سے اس حال میں صبح کرے کہ وہ اپنے گھریا قوم میں امن سے ہو، جسمانی لحاظ سے تندرست ہو اور ایک دن کی خوراک اس کے پاس موجود ہو تو گویا اس کے لیے دنیا اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ جمع کر دی گئی۔“ (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل

(1) امن اور صحت کے ساتھ ایک دن کی خوراک فی الواقع بہت بڑی نعمت ہے، گویا اسے ایسی آسودگی حاصل ہوگئی جیسی کسی کو ساری دنیا مل جانے پر ہو سکتی ہے۔ اور اگر امن یا صحت نہ ہو تو دنیا بھر کے خزانے بھی انسان کے لیے بے کار ہیں کیونکہ دولت کے انبار انسان کو امن فراہم کر سکتے ہیں نہ صحت۔

(2) اس میں بالواسطہ یہ نصیحت بھی ہے کہ انسان کو دولت کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے بلکہ صبر و قناعت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ اسی میں امن و سکون اور راحت و آسائش ہے ورنہ اس سراب کے تعاقب میں سب کچھ گنوا بیٹھنے کا خدشہ ہے۔

کامیاب

حضرت عبداللہ بن عمر و بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اسلام قبول کر لیا اور اسے برابر برابر روزی حاصل ہوئی اور اللہ نے اسے اپنے دیے ہوئے پر قانع بنا دیا۔“

جب تجھ سے نانا جوڑا ہے

س۔ ظ

تھے۔ ماموں نے ایک دفعہ صرف اشارہ کیا تھا کہ آپ کی آنٹی کے بھائی ٹھیک ہیں۔ ظفر صاحب میری آنٹی (مائی) کے بھائی تھے میں نے خاموش رہ کر نیم رضا مندی کا اظہار کیا۔ یوں رشتے کی بات شروع ہوئی اور پھر دونوں طرف کے فیملی ممبران نے بات کو آگے بڑھایا اور بات منگنی تک پہنچ گئی۔ یوں یہ رشتہ طے ہو گیا۔ ویسے رشتہ طے ہونے پر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ کیونکہ میں نے ان کے گھر کا ماحول دیکھا ہوا تھا۔

س۔ ذہن میں جیون ساتھی کا کوئی تصور تھا نیز کیا خوبیاں تھیں؟

ج۔ میں نے بتایا نا، ابھی گڑیوں سے کھیلنے کے دن تھے۔ اسکول جانا بیماری کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اس لیے گھر میں ہی دوستوں کے ساتھ کھیل کود اور خوش گپیوں میں دن گزرتا تھا، میری ایک دوست جو میری ہمسائی بھی تھی۔ اس کے ساتھ زیادہ وقت گزرتا تھا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ تو میل جول ذرا کم ہو گیا۔ مگر وہ جب بھی اپنی میکے آتی تو ہمارا کٹھے وقت گزرتا تھا۔ جہاں تک جیون ساتھی کے تصور کی بات ہے تو ایسا ابھی تک سوچا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے نہیں علم تھا بلکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میری شادی اتنی جلدی اور اس عمر میں ہو جائے گی۔

البتہ جب میری دوست کی شادی ہو گئی اور اس کا خاوند اس کو لینے آتا۔ تو شادی شدہ زندگی کا کچھ تصور ذہن میں ابھرنے لگا تھا۔ مگر میرا شوہر کیسا ہو۔ اس میں کیسی خوبیاں ہوں۔

ایسی باتیں ابھی تک میرے ذہن میں پیدا نہیں ہوئی تھیں۔ حالانکہ ہم جو انٹ فیملی میں رہتے تھے اور میری نانا زاد بہن کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس کے مہاں کا آنا جانا بھی گھر میں لگا رہتا تھا۔ مگر پھر

شادی ایک خوب صورت بندھن ہے جس میں دو خاندانوں کا ملاپ ہوتا ہے اور ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو آئیے میرے حالات زندگی کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔

س۔ شادی کب ہوئی؟

ج۔ میری شادی 27 نومبر 1992ء کو ہوئی تھی۔ میں نے ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا کہ میرا رشتہ طے ہو گیا۔ شادی اپنے خاندان میں ہی ہوئی۔ ظفر صاحب تعلیم یافتہ تھے اور میری تعلیم واجبی سی ہے۔ دراصل جب میں ابھی اسکول کی طالبہ تھی۔ کچھ بیمار رہنے لگی تھی۔ جس کی بنا پر اسکول جانا بند ہو گیا اور تعلیم ادھوری رہ گئی۔

س۔ شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے اور دلچسپیاں.....؟

ج۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت سادہ تھا۔ والدین زمین دار تھے مگر رہائش شہر میں تھی۔ اس وجہ سے گاؤں اور شہر دونوں قسم کے ماحول کی جھلک گھر میں نظر آتی تھی۔ ہمسایوں کے بچوں سے دوستی تھی ان سے ہی کھیل کود میں دن ختم ہو جاتا تھا۔ ماں باپ کی اکلونی بیٹی تھی۔ اس لیے کام کاج کرنے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔

س۔ اس رشتے میں آپ کی رضا مندی شامل تھی یا والدین کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت ٹائٹ قسم کا تھا۔ رشتے میں عورتوں کی رضا مندی لینے کا تصور نہیں تھا۔ عورتوں کا بازار تک جانا پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ شادی بیاہ کی خریداری تک کا سامان مرد حضرات ہی کرتے تھے۔ میرے رشتے کے لیے ابو نے میرے ماموں کی ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ رشتہ آپ نے ڈھونڈنا ہے۔ ظفر صاحب

بھی اپنے ہونے والے میاں کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا کہ وہ کیسا ہونا چاہیے یا اس میں کس قسم کی خوبیاں ہونی چاہئیں۔

شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ہمارے ہاں کا ماحول بہت پابندیوں والا تھا جس کا کچھ ذکر میں کر بھی چکی ہوں یا یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے خاندان میں مرد حضرات کا عورتوں پر بہت رعب ہوتا تھا۔ عورت کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ مرد کے آگے چوں چرا کر سکے۔ ذرا سی زبان کھولنے پر عورت کو تشدد کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

س۔ ممکن کتنا عرصہ رہی؟ شادی سے پہلے فون پر بات یا ملاقات وغیرہ.....

ممكن تقریباً چھ یاہ رہی، اس زمانے میں فون جیسی سہولت عام نہیں تھی۔ بات کرنا اور ملاقات کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ نہ بھی سوچا کیونکہ یہ دونوں باتیں ہمارے خاندان میں معیوب بھی جانی جاتیں۔ ویسے بھی میں عام سی، بھولی بھالی اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔

ظفر صاحب شادی کے بعد بھی میری عادتوں اور باتوں کی وجہ سے مجھے اللہ میاں کی گائے کہہ کر چھیڑتے تھے۔ ظفر صاحب چونکہ قریب کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ اس لیے ان کو کئی بار دیکھا تھا۔ مگر اس وقت ممکن نہیں ہوئی تھی۔ اور پسندیدگی والی بات تو دماغ میں دور دور تک نہ گئی۔

س۔ شادی سے پہلے آپ کے سرال والوں کے متعلق کیا خیالات تھے۔

ج۔ ابھی میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ شادی کے بندھن میں بندھ گئی۔ سرال والوں کے متعلق بھی سوچا نہیں تھا نہ خواب دیکھے تھے کہ ایسا سرال ہونا چاہیے۔ مگر سرال میں میرا بہت خیال رکھا گیا۔ میری مندی پر بھی لکھی گئی تھی۔ ابھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔ میری ساس نے بہت تعاون کیا۔ بیٹیوں کی طرح میری رہنمائی کی۔

س۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے لین دین میں کوئی بد مزگی ہوئی؟

ج۔ میرے سرال والے مذہبی قسم کے لوگ تھے۔ انہوں نے ہمیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم بینڈ باجا نہیں بجائیں گے۔ جبکہ میرے والدین اپنی برادری اور رشتہ داروں میں بیٹھے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ بینڈ باجا بجائیں۔ اور بینڈ باجے نہ ہونے کی وجہ سے ان کا موڈ کچھ خراب تھا۔

میرے سرال والے وڈیو فلم بنارہے تھے۔ جب میرے جیٹھ نے میرے ابو سے فرمائش کی کہ دولہا کی دودھ پلائی کی رسم کی ہم نے ویڈیو بنانی ہے تو انہوں نے اجازت نہ دی۔ جس پر میرے جیٹھ خاموش ہو گئے۔ بس اتنی سی بد مزگی یا ناراضی ہوئی۔ مگر یہ معمولی قسم کی تھی۔ اس میں تلخ کلامی نہیں ہوئی نہ ہی بات کو زیادہ طول دیا گیا۔ دونوں فریق خاموش ہو گئے اور دودھ پلائی کی رسم بغیر کمرے کے خاموشی کے ساتھ انجام دی گئی۔ باقی لین دین کے متعلق سارے معاملات پہلے ہی طے پا چکے تھے اس لیے اس کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔

س۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج۔ شوہر نے مجھے شادی سے پہلے ہی میک اپ کے بغیر دیکھا ہوا تھا۔ اس لیے کوئی خاص بات نہیں کی، صرف اپنے گھر کے ماحول اور دیگر رشتوں کے متعلق بتایا کہ ان کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے کیونکہ میری مین مندی ابھی غیر شادی شدہ تھیں۔ انہوں نے میرا بہت خیال رکھا اور ہر موقع پر میری رہنمائی کی۔ میری مندی عمر میں مجھ سے بڑی تھیں اس لیے میں نے ان کو بہت عزت دی۔ ان کا احترام کیا۔

س۔ شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج۔ کام کے معاملے میں۔ میں تو بالکل پھوپڑ تھی۔ مگر مندوں کی رہنمائی میں شادی کے چار پانچ

دن بعد زردہ پکا کر اہل محلہ میں تقسیم کیا۔ ہنڈیا اور روٹی پکائی جو میں نے سسرال میں آ کر کھیں۔ اس موقع پر میری نندوں اور ساس نے میرا بہت ساتھ دیا۔
س۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف اور کن پر تنقید ہوئی؟

ج۔ میری نندیں میری والدہ کی رشتے میں کچھ دور کی کزنز تھیں۔ گھروں میں آنا جانا بھی تھا۔ ایک دوسرے کے ماحول کو دیکھا ہوا تھا۔ اس لیے میری کسی بات پر تنقید نہیں ہوئی اور مجھ میں کوئی ایسی خاص بات یا خوبی نہ تھی جس پر تعریف ہوئی۔ اس لیے ماحول نیوٹرل ہی رہا۔

س۔ سسرال والوں نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا۔ گھریلو امور اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟

ج۔ جی ہاں! میرے سسرال والوں نے میری بہت عزت افزائی کی۔ گھریلو کام کاج میں مہارت نہ ہونے کے باوجود کبھی تنقید کا نشانہ نہیں بنایا۔ ظفر صاحب بھائیوں میں چھوٹے تھے۔ اس لیے ان کی بہنوں نے شادی دھوم دھام سے کی۔ ہلا گلابی خوب کیا۔ مجھے بھی سپورٹ کیا۔ مجھے بہت خوش رکھا۔ بلکہ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہمارا ماحول (میکے والا) ٹھن والا تھا۔ مرد حضرات عورتوں کو اتنی عزت نہیں دیتے تھے۔ عورتوں پر رعب ڈال کر رکھتے تھے۔ اس لیے مکی بات تو یہ ہے کہ شروع میں چند سال تو میرا اپنے میکے جلدی جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ والد کا اصرار تھا کہ مجھ سے ملنے مہینے کے بعد آ جایا کرو۔ پھر ان کو دیکھتے ہوئے میں میکے چلی جاتی۔

اور میں دل پر، پتھر رکھ کر بتا دوں کہ میرے والد شادی سے پہلے تو میری والدہ پر بلا وجہ معمولی بات پر تشدد کر دیتے تھے اور ان کی یہ عادت شادی کے بعد بھی نہ گئی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں ان کے لیے مغفرت کی دعا ہی کر سکتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطا میں معاف فرمائے۔ آمین۔

س۔ سسرال والوں سے وابستہ توقعات

کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج۔ شادی کے بعد مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ میں جنت میں آ گئی ہوں۔ سسرال والوں نے میرا بہت زیادہ خیال رکھا۔ میری نندیں، میری ساس، میرا سسر..... مجھے بہت چاہتے تھے۔ میرا ہر لحاظ سے خیال رکھتے تھے۔ ایک بار میں واشنگ مشین پر کپڑے دھو رہی تھی کہ گرٹ لگ گیا اور میں نیچے گر گئی۔ گھر والے میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ میرے سسر اس وقت گھر میں نہیں تھے۔ باہر کہیں کام سے گئے تھے۔ عین اس وقت وہ بھی گھر میں داخل ہوئے تو مجھے اس حالت میں دیکھ کر رونے لگ گئے کہ ہماری بہو کو کیا ہو گیا۔

ظفر صاحب بھی مذہبی ذہن کے مالک تھے۔ وہ کبھی کبھار میرا مذاق اڑا لیتے تھے مگر خیال انہوں نے بھی بہت رکھا۔ اور ظفر صاحب کی عادتیں اور مزاج اتنا اچھا ہے کہ ہمارے خاندان میں سب ان کی تعریف کرتے ہیں حتیٰ کہ میرے میکے میں ان کے مداح ہیں۔ اب بیماری کے باعث میری طبیعت میں غصہ آ گیا ہے وہ مجھے مذاق میں کچھ کہہ دیتے ہیں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں ناراض ہوتی ہوں تو وہ ہنس کر ٹال دیتے ہیں بچے بھی مجھے سمجھاتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ جیسا سسرال مجھے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ سب کی بیٹیوں کو ایسا سسرال اور اتنا اچھا شوہر دے۔ سسرال اور شوہر اچھا ہو تو زندگی بہت آسان اور شان دار ہو جاتی ہے۔ بے شک دنیا کا مال کم بھی ہو۔ سکون مل جاتا ہے لیکن اگر سسرال یا خاندان اچھا نہ ہو مگر دنیا کا سارا مالی ہو تو سکون نہیں ہوتا، سکون ایک بڑی دولت ہے۔



دستک، دستک دستک

شاہین رشید

ثانیہ سعید



ثانیہ سعید کی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان سے کافی ملاقاتیں رہی ہیں۔ پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پھر بھی کبھی کبھار کسی نہ کسی حوالے سے بات ہو ہی جاتی ہے۔

”کیسے مزاج ہیں؟“
”الحمد للہ۔“

”آپ کا نام ثانیہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اداکاری میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کی تعلیم اور گھروالوں کا بھرپور تعاون ہے؟“
”بہت شکریہ۔ تعریف کا، واقعی گھروالوں کی بھرپور سپورٹ شامل ہے۔ اور تعلیم کی جہاں تک بات ہے تو آپ کو بتاؤں کہ میں تعلیم یافتہ ضرور ہوں مگر اتنی نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں اور یہ لوگوں کی مجھ سے محبت ہے۔ اور اب بھی اگر مجھے موقع ملا تو میں مزید تعلیم ضرور حاصل کروں گی۔“

”تو زیادہ تعلیم کیوں نہیں حاصل کر سکیں؟“
”بس پتا نہیں کیوں نہیں کی۔ حالانکہ مواقع تو بہت ملے۔ مگر..... اب اگر موقع ملا اور موڈ ہوا تو ضرور مزید تعلیم حاصل کروں گی۔“

”فنکاروں کو شکوہ ہے کہ انہیں وقت پر معاوضے نہیں دیئے جاتے۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”جی بالکل سچ ہے۔ اور میں کہتی ہوں کہ جس طرح مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ان کو کام کا معاوضہ دینے کا حکم ہے تو اس پر عمل کرتے ہوئے ہمیں بھی ہمارے معاوضے فوراً ملنے چاہیں، مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ کئی کئی ماہ ہمیں معاوضے نہیں

دیئے جاتے۔“

”کوئی تحریری معاہدہ نہیں ہوتا کیا؟“
”میں آپ کو بتاؤں کہ اداکاروں اور پروڈکشن ہاؤسز کے درمیان ہونے والے تحریری معاہدے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے تو اسی لیے وقت پر معاوضے نہیں ملتے۔“

”پھر آپ لوگوں کا کام کس وجہ سے کرتی ہیں

جب اتنی نا انصافی ہو؟“

”کیا کریں ہر کوئی مجبوری کے تحت کام کرتا ہے۔ دیر سے سہی مگر مل تو جاتا ہے۔ اس لیے برداشت کرنا پڑتا ہے اور ایک بات اور کہ فنکاروں کو یوٹیوب سے ہونے والی کمائی سمیت دیگر ذرائع سے ہونے والی کمائی سے پیسوں کا حصہ نہیں دیا جاتا۔ یہ

بھی ایک افسوس کی بات ہے۔“

☆☆

صنم سعید

”کیا حال ہیں؟“

”جی ٹھیک۔“

”آج کل تو آپ اسکرین پہ بہت ”انٹا“ ہو رہی ہیں۔ ابھی ”میں منٹو نہیں“ ختم ہوا تو دوسرا ”لفیل“ شروع ہوا اور زندگی گزار رہے تو چل ہی رہا ہے۔ سب کچھ کیسا لگ رہا ہے آپ کو؟“

”ظاہر ہے اس میں کوئی دورائے نہیں ہے۔ یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”لفیل اور ”میں منٹو نہیں“ کی ریکارڈنگ کے وقت کوئی خاص بات جو یادگار ہوئی ہو؟“

”لفیل کے دوران تو نہیں۔ البتہ ”میں منٹو نہیں“ کی ریکارڈنگ کے وقت میں امید تھی۔ مگر کیرہ ورک ایسا کروایا کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔ اور بعد میں ڈرامہ دیکھنے والوں کو جب پتا چلا تو وہ بہت حیران ہوئے۔“

”آپ کافی گیپ کے بعد اسکرین پہ آئیں کیوں؟“

”جی میں تقریباً سیات سال کے بعد واپس آئی اور وجہ کچھ ذاتی وجوہات تھیں۔ لیکن اب میں دوبارہ آگئی ہوں اور اب گیپ دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ان شاء اللہ اب باقاعدگی سے کام کروں گی۔“

”میں منٹو نہیں میں ایک پروفیسر کا رول تھا آپ کا..... کہنے میں دشواری تو نہیں ہوئی تھی؟“

”نہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی اور پروفیسر کا رول نہیں تھا بلکہ ایک لیکچرار کا رول تھا اور مجھے بہت اچھا لگا یہ رول کر کے۔ اور ہاں ہمایوں سعید اور جبل علی کے ساتھ کام کرنے کے بھی بہت اچھا لگا۔“

”اس ڈرامے کے وقت آپ امید سے تھیں۔ ہمارے قارئین کو بتائیے کہ اللہ نے رحمت دی یا نعمت؟“



”الحمد للہ..... اللہ نے نعمت سے نوازا اور بیٹے کا نام ولی حسن مرزا رکھا۔ ولی حسن اٹھارہ مئی 2025ء کو اس دنیا میں آیا۔“

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

سرگسٹ

آمنہ ریاض



منگوانیہ قادیان

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر

32735021

37، اردو بازار، کراچی

بہارِ عید کی

(ادارہ)

اجتماعی تہواروں میں خوشی کا ایک علیحدہ ہی رنگ ہوتا ہے چہار جانب رنگ اور خوشبو میں بھری ہوئی ہیں۔ تہوار اگر مذہبی ہوں تو خوشیوں کے ساتھ ساتھ فضاؤں میں ایک تقدس و عبودیت کا رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ عید کے دن کی تو رونق ہی الگ ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو، عید کا خوشیوں بھرا تہوار روزے داروں کے لیے اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام ہے۔

قارئین کو ہماری طرف سے دلی عید مبارک اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی تمام نعمتوں سے نوازے۔ عید کے موقع پر ہم نے حسب روایت قارئین کی شرکت کے لیے سروے کا اہتمام کیا ہے۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ ہمارے ہاں عموماً چاند کے اعلان میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ اچانک چاند ہونے کا اعلان سن کر آپ عید کی تیاری اور مہمان کیسے سنبھالتی ہیں۔

2۔ عید کے دن مہمانوں کی آمد۔ ان کی خاطر مدارات، گھر والوں کے لیے عمدہ اور لذیذ کھانوں کی تیاری ان مصروفیات میں عید کا دن کیسے گزرتا ہے۔

3۔ عید کے دن آپ کے گھر میں کون سی ڈش لازمی بنتی ہے۔

آپ دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں۔

رضوانہ وقاص..... کرلاں ہری پور

سروے کے جواب لیے حاضر ہیں ہم۔
1۔ چاند کے اعلان میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ لیکن اب پاکستان والے زیادہ تر اسی روزے ہی کرتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں روزے رکھتے رکھتے (ہا ہا ہا) بہت بابرکت اور رحمتوں والا مہینہ ہے۔

تیاری تقریباً آخری روزوں میں مکمل کر لی جاتی ہے۔ مہمان سنبھالتی ہیں امی۔ امی زندہ باد۔ مجھے پینشن لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ (ہا ہا ہا)

2۔ مہمانوں کی آمد بہت اچھی لگتی ہے۔ اور کوشش یہ ہی کرتے ہیں کہ مہمان خوش واپس جائے۔

ہمارے گھر میں زیادہ تر کیموں والا شربت پیش کرتے ہیں کیونکہ کیموں ہمارے گھر کے۔ چنا چاٹ تو لازمی مہمانوں کے لیے اور سب آتے ہیں رشتہ دار، پڑوسی مجھ سے عید ملنے کے لیے۔ سب کا شکریہ۔ سب کے لیے دعا، اللہ پاک ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین) پورا دن مہمان آتے رہتے ہیں ملنے ملانے میں دن گزر جاتا ہے۔
3۔ عید کے دن ہمارے گھر میں گھر کی بنی سویاں اور چنا چاٹ لازمی ہے۔ بریانی دوسرے دن بنتی ہے۔

میشے علی خان..... خان پور

1۔ عید کی تیاری تو کوئی خاص مسئلہ نہیں کرتی کہ بچوں کی، اپنی اور شوہر نامہ دار کی تیاری تو قریباً مکمل ہی

ہوتی ہے تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ ہاں میرب کو شوق ہے کہ مہندی بھی چاند رات کو لگوائی جائے اور چوڑیاں (بھلے خانوال سے لا کر رکھی ہوں) بھی چاند رات کو ہی پہننی ہیں تو اس کے لیے لکھنا پڑتا ہے جب عید کا اعلان ہو۔

چھلی دفعہ تو میں، بھابھی نازیہ اور ہم دونوں کی چار بیٹیاں جب مہندی لگوانے لگیں تو جس کے پاس جائیں وہیں رش۔ کتنی ہی دیر اسی خواری میں گزری۔ خیر لگ ہی گئی بچپوں کو مہندی۔ اور کھانے کی تیاری بھی مسئلہ نہیں کیونکہ تیاری تو ساری پہلے ہی ہوتی ہے (ویسے آپس کی بات ہے، ہم عید پر میزبان کم ہی ہوتے ہیں۔ اکثر مہمان نوازی کا لطف ہی لیا جاتا ہے تاہم پھر بھی مہمان آجائیں جو کہ میرے بہن بھائیوں اور ان کی فیملیز پر مشتمل ہے تو سو بسم اللہ۔ جو گھر میں ہے وہ حاضر جو مزید چاہیے تو ہر چیز قریب ہی دستیاب ہے۔ کہ سسرالی تو دور ہیں مطلب نندیں۔ دیور جیٹھ ہیں نہیں تو بس راوی چین ہی چین لکھتا ہے)

2۔ چلیں جی میں نے دوسرے سوال کا جواب بھی پہلے میں ہی دے دیا۔ یہ سچ ہے کہ عید پر ہمارے گھر مہمان کھم آتے ہیں، وجہ یہ کہ مجھ سمیت ہم تین بہنیں گاؤں میں عیابی ہیں اور میرا گھر میکے کے بالکل ساتھ ہے تو جو بہنیں آئیں، وہ پہلے میکے ہی آتی ہیں لیکن بہر حال پھر بھی کھانا پلانا تو چلتا ہی ہے اب یہ بھی اتفاق کہ ہم تینوں بہنیں باجی عشرت + نبیلہ اور میں چائے کی شوقین، تو مسئلہ نہیں ہوتا اور نندیں دور ہیں تو وہ اگر آئیں بھی تو عید کے کچھ دن بعد ہی آنا ہوتا ہے۔ تو بس سب کچھ اچھے سے ہی منج ہوتا ہے ہاں میرب مسئلہ کرتی ہے یہ پکالو، وہ پکالو۔

اجھا مزے کی بات۔ چند ماہ پہلے میرب نے ضد کر کے مجھ سے خط لکھوایا اور کہا کہ میں آپ لوگوں سے ریکویسٹ کروں کہ میکے کے کرنے کی ترکیب دے دیں ہمارے میں۔ میں نے کہا کہ خود خط لکھ دو تو کہتی۔ ابھی آپ لکھ دیں پھر میں بعد میں لکھا کروں گی۔ میں نے خاص طور پر میرب کا نام لکھ کر آپ سے ریکویسٹ کی لیکن ہوا کیا وہ خط ہی چھپا نہ ترکیب اب میں میرب کو چھیڑتی ہوں کہ آپ کی وجہ سے میرا خط بھی نہیں لگا اب

آئندہ کوئی فرمائش نہ کرنا اور وہ..... (ہی ہی ہی) 3۔ انف نہ پوچھیں سوپاں جتنی بھی جان چھڑالوں جو مرضی پکا دوں، پتا نہیں سوپاں کسی بھی فارم میں، کسی بھی طریقے سے کیوں بن جاتی ہیں لاکھ جتن کروں پر.....

اعتیاز شاہد بھکر

میں شعاع ڈائجسٹ کی باقاعدہ قاری ہوں چھٹی جماعت سے جو چکا لگا تو آج تک پڑھتی آرہی ہوں حالانکہ میری بیٹیاں ایف ایس سی میں ہیں۔ چند سال پہلے کئی خطوط اور افسانے لکھے تھے، مگر شائع نہ ہو سکے۔ دل بہت دکھا، پھر قلم اٹھانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ آج پورے پانچ سال بعد اپنی پوری ہمت جمع کر کے لکھ پکپاتے ہاتھوں سے یہ سطور لکھ (ٹائپ) کر رہی ہوں۔ اللہ بہتر کرے گا، ان شاء اللہ۔

اب سوالات کی طرف آتی ہوں۔

1۔ چاند نظر آنے کا مسئلہ تو مت پوچھیے۔ چاند رات کو نیوڑھٹلو باقاعدہ میدان جنگ بن جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے چاند نظر آ گیا ہے اور کوئی کہتا ہے، ابھی نہیں آیا۔ سچ پوچھیں تو چاند رات کا اصل مزہ ہی اسی تذبذب میں ہوتا ہے۔

ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ ہم روزہ رکھ کر سو گئے اور صبح پتا چلا کہ عید ہے۔ لو جی! (ہاہاہا)

عید کا راشن میں عموماً اٹھائیسویں روزے کو ہی منگوا لیتی ہوں۔ عید کی صبح جب جنید اور ان کے ابو عید کی نماز کے لیے جاتے ہیں تو میں شیر خورما اور دہی بھلے بنا لیتی ہوں۔

2۔ عید کی چھٹیوں میں میری اکلوتی نند بمعہ فیملی میکے یعنی ہمارے ہی گھر آ جاتی ہیں۔ دونوں دیور، ان کی بیویاں اور بچے بھی شہر کی تیز رفتار زندگی سے فرار پا کر اٹھائیسویں روزے کو ہمارے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔

3۔ میری نند کی بریالی پورے خاندان میں مشہور ہے۔ سب کی فرمائش پر وہ عید کے پہلے دن بریالی بناتی ہیں۔ سچ کہوں تو اس بریالی کے بغیر ہماری

عید اور عید کی گنتی ہے۔

عائشہ عامر..... کراچی

1۔ سب سے پہلے میری جانب سے تمام پڑھنے والوں کو عید مبارک۔

چاند کے اعلان میں تاخیر کے بارے میں پوچھ کر آپ نے کیا یاد دلایا، ہمارے ملک میں تو رات کے ساڑھے گیارہ بجے بھی اعلان ہو سکتا ہے کہ چاند نظر آ گیا ہے تو اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے جیسے ہی رویت ہلال کیٹی کا اجلاس دس یا ساڑھے دس بجے تک ہو رہا ہو تو سمجھ جائیں کہ کل عید ہوگی (ہی ہی)

خیر سوال کی جانب بڑھتے ہیں یہ سوال خالصتاً گھریلو عورتوں والا ہے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ چاند نظر آتے ہی میں ہندی لگانے بھاگتی ہوں اس کے علاوہ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب موجود نہیں ہے۔

2۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہم لوگ اپنے چاچا، تایا کی فیملی کے ساتھ مناتے ہیں۔ یعنی پہلی عید کی صبح ہم سب تیار ہو کر ہمارے گھر یا کسی بھی چاچا تایا کے گھر جمع ہوتے ہیں اور وہاں سے دیر رات کو واپس ہوتی ہے تو وہاں پر مہمان بھی ہم ہی ہوتے ہیں اور میزبان بھی ہم ہی ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں نا۔

”ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود وایاز“
عہدہ اور لہذا کھانوں کی بات کی جائے تو پہلے ماما، چاچا اور تائی مل کر کھانا بنایا کریں میں پر اب کافی سالوں سے کیشنگ والے کو ہی آرڈر دیا جاتا ہے ہمارے عید کے تینوں دن اسی طرح گزرتے ہیں اب بھی ہم عید اسی طرح مناتے ہیں جیسے ہمیشہ سے مناتے آ رہے ہیں، اس کے باوجود اب بچپن والی خوشی مفقود ہے، شاید اب ہم بڑے ہو گئے ہیں۔

3۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ہمارے عید کے تینوں دن کس طرح گزرتے ہیں تو گھر پہ تو ہمارے شیر خور مایا بنتا ہے۔

پہلے سے عید کی تیاریاں شروع کر دیتی ہوں، دو دن پہلے سب کے عید کے دنوں کے سب کپڑے استری کر دیا کر لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ اس لیے عید کے دیر سے اعلان ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہاں بچن کے کاموں میں صرف اتنا فرق پڑتا ہے کہ پھر چاند رات کو بنتی ہے تو جب کھیر چڑھاتی ہوں تو ساتھ ہی چکن کو مسالہ بھی لگا دیتی ہوں کہ صبح روٹ کیا جاسکے اور گوشت کو ابال لیتی ہوں۔ اس سب میں دو گھنٹے لگتے ہیں، سو دو گھنٹے عید کی خوشیوں کے لئے تو پتا بھی نہیں چلتے۔

2۔ عید کے دن دوپہر کا کھانا میرے ماموں کے گھر ہوتا ہے تو صبح تو ہم بہت خوب صورتی سے تیار ہو کر دعوت پر چلے جاتے ہیں۔ ہاں صبح شیر خور مایا ہوں اور بچے کیک یا براؤنیز کھاتے ہیں تو وہ بھی رات کو بنا دیتی ہوں۔ بارہ بجے تک دعوت میں چلے جاتے ہیں۔

چار بجے کے بعد واپس آتے ہیں تو اوون میں مسالہ لگی چکن رکھ دیتے ہیں۔ ساتھ بخنی پلاؤ بنا دیتی ہوں۔

بچے ماشاء اللہ بڑے ہیں تو وہ اگر اپنے دوستوں میں چلے جائیں تو خیر ہے اگر میری بیٹی نے آنا ہو تو اس کی پسند کے پسندے ضرور بناتی ہوں۔

اگلے دن میرے بھائی، امی اور ان کی فیملیاں کھانے پر آتی ہیں۔ اسی دن بیٹی کی پر اپر دعوت رکھ لیتی ہوں تو بریانی، نہاری اور چکن کڑا ہی بناتی ہوں۔ ساتھ کباب رکھ لیتے ہیں۔

بیٹھا ایک تو کھیر ہوتی ہے۔ دوسرا بیٹھا میری چھوٹی بیٹی یونیوب سے دیکھ کر بتا لیتی ہے کچھ۔ انا لکین یا فریج ناموں والی چیزیں ہوتی ہیں۔

3۔ روٹ چکن اور پسندے عموماً ضرور بنتے ہیں۔ شیر خور پہلے ضرور بناتی تھی، اب بچے کھاتے ہی نہیں ہیں تو بھی بناتی ہوں بھی نہیں۔
بیٹھے میں عموماً کھیر اور براؤنیز بنتی ہیں۔

مسرت حسن..... ڈلاس امریکہ

1۔ شادی سے پہلے کی عیدوں کا تو کیا لکھوں

صائمہ علی..... اسلام آباد

1۔ میں اپنے گھر میں عموماً عید سے دو تین دن

میں جیسے کبھی اسٹو تو کبھی نر کسی کو فٹے یا قورمہ بس جو گھروالے بولیں وہی بنا لیتی ہوں۔

تسفیہ کوثر..... کراچی

سروے میں دیے سوالات کے جوابات لکھ رہی ہوں لیکن معذرت کے ساتھ سوالات بار بار ایسے ہی ملتے جلتے ہوتے ہیں۔

1۔ یہ بات تو سو فیصد درست ہے کہ چاند کا تو دھڑکا لگا رہتا ہے۔ ہمارے چاند صاحب 29 کے ہیں یا 30 کو روتی افروز ہوں گے۔ ہائے وہ زمانہ کہاں جب ہم خود اپنی آنکھوں سے چاند کا دیدار کرتے تھے وہ وقت تو بس خواب و خیال بن کر رہ گیا ہے۔ اب تو بس لی وی پر ہی چاند صاحب کی اطلاع کے منتظر رہتے ہیں۔

تو جناب ہم سب گھروالے بالکل الٹ رہتے ہیں۔ کوئی بد مزگی یا افرا تفری نہیں ہوتی ہے ہر کام ہر چیز پہلے ہی سے تیار رہتی ہے۔ اس لیے شکر اللہ تعالیٰ کا چن سمیت ہم سب گھروالے خوشی خوشی عید کی خوشیاں انجوائے کرتے ہیں۔

2۔ عید کے دن مہمانوں کی آمد و رفت تو لازمی جز ہے۔ اس لیے ان کی خاطر خواہ مدارت تو کی جانی ہے جس کے لیے ہمارے ہاں یہ طریقہ ہے کہ کباب، سوچی بیسن کا کلڑی حلوہ وغیرہ بنا کر پہلے ہی تیار کر کے رکھ دیتے ہیں تو بس جھٹ پٹ شرخما کے ساتھ یہ لوازمات وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ عید کے دن بریانی اور گڑا ہی تیار کی جاتی ہے، اس سے زیادہ نہیں تاکہ سب لوگ اچھی طرح سے تیار شیار رہیں۔ کام کا زیادہ بوجھ بھی عید کے دن اچھا نہیں لگتا ہے، اس لیے سب خوش و خرم رہتے ہیں۔

3۔ عید کے دن بیٹھے میں تو شیر خور مالازی بنتا ہے اس کا خاص طور پر عید کے دن کوئی مقابلہ نہیں، اس کے علاوہ بریانی۔ گڑا ہی۔ کباب وغیرہ ہوتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے گھر میں بس تقریباً سب کچھ ہوتا ہے بہت زیادہ پکانے کے چکر میں ہم نہیں رہتے بھی خود بھی تو اچھے سے کپڑے پہن کر تیار ہوتا

شادی کے بعد سعودی عرب چلے گئے تو وہاں چاند کا مسئلہ نہیں ہوتا تھا بس گورنمنٹ نے اعلان کر دیا تو چاند ہو گیا، اندازہ ہوتا تھا تو عید سے ایک دن پہلے عید کی تیاری کر لیا کرتے تھے اور جب امریکہ آئے تو یہاں بھی ٹائم پر ہی اعلان ہو جاتا ہے، ہاں جب 29 کو اعلان ہو تو ذرا افرا تفری ہو جاتی ہے مگر سب کام ٹائم پر ہی ہو جاتا ہے اور عید کی تیاری اور مہن کا کام اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ دونوں ممالک میں چاند کا اعلان تاخیر سے نہیں ہوتا۔

2۔ یہ سوال ایسا ہے کہ جس کا جواب بہت زیادہ ہو جاتا ہے مگر کم کر کے بتانی ہوں۔ یہاں پر عید ذرا ڈفرنٹ ہوتی ہے، صبح سات بجے سب لیڈیز بھی نماز پڑھنے مسجد میں جاتی ہیں، نماز پڑھنے کے بعد وہاں پر کیوٹی کی طرف سے بھرپور ناشتہ کروایا جاتا ہے۔ اور گراؤنڈ میں بچوں کے لیے جھولے، ٹرین اور گیمز ہوتے ہیں اشال لگے ہوتے ہیں۔ ایک زبردست میلہ لگا ہوتا ہے۔

ہم سب فرینڈز خوب گپ شپ کرتے ہیں بچے الگ انجوائے کر رہے ہوتے ہیں۔ سب لیڈیز کی تیاری دیکھنے والی ہوتی ہے۔ سب فل تیار ہو کر آتے ہیں۔

پھر دس بجے تک گھر آتے ہیں، دو گھنٹے سوتے ہیں بارہ بجے اٹھ کر لچ بناتا ہے۔ بریانی اور شیر خورمہ بناتی ہوں۔ سب مل کر لچ کرتے ہیں رات کو ڈنر کا اہتمام کرنا ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی مہمان آتا ہے۔

ڈنر کا آدھا کام تورات کو کر لیا ہوتا ہے جیسے کباب بنا کر فریز کر دیتی ہوں قورمہ، کا مسالہ بھون کر رکھ لیتی ہوں چکن 65 کو میرینٹ کر کے رکھ دیتی ہوں۔ ڈنر میں کباب قورمہ بریانی چکن 65 اور اسٹو بنا لیتی ہوں۔ اسٹو بھی پریشر کوکر میں جلدی بن جاتا ہے۔

رات میں مہمان آئے ڈنر کیا۔ ڈنر کے بعد آکس کریم یا قہوہ کا دور چلتا ہے اور بس عید ختم۔ دن ختم عید کا چٹائی نہیں چلتا کہ کیسے دن گزرا۔

3۔ عید کے دن کچھ ڈشز ایسی ہیں جو ہمیشہ بنتی ہیں جیسے بریانی۔ شیر خورما۔ چکن 65 کباب یہ ضرور بنتے ہیں اس کے علاوہ تہدیل ہوتی رہتی ہیں سالن

بھیدیاں کھانا معمول ہے اور ہر عید میں مختلف درائی بھی ہوتی ہے جیسے بھی شیر خور ما، ٹراٹفل وغیرہ۔

فرخندہ سلیم..... ملتان

ج: ”ہماری طرف سے ساری شعاع کی پڑھنے والی قارئین کو یہ ذرا سی نمکین اور ذرا سی میٹھی عید بہت مبارک ہو، جیسے پلیٹ میں نمکین چاول اور زردہ نمکس کر کے کھانا کتنا لذیذ لگتا ہے۔

ہمارے ہاں چاند کا اعلان ہمیشہ ایسے ہوتا ہے جیسے کوئی رشتہ دیکھنے آجائے اچانک سے جب ساس کہے، سارا کام نند نے کیا ہے اور نند کی ہونے والی ساس بچن میں اپنی ہونے والی بہو کی جگہ اپنی ہونے والی بہو کی بھالی کو کھانے بناتے ہوئے دیکھے اور بھانڈا پھوٹ جائے۔

ہاں یہ سین فروری کے شعاع میں افسانہ بہترین فیصلہ سے لیا ہے۔ پہلے زمانے میں جب نہ اتنے چینل تھے نہ موبائل، ہم چھت پر جا کر واقعی چاند ڈھونڈتے تھے اور کتنا حسین دور تھا جب ہم سنتے تھے کہ چاند پر بیٹھی بوڑھی اماں چرخہ کاٹی ہیں۔

بچے شور مچا دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے چندا ماما ادھر ہے، کوئی کہتا ادھر ہے، اور میں نیچے بچن میں بھاگتی کہ ہمیں دودھ ابل کر بہہ نہ جائے۔

ایک بار تو ایسا ہوا کہ چاند کی خبر آتے ہی پورے محلے میں نعرے لگے اور میں نے خوشی میں سویاں بھونتے بھونتے نمک ڈال دیا۔ پھر وہی سویاں میں ہم نے ”نئی ایجاد“ کہہ کر مہمانوں کو کھلا دیں اور سب نے تعریف بھی کی، کیونکہ عید کے دن لوگ ڈانٹنے سے زیادہ نیت دیکھتے ہیں۔

چاند اچانک ہو جائے تو بھی میں پہلے سے ہی آدمی تیاری مکمل رکھتی ہوں۔ خشک میوہ الگ، دودھ الگ، مسالے ترتیب سے، اور ذہن میں مکمل نقشہ۔ بچن میرے لیے میدان جنگ نہیں بلکہ پرانا دوست ہے۔ میں جانتی ہوں کون سا برتن کس وقت ناراض ہوتا ہے اور کون سا چولہا کب ساتھ چھوڑتا ہے۔ بچے

ہوتا ہے۔ ہم تو اس بات کے قائل ہیں کہ گھر بھی صاف ستھرا ہو کھانا وغیرہ یا مہمانوں کی خاطر مدارت کا بھی مناسب انتظام ہو اور خود بھی طریقے سلیقے سے تیار ہوں تو اس طرح سے ہوتا ہے ہمارا عید کا دن۔ بتائیے ٹھیک ہے نا ہمارا طریقہ۔

ایمن خالد باجوہ..... گوجرانوالہ

1- میری ماما پہلے سے ہی سب تیاری کر لیتی ہیں۔ صرف دودھ کا دہی جما یا جائے یا نہیں کا فیصلہ اعلان کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر چاند نظر آجائے تو اس دودھ کا میٹھا بنا لیا جاتا ہے۔ بڑے تو سو جاتے ہیں اور ہم بہنوں کو تیاری کی فکر پڑ جاتی ہے۔ کوئی فیس ماسک لگا رہا ہے تو کوئی epilator یا مہندی پکڑ کر بیٹھا ہے۔ انٹرنیٹ پر مہندی کے ڈیزائن سلیکٹ ہو رہے ہیں اور کپڑے استری کیے جا رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ عید لک کے لیے میچنگ جھمکے، چوڑیاں اور انگوٹھیاں سلیکٹ کی جا رہی ہیں۔ چاند رات کی اسٹپس بھی جا رہی ہیں۔

2- ہمارا گھر خاندان کا ہیڈ کوارٹر سمجھا جاتا ہے کیونکہ دادو ہمارے ساتھ ہوتی تھیں تو سب یہیں جمع ہوتے ہیں۔ پورا دن مہمانوں کی آمد اور خاطر مدارت چلتی رہتی ہے جو ہم خوش دلی سے کرتے ہیں۔ صبح ہی ماما، میں اور میری بڑی بہن گھر کی صفائی اور ڈشز بنا لیتی ہیں۔

دوپہر میں اپنے ننھیال جانا ہم بھائی، بہنوں کی بچپن کی عادت ہے۔ واپسی اگلے دن ہوتی ہے جب ہماری پیمپو اپنی پیمپو کے ساتھ آتی ہیں۔ پھر دھیالی کزنز کے ساتھ انجوائے کرتے ہیں۔

اس دفعہ عید بالکل بھی پہلی عیدوں جیسی نہیں ہوگی کیونکہ جن کی وجہ سے ہمارے گھر میں رونق اور برکت تھی (ہماری دادو) وہ ہمارے ساتھ نہیں رہیں (آپ سب سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے)

3- ہمارے کزنز مذاق میں کہتے ہیں کہ فروٹ چاٹ اور دہی بھلے آنٹی طیبہ کی سلنگ چڑھیں (ہر عید پر بنتی ہیں چاہے عید چھوٹی ہو یا بڑی) ناشتے میں

اب بڑے ہو گئے ہیں مگر ان کی بچپن کی عیدیں یاد آتی ہیں جب وہ ہر دس منٹ بعد پوچھتے تھے۔
 ”امی! چاند ہو گیا؟“

اور میں کہتی تھی ”بیٹا چاند نہیں ہوا ابھی۔“ سچ یہ ہے کہ چاند کی تاخیر نے مجھے صبر، ترتیب اور مزاح تینوں سکھا دیے۔ میں نے سیکھ لیا ہے کہ عید کی اصل تیاری برتنوں میں نہیں، دل میں ہوتی ہے۔ باقی کام تو ہاتھ خود سیکھ جاوے ہیں۔

عید کا دن ہمارے گھر میں ایسے گزرے ہے جیسے کوئی برات آگئی ہو۔ میں ایک ہاتھ سے قورمہ میں پیچ چلا رہی ہوں، دوسرے ہاتھ سے سلاڈ کی سبزیاں تراش رہی ہوں اور دماغ میں مہمانوں کی آمد کا انتظار بھی ساتھ چل رہا ہوتا ہے۔ بچے شور مچاتے ہیں۔ کسی کی شلوار ادھر ہے، کسی کی میٹھی ادھر، اور میاں کہیں ازار بند دانی کم ہو گئی تو دانت والا برش ایسے میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ مہمانوں کی آمد پر پورا گھر ایک چھوٹی سی ”خوش آمدید کی محفل“ میں بدل جاتا ہے۔

مہمان جب آ جاتے ہیں تو پورا منظر ہی بدل جاتا ہے۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوتی ہوں کہ میرے اہتمام، سلیقے اور تھوڑی سی محنت نے نا صرف کھانے کو بہترین بنایا بلکہ ماحول میں بھی محبت اور خوشی چھا گئی۔

بچوں کی مسکراہٹ، شوہر کا منہ بنا ہوا دیکھنا کہ کھانا اچھا بھی ہو تب بھی تعریف نہیں کرنا ان کی خاندانی عادت ہے۔ سمجھتے ہیں بیویوں کی تعریف کر دی تو سر پر چڑھ جائیں گی۔

یہ ان کی عظیم الشان فلاسفی ہے اور میاں جی کے چھوٹے چھوٹے طنز یہ تبصرے یہ سب مل کر پورے دن کو یادگار اور کچھ حد تک سڑیل بنا دیتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ کچھ شوہر ایسے ہوتے ہیں جو ظالم ساس، چلتی نند، منہ پھٹ مسر، آوارہ سے ذہور، میسنی سی جیٹھالی اور موٹے سے چالاک جیٹھ کی کمی پوری کر دیتے ہیں۔

کبھی کبھی دل میں یہ خیال آئے ہے کہ عید صرف کھانے اور کپڑوں کا نام نہیں، بلکہ محبت، انتظام، اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور ایک چپ سو سکھ کا نام ہے مگر سکھ کا وقت آتے آتے انسان ہی سوکھ کر کاٹا ہو جاتا ہے۔

یوں پورا دن گزرتا ہے، صبح کی جلدی سے لے کر شام کی سکونت تک اور آخر میں جب سب مہمان رخصت ہو جاتے ہیں، دل کہتا ہے۔ آج بھی میری محنت کا میاں رہی نہ کسی نے کچھ کھانہ کسی کو کی کا احساس ہوا۔ یہی گھر یلو عورت کی عید کے دن کی خوشی ہے جس میں لذت، ٹھکن طنر اور محبت سب ہی کچھ ہوتا ہے۔

ج: ”یہی عید کے دن اگر کوئی ڈش ہمارے گھر میں سب سے زیادہ اہم اور لازمی ہوتی ہے تو وہ ہے شیر خورما اور یہ صرف بیٹھا نہیں بلکہ پورے دن کا ذائقہ، خوشبو اور تھوڑی سی مٹھاس ایک ساتھ لے کر آتا ہے اور زندگی میں جب بہت زیادہ کڑوا پن ہو تو مٹھاس پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ شیر خورما بس دودھ اور کھوئے کا کھیل نہیں، بلکہ ایک شادی شدہ عورت کے ہاتھوں کی جادوگری ہے جو کھاتے ہی پورے خاندان کے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔

شیر خورما کی خوشبو ہی کافی ہے کہ پورا گھر اور آدھا محلہ فوراً جان جائے کہ عید کا سماں ہے۔ دودھ ابا لیتے ہوئے، کھوئے کے نرم ذرات میں خشک میوہ ڈالتے ہوئے، اور تھوڑی سی الائچی منگنے والے میتی پر فیوم کی طرح چھڑکتے ہوئے میں دل ہی دل میں سوچتی ہوں کہ واقعی خوشبو سے دل جیتنا بھی ایک فن ہے۔

کبھی کبھی یہ بھی سوچتی ہوں کہ اتنا بیٹھا کھا کر بھی کچھ لوگوں کے اندر کی کڑواہٹ ختم نہیں ہوتی، وجہ وہ ایک نمبر کے ڈھیٹ ہوتے ہوں گے۔

اب اجازت دیں کہ افطار کا وقت آنے والا ہے اور شوہر کی ساس نند نما باتیں سننے سے پہلے میں باورچی خانے میں جانے کی نیت کرتی ہوں۔

☆☆

یمٹی احمد سے ملاقات

شاہین رشید



آج کل ڈرامہ سیریل ”ماں“ ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا ہے جو ناظرین کو پسند بھی آ رہا ہے تو سوچا کہ کیوں نہ اس کی رائیٹر سے بات کریں۔ یمنی احمد نہ صرف ڈرامہ نگار ہیں بلکہ یہ ڈائجسٹ کی دنیا سے بھی منسلک رہی ہیں۔

”کیسے مزاج ہیں؟“
”الحمد للہ۔“

”آپ کا ڈرامہ سیریل ”ماں“ دیکھ رہے ہیں۔ گرین ٹی وی سے آن ایر ہے معروف فنکار کام کر رہے ہیں اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا بھی جا رہا ہے۔ اس کے بارے میں سوالات کرنے سے پہلے کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہو جائے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

”بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔“
”تو پھر پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ یمنی ایک معروف فنکارہ ہیں یمنی زیدی۔ آپ یمنی احمد لوگوں کو کچھ کنفیوژن ہوتا ہے؟“

”دنیا میں ایک نام کے بے شمار لوگ ہوتے ہیں۔ اور ویسے بھی وہ یمنی زیدی اور یمنی احمد اپنے پلیٹ فارم سے اپنے حصے کا کام کر رہی ہوں۔ ہاں کئی بار ایسا ضرور ہوا کہ مجھے بے خیالی میں یمنی زیدی کے نام سے پکارا گیا اور پھر سب نے مل کر زبردست تہقق لگایا کہ غلطی سے کہہ دیا۔“

”ہوں..... اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے؟“
”فیملی بہت سادہ، بہت معصوم اور بہت مختصر ہے۔ دہلی سے تعلق ہے اور دلچسپ بات یہ کہ فیملی میں کسی کو بھی میرے والے کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ امی لیے گھر کی مرغی والی برآمدہ ہے۔ البتہ ایک بات پر میرا یقین ہے کہ آپ کی فیملی

میں یا آپ کے آس پاس کوئی ایک ایسی شخصیت ضرور ہوتی ہے جو جانے انجانے میں آپ کو آگے بڑھنے پر پش کرتی ہے اور مجھے پش کرنے والے میرے۔۔۔۔۔ ”نانا جان“ تھے۔ میں انٹر میں تھی تو ان کا انتقال ہو گیا لیکن ان کا ایک جملہ مجھے ہمیشہ یاد

رہا کہ ”کبھی ہمت نہ ہارنا“ جو بھی پڑھنا چاہتی ہو پڑھو۔ جو بھی لکھنا چاہتی ہو لکھو۔ پھر میری والدہ اور میرے ماموں لاہوری سے ڈائجسٹ لاتے تھے جنہیں میں چھپ چھپ کر ایک ہی رات میں پڑھ کر ختم کر دیا کرتی تھی۔

”ہم ماشاء اللہ چھ بہن بھائی تھے۔ چار بہنیں اور دو بھائی۔ دو بہنیں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اب ہم دو بہنیں اور دو بھائی ہیں اور میرا نمبر پہلا ہے۔ اور مجھے اپنے دو بھائیوں میں رضوان بھائی نے بہت زیادہ

ایک بچی ”آپ بیتی“ تھی۔ ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ جب میں چھوٹی تھی تو گھر میں جو بھی باتیں ہوتی تھیں چاہے وہ سچ ہوں یا شیریں۔ انہیں بے خیالی میں اپنی ٹوٹ بک میں اپنے انداز میں لکھ لیا کرتی تھی جو بعد میں مجھے کہانی لگتی تھی اور یہ بات گھر میں کسی کو نہیں معلوم تھی۔

ڈائجسٹ پڑھنا اچھا لگتا تھا اور اس میں لکھنا ایک خواب..... پھر ہوا یوں کہ ایک دوست کے شوہر ایک بڑے ڈائجسٹ میں سب ایڈیٹر اور رائیٹر تھے۔ ان کا نام حسام بٹ تھا انہیں اپنی تحریر دکھائی جسے آگے پذیرائی ملی اور یوں آگے جگہ ملتی گئی۔ اگلے اسٹیپ نے مجھے خود حیران کر دیا، وہیں سے جاب آفر ہوئی پھر یہ اعزاز بھی ملا کہ ایک بڑے ڈائجسٹ میں ایڈیٹر کی جاب مل گئی یہاں مجھے مدیر اعلیٰ نے مجھے بہت پیار دیا۔ ان کی حوصلہ افزائی کے بعد میں نے بے شمار رائیٹرز کو متعارف کرایا، بڑے بڑے سلیم یٹز کے انٹرویوز کیے جنہیں پسندیدگی کی سند ملی اور یوں میں اس ماہنامہ کی بیس سال ایڈیٹر رہی۔ اس کے علاوہ مختلف ڈائجسٹ میں کہانیاں بھی لکھیں سب ایڈیٹر بھی رہی۔“

”ٹی وی یہ آئیہ کیسے ہوئی؟“

”سفر چھوٹا مگر تکیفیں زیادہ ہیں۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں، جنہیں دوست سمجھا اور جن پر گمان تھا وہ سارے گمان اور خواب کا بج کی طرح ٹوٹ گئے۔ لیکن کہتے ہیں نا کہ جہاں اندھیرا زیادہ

پیار ہے دنیا کی ساری بہنوں سے زیادہ پیار ہے۔ میری تعلیم بی اے آنرز ہے اور میں نے ٹاپ کیا کراچی یونیورسٹی میں اپنے شعبے میں اور مجھے اس کا علم ہی نہیں ہوا۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ میں یہ کارنامہ انجام دے چکی ہوں۔

میں شادی شدہ ہوں۔ میرے دو بیٹے ہیں محمد زریان اور محمد آذین، شوہر کا تعلق بھی شعبہ صحافت سے ہے اور ان کا نام محمد امین ہے بہت خیال اور پیار کرنے والی شخصیت ہیں اور میرا سسرال بھی بہت اچھا اور احساس کرنے والا ہے۔“

”آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“

”آج کل کی مصروفیات کا مت پوچھیں۔ سوتے میں بھی دماغ میں اسٹوری چل رہی ہوتی ہے۔ اور جاگتے میں کردار چلتے پھرتے نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ اچھے بھلے مزے مزے کے کھانے بنایا کرتے تھے اب بس خیالی پلاؤ پکتے ہیں۔ اور ایسا جب ہی ہوتا ہے جب آپ کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے اپنی محنت میں شدت اور جنون لے آئیں۔ گھر میں بہت کم وقت گزرتا ہے۔ زیادہ تر آفس اور آفس کی مصروفیات میں کم رہتی ہوں ایک پروڈکشن ہاؤس میں اسکرپٹ ایڈیٹر ہوں۔“

”لکھنے کا عمل کب سے جاری ہے؟“

”مجھے نہیں یاد کہ لکھنے کا عمل کب سے شروع ہوا۔ البتہ یا قاعدہ لکھنے کا عمل تب شروع ہوا جب میں ”انٹر“ میں تھی۔ تب میں نے ایک کہانی لکھی تھی۔ جو





”کیا اسکرپٹ کے بعد آپ کا کام ختم ہو گیا یا آپ سیٹ پر ساتھ ساتھ رہیں؟“

”خواہش تو بہت تھی کہ ساتھ ساتھ رہوں۔ لیکن مصروفیات نے اجازت نہیں دی۔ البتہ میں کانٹینٹ ہیڈ کی ٹیم اور ڈائریکٹر کے ساتھ رابطے میں رہی اور ٹیم کے ساتھ ساتھ کام کرتی رہی اور یوں یہ سفر تمام ہوا اور ”ماں“ آن ایئر ہو گیا۔

رب کی شکر گزار ہوں کہ سیریل پسند کیا جا رہا ہے اور مجھے جتنا شان دار ریپانس میرے گھر والوں نے دیا کسی نے نہ دیا ہوگا۔ بہن کی روشن آنکھیں، بھائی کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر لگتا ہے کہ محنت وصول ہو گئی میرے دوست احباب جو شدت سے منتظر تھے اس سیریل کے انہوں نے پسندیدگی کا اظہار کر کے حوصلہ افزائی کی۔ اور سسرال والوں کو تو یقین ہی نہیں آیا کہ میں ایسا کوئی کام کر سکتی ہوں۔ سب بہت خوش ہیں اور ان سب کی محبت کے ساتھ ساتھ میرے شوہر کی سپورٹ نے میرے لیے اس کام کو آسان کر دیا۔“

”گرین لی وی کا انتخاب کیوں کیا؟ دیگر مقبول چینلو کو چھوڑ کر؟“

”میں سمجھتی ہوں کہ عمارت کھڑی کرنے کے لیے پہلے زمین کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ گرین میرے

ہوتا ہے۔ وہیں سے روشن پڑتی ہے۔ مجھے بھی کچھ انجان چہروں نے وہ اپنائیت دی کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بے شک وہ رب العزت جسے چاہے عزت دے۔ سہیل پونس اور محمود الہی نے حوصلہ افزائی کی اور رمضان ٹرانسمیشن میں میرا پہلا ڈرامہ آن ایئر ہوا ”بھوک“ کے نام سے اور شکر الحمد للہ جس نے بھی بھوک ڈرامہ دیکھا اس کے دل پر اثر ہوا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے بعد ماشاء اللہ کئی سنگل پلے آن ایئر ہوئے۔ اور آج یہ سفر یہاں تک پہنچا کہ ڈرامہ ”ماں“ گرین چینل سے آن ایئر ہے۔“

”جب ڈرامہ سیریل ماں کا ذکر ہے اور دیگر ڈراموں کا تو یہ بتائیں کہ جگہ بنانے میں کہاں مشکل ہوئی۔ ڈائجسٹ میں یالی وی میں؟“

”مشکل تو دونوں جگہ ہوئی۔ آپ کو پتا ہے کہ دوستوں کے ساتھ مخالفین کی بھیڑ میں اپنی جگہ بنانا آسان نہیں ہوتا بہت انتظار اور جدوجہد کے بعد اللہ نے کامیابی دی۔“

ایک ڈائجسٹ میں پہلی کہانی ایک آپ بیتی تھی اور پھر وہی کہانی کسی نے چرا کر اخبار جہاں میں تین عورتیں تین کہانیاں میں دے دی اور لی وی میں پہلا ڈرامہ ”بھوک“ تھا جو رمضان ٹرانسمیشن میں آن ایئر آیا۔“

”آپ کا سیریل ”ماں“ ناظرین پسند کر رہے ہوں گے یقیناً۔ اس کو مکمل ہونے اور سیٹ پر آنے کے لیے کتنا تاخیر لگا؟“

”یہ کہانی تقریباً ڈیڑھ سال پہلے لکھنا شروع کی تھی۔ پھر بیچ میں اسے روک دیا گیا۔ پھر حکم آیا کہ اسے فوری طور پر پورا کرنا ہے۔ پھر مشین کی طرح کام کیا اور تقریباً تین ماہ بعد یہ سیٹ پر گیا۔“

کہانی تو ایک عام سی ہے کہ ہمارے یہاں لڑکیوں کی پیدائش کو بہ خوشی قبول نہیں کیا جاتا بعض گھروں میں تو بیٹی کی پیدائش پر طلاقیں ہو جاتی ہیں۔ تو اپنے اس پوائنٹ آف ویو کو منوانے کے لیے کافی بحث و مباحثہ کرنا پڑا۔“

لیے کامیابی کا پہلا زینہ ہے۔ پہلا دروازہ ہے گرین کی اسکرین بہت جان دار اور شان دار ہے اور گرین کا فوج بھی بہت براہمٹ ہے اس نے ناظرین کو بہترین ڈرامے دیئے ہیں۔

اور رب کا شکر ہے کہ مجھے ”ماں“ کے لیے بہت زیادہ دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بس کہانی کے پیچ و خم نے بہت ٹائم لیا۔ راتوں کو دیر تک کام کرنا پڑا۔ جلدی جلدی سین بنانے پڑے۔ مگر کائنیت ٹیم نے بہت ساتھ دیا۔ اکثر شوٹنگ ہوتے دیکھتی تھی تو لگتا تھا کہ کوئی بہت بڑا خواب پورا ہو رہا ہے۔

”اب اگلا پروجیکٹ کون سا ہے؟“

”جی اگلے پروجیکٹ پہ بھی کام ہو رہا ہے اور وہ ابھی لکھنے کے مراحل میں ہے تو ٹائم تو لگے گا۔ آسانوں کے لیے دعا کیجئے گا۔“

”اس میں سینئر جو نیئر سب ہی فنکار ہیں۔ کس نے بہت متاثر کیا آپ کو؟“

”مجھے رفیق احمد اور یحییٰ آصف کی عادت بہت اچھی لگی۔ دونوں بہت کو آپریٹو ہیں۔ میری خواہش تھی محمد احمد کے ساتھ کام کرنے کی جو کہ پوری ہوئی اور آپ کو بتاؤں کہ میں ایک بہت ہی شان دار انٹر ویو ان کا لے چکی ہوں اور انہوں نے میرا نام روٹی ہوئی آنکھوں والی لڑکی رکھا تھا۔“ خیر..... سنیتا مارشل، سلٹی ظفر اور سعد آفریدی سب ہی بہت اچھے رہے میرے ساتھ۔

اور کائنیت ہیڈ میں محمود الہی اور پروڈیوسر ہابر جاوید اور عروج بخت ارسلان نے بھی بہت محبت سے اپنا فرض ادا کیا۔ کسی بھی ڈرامہ سیریل میں بہت سارے لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بہت سارے لوگوں کی دعائیں ہوتی ہیں۔ میرے گھر والے میرے سب سے بڑے سپورٹر تھے۔ خاص طور پر میری بہن نے میرا بہت خیال رکھا۔

”رائٹرز کی تحریروں میں مشاہدات ہوتے ہیں یا آپ کے تصورات و تجربات بھی ہوتے ہیں؟ اور آپ کی شخصیت کا عکس بھی ہوتا ہے؟“

”میرا خیال کہ رائٹرز کی تحریروں میں تجربات بھی ہوتے ہیں مشاہدات بھی اور ہمارے اپنے خیالات و تصورات بھی ہوتے ہیں، لکھتے لکھتے آپ بہت کچھ ایسا لکھ جاتے ہیں جو زندگی میں کہیں نہ کہیں کر گزرے ہوتے ہیں۔ بھی کسی اور کی زندگی کا مشاہدہ آپ کے پاس ہوتا ہے اور بھی آپ اپنے تصورات کی دنیا سے وہ کچھ ڈھونڈ لاتے ہیں جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر زندگی اس کا موقع نہیں دیتی۔

جہاں تک عکس کی بات ہے تو رائٹر کے مزاج کا کوئی نہ کوئی پہلو شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے۔ میں نے ڈائجسٹ میں کچھ ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں اپنی ذات کو ڈسکس کرنے کا موقع ملا، اور میں نے کیا بھی۔ ان تحریروں کے نام نہیں بتاؤں گی۔ کیونکہ میری شخصیت بہت دہری ہے اور پر سے سنجیدہ اور اندر سے شرارتی۔ بس جہاں جیسا موقع ملتا ہے ویسا اظہار ہو جاتا ہے۔“

”قلم سے وابستہ ہوئے کتنے سال ہو گئے ہیں؟“

”قلم کے حوالے سے وقت کا شمار کرنا ذرا مشکل ہے۔ لم سم ڈائجسٹ کی دنیا میں تو تقریباً بائیس سال جس میں مدیرہ ہونے کے ساتھ ساتھ کئی افسانے اور ناول بھی لکھے۔ اور ٹی وی میں تقریباً چار سال، جس میں کئی سنکل پلے بھی لکھے۔ سیریل پہلا ہے جبکہ سنکل پلے تو کافی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ میری شاعری کا ایک مجموعہ بھی کتابی شکل میں منظر عام پر آچکا ہے ”صحرا ہوا کہ ساون“ کے نام سے۔“

”کہتے ہیں کہ ڈرامہ رائٹر تو راتوں رات بہت امیر ہو جاتا ہے۔ آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟“

”ارے یہ کہاں کا خواب ہے۔ بھی جو کام مہینوں میں مکمل ہوتا ہے اس کا پھل بھی سالوں میں ملتا ہے۔ دعا کریں کہ جلدی جلدی مزید پروجیکٹ پر کام کروں پھر آپ کے اس سوال کا جواب مزے سے دوں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے یحییٰ احمد سے اجازت چاہی۔ شکریہ یحییٰ

☆☆



خط بھجوانے کے لیے پتا۔

ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔

Email: shuaa@khawateendigest.com

کبیر کی ذہن آرا سے شادی نہیں ہو پار ہی ویسے کبیر کو لکھنو نہیں جانا چاہیے تھا۔ اب اللہ جانے کون کبیر کو مل گیا۔

”تجھ سے بھی دلفریب“ اس میں بچوں کی تربیت

کے بارے میں اچھا لگا۔ مگر بچوں کو تھوڑی اسپیس چاہیے

ہوتی ہے بچوں کی تربیت کے ساتھ صدقہ جاریہ اپنے لیے

ضرور کرنا چاہیے۔ آج کل تو زندوں کو کوئی یاد نہیں رکھتا تو

مرنے کے بعد کون یاد رکھے گا۔ نیکیاں کرتے رہیں گے تو

مرنے کے بعد لوگوں کے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

ج: پیاری مسرت! اتنا اچھا تبصرہ کیا ہے کہ پڑھ کر

دل خوش ہو گیا۔ ہم آپ سے متفق ہیں زندگی کو جیل

نہیں بنانا چاہیے۔ پڑھنے کا ٹائم، کھیلنے کا ٹائم، سونے

جاگنے کا ٹائم، کھانے کا ٹائم اتنی زیادہ پابندیاں بغاوت پر

اکساتی ہیں۔ یا بچے ڈل ہو جاتے ہیں، ایسے بچے والدین

سے اپنی سرگرمیاں چھپاتے ہیں بقول اقبال لازم ہے دل

کے ساتھ رہے یا سب ان عقل لیکن کبھی کبھی تھا بھی چھوڑ

دے۔ انہما پندی کسی بھی کام میں غلط ہے۔

مسرت حسن نے ڈیلاس امریکہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں
”دھوپ درپچہ“ میں عشنا تو بے حد خطرناک لگ
رہی ہے، حادثہ کو ذرا بھی عقل نہیں آ رہی۔ اتنا پڑھا لکھا
لڑکا، بزنس کرنے والا لڑکا ہے مگر اس کو کھوٹے کمرے کی
پہچان ہی نہیں ہو رہی اور ایک خراب لڑکی کی وجہ سے اپنے
گھر کو ہی چھوڑ دیا۔

”تیرے بعد“ واقعی میں ہر ایک کو اپنے اندر کے
انسان کی بات سننا چاہیے۔

”خالہ زبیدہ کا دسترخوان“ جو دوسروں کو کھلاتا ہے۔
اللہ اس کے گھر کے برتن کبھی خالی نہیں رہنے دیتا اور کبھی
کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

”آہ نیم کش“ عدن اور میر عثمان کی جوڑی اچھی
ہے مگر ان کی لائف میں الجھنیں آ رہی ہیں۔ صفا اور سبیل
کی پڑھائی کے متعلق جملے بہت مزے دار ہوتے ہیں۔

”بہترین فیصلہ“ رشنا جیسی لڑکیاں ہمارے

معاشرے میں بہت ہیں جو سسرال کے مظالم سہتی ہیں۔

”اپنوں کے درمیان“ اف پڑھ کر بہت ہنسی آئی

فرشی شلوار کا کیا مذاق اڑایا ہے شہیل بھابھی کا دکھاوا، رکھ

رکھاؤ اور شو آف طبیعت کی وجہ سے سب ان سے فاصلہ

رکھتے تھے ان کی ہی وجہ سے صندوق سے بھی فاصلہ رکھتے

تھے۔

اس میں گول گپوں کا اتنا تذکرہ ہوا کہ آج شام کو

ہی ہم سب نے چائے کے ساتھ گول گپوں کا اہتمام کیا

اور خوب انجوائے کیا، واقعی بالکل ٹھیک ہے کہ اولاد کی

خاطر ماں باپ اس جگہ بھی کھٹنے ٹیک دیتے ہیں جس جگہ وہ

قدم رکھنا پسند نہیں کرتے۔

”چاہت کے انداز“ اس میں خالہ نے بہت اچھا

کیا۔ واقعی سب سے بنیادی چیز اعتماد ہوتا ہے۔

”چار ہاشت کا فاصلہ“ اس میں استنبول کے قہوہ

خانے کا بڑا اچھا منظر پیش کیا گیا۔ پڑھ کر بس ٹھیک ہی لگا۔

”موڑ تو سارے من کے ہیں“ تاجور جیسی عورتیں

زندگی کا عذاب ہوتی ہیں۔ عاشر اور ظافر کی بہن سے محبت

اچھی لگی۔

”ککا کنارے“ کبیر کے والد اچھے نہیں تھے تو

ایمن خالد باجہ گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے رسالے پڑھنے کا شوق ماما، بابا، خالہ اور آپ سے ہوتا ہوا ہم بھائی، بہنوں میں منتقل ہوا ہے۔ اتنے سالوں سے ہم آپ کے خاموش قاری ہیں۔ ان رسالوں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ”پیارے نبی کی باتیں“ اور ”باتوں سے خوشبو آئے“ سب سے بہترین سلسلے ہیں۔ ”جب تجھ سے نانا جوڑا“ آپ کو اچھا سسرال ملا، خوشی ہوئی۔ فواد خان کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ گلوکار بھی ہیں۔ آغا علی کا انٹرویو پڑھ کر اسکول کے دنوں کی یاد آگئی جب اپنی دوست سے اللہ دیکھ رہا ہے کا ادائیں فی فرمائش کر کے سنتے تھے۔ خطوط پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے گریز گوسپ، ایک ہی کہانی پر مختلف اظہار رائے۔ ”نیا سال، نئی بہار“ سمیرا حمید اللہ آپ کے قلم میں اور برکت ڈالے۔ آپ کی بات سید حادل میں اتر جاتی ہے۔ ”دھوپ درپچ“ میں مجھے شاہانہ پیمپو اور ضامن کا کردار بہت پسند ہے اور عشنا بالکل بھی پسند نہیں۔

”گنگا کنارے“ تقسیم ہند سے پہلے والی کہانیاں ہمیں بہت فیسیٹ کرتی ہیں۔ ایسا رکھ رکھاؤ، شائستہ انداز گفتگو آج کل ناپید ہے۔ طلعت آ پا اور ذہین ہمیں دکھی کر دیتی ہیں۔ محبت یا تو ہونی نہیں چاہیے، ہو جائے تو ملنی چاہیے۔ فضیلت یکم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ضروری تو نہیں کہ کیر باب کا رہو تو ہو۔

”آہ نیم کش“ اتنے راز ا مجھے لگتا ہے کہ سبیل میر عثمان علی خان کی بیٹی ہے پہلے لگتا تھا کہ آدم کو ان ہی نے باڑ کیا ہے مگر اب لگتا ہے کہ اس کے انھیال (وسیم طلوی) میں سے کوئی اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ ویسے آج کل آسیہ رئیس خان، سمیرا حمید، فردانہ کھریل اور مرزا احمد ہماری پسندیدہ ہیں۔

میری خالہ کہہ رہی ہیں کہ مالا پر دو ہارہ افسوس کر لو میری طرف سے۔ ”موز تو سارے من کے ہیں“ واہ حمیرا علی! بہترین! اشفاق کو شارمین بنا کر آخر تک ہمیں کامیابی سے دھوکے میں رکھا پر شکر ہے شفاق کی پی ایڈنگ تھی۔ ”انہوں کے درمیان“ دادو کا کردار مزے کا تھا اور

افشین کا بھی، جس نے پیاری صندلین کا احساس کیا۔

”تیرے بعد“ یہ سبق دے گیا کہ اپنے حق کے لیے خود ہی لڑنا پڑتا ہے۔ ”خالہ زبیدہ کا دسترخوان“ ایسے لوگوں کی وجہ سے ہی دنیا میں اچھائی اور برکت ہے۔

”بہترین فیصلہ“ ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے جو بیٹی اور بہو میں فرق رکھتے ہیں ایک کو مہارانی، دوسری کو نوکرانی سمجھتے ہیں۔ سمن کی خالہ کا ”چاہت کا انداز“ بہت بھایا۔ ”تجھ سے بھی دلفریب“ یاد دہانی کروا گیا کہ دنیا کے کاموں میں لگ کر ہم ساتھ لے جانے والی نیکیاں اکٹھی کرنا نہ بھولیں۔ شعر و شاعری اتنی مرغوب نہیں۔ ”مسکراہٹیں“ مسکرانے پر مجبور کر گئیں۔ قوم لوط کے انجام سے دنیا کو نصیحت پکڑنی چاہیے۔ ”موسم کے پکوان“ کبھی آزمائے نہیں۔ البتہ ”بیوٹی بکس“ کے ٹوٹکے وقتاً فوقتاً آزماتے رہتے ہیں۔

ج: پیاری ایمن! تفصیلی تبصرے کے لیے تمہ دل سے ممنون ہیں۔ آپ نے پورا پرچہ پڑھ کر مختصر الفاظ میں بہت جامع تبصرہ کیا۔ اب ہماری محفل میں شرکت کرتی رہے گا۔ آپ نے صحیح لکھا ہے۔ رکھ رکھاؤ اور شائستہ انداز گفتگو نایاب ہی ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصاً غلط اردو بولنا فیشن ہو گیا ہے۔ املا غلط جملے غلط، پڑھ کر سوچتے ہیں کہ ان کا بھی کیا قصور ہے سزا ان کے استادوں کو ملنی چاہیے۔

لاہور سے ام ہادیہ شہزاد نے شرکت کی ہے لکھتی ہیں تین ماہ ہو گئے بھائی کو گئے لیکن دل ایسے ہی تکلیف میں ہے جیسے اس کی رخصتی کے وقت تھا۔ کوئی مجھے دیکھتا ہے تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے، وہ جو پہلے مجھے کہتے تھے کہ لگتا ہی نہیں کہ تمہارے پانچ بچے ہیں اور اب کہتے ہیں کہ تم تو بوڑھی ہو گئی ہو سارے ہال اتر گئے اور جو بچے وہ سارے سفید ہو گئے ہیں تین ماہ میں نظر کمزور ہو گئی ہے ویسے میرے بچے مجھے رونے نہیں دیتے، اب بھی سب سے چھوٹی والی عین اور کالی لے کر آئی میرے پاس کہ ماما کتنے دنوں سے آپ کو کچھ لکھتے نہیں دیکھا لکھیں۔

سارا شاہ پڑھ لیا ہو تو بتائیں بھی کہ کیسا لگا پہلے تو بہانہ بنا دیا کہ مجھے کام ہے لیکن وہ بھی ضدی ہے لکھوا کر چھوڑا آپ سے ہی اپنے غم شیر کر لیتی ہوں کیونکہ جن

سے کرتی تھی ان کی حالت بھی میرے جیسی ہے، اللہ میری امی کو صبر دے۔ آمین۔

اب بات ہو جائے شمارے کی، ہمیشہ کی طرح شان دار ٹائیکل تھا مجھے تو بہت پسند آیا۔ مریم عزیز کا ناول شان دار تھا حارث کو ذیل کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ گنگا کنارے مزہ آرہا ہے بڑھ کر۔ آہ نیم کش مجھے لگتا ہے کہ سبیل کی دادی اس کی سگی دادی نہیں ہے، صفا کا کردار مزے کا ہے۔ میراجی لکھیں اور اچھا نہ لگے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بڑی پراعتاد بھی ہانو۔ ”میلے دل“ پسند آئی۔ ابھن بھی اچھا تھا، لو بہار آگئی پہلے تو لڑکے کا کاروبار گھر دیکھا جاتا تھا کہ کما تا بھی ہے کہ نہیں لیکن آج کل یہ سب لڑکی والوں میں دیکھا جاتا ہے کہ باپ بھائی کتنا کما تے ہیں۔ جہیز کیسا ملے گا اور کتنا اور اگر لڑکی کا باپ یا بھائی ملک سے باہر ہو تو پھر تو سونے پہ سہاگہ ہے ان کے لیے جنہیں لڑکی لے کے نہیں جانی لڑکا دے کے جاتا ہے۔ باقی سارے سلسلے بھی اچھے تھے، فرخندہ سلیم نے بہت اچھا لکھا مجھے ان کا شعر بھی بہت پسند آیا تھا اور جناب ہمارے یہاں بہت سردی ہے سچ اتنی اسموگ ہے آس پاس کچھ نظر نہیں آتا کمرے میں کبل میں بیٹھی خط لکھ رہی ہوں پھر بھی ٹھنڈ لگ رہی ہے اس لیے اب مجھے اجازت دیں زندگی رہی تو پھر ملیں گے سچی میرے لیے تو یہ ایک ملاقات ہے۔

ج: پیاری بہن! آپ کا دکھ بہت بڑا ہے۔ مبر آتے آتے آئے گا۔ آپ کو جب بھی بھائی کی یاد آئے، ان کی مغفرت کی دعا کریں۔ بندے پر جو بھی مصیبت آتی ہے۔ اگر وہ مبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا اجر دیتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اپنی صحت پر توجہ دیں۔ خود سے اتنی لا پرواہی ٹھیک نہیں۔ اس سے آگے چل کر پیچیدگیاں بھی ہو سکتی ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔
عشرہ مومن نے ڈیرہ غازی سے شرکت کی ہے
نوروری کا شعاع سرورق کی وجہ سے بہت پیارا لگا
نہرست میں میرا حمید کا نام لہوں پر مکان لے آیا۔ ان

کے الفاظ کمر پر حوصلے کی چھکی بن کر دل میں اتر گئے۔
”دھوپ درپچہ“ ذیل بہت پسند ہے ہالہ کا نام اچھا لگتا ہے۔ حارث کی عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے جب پیٹ بھرے گا اپنی کھوئی سے آگے گا۔ حماد بہت سلیجھا ہوا لڑکا ہے؟ ذیل کی شادی حماد سے ہوگی۔ ”گنگا کنارے“ اتنا مشکل کہ دماغ کے کنارے ہی لگا رہا، دماغ کے اندر نہیں جا پا رہا۔ دعا ایوب کا ”تیرے بعد“ بے حد عمدگی سے لکھا گیا ہے ایک مثالی کردار پیش کیا دعائے۔

خالہ زبیدہ کے دسترخوان نے آنکھیں بھگو دیں۔
مجھے بھی بہت شوق ہے اس طرح کا دسترخوان لگانے کا۔
اس لیے پڑھتے ہوئے آنسو روک نہیں رہے تھے۔

نادیہ جہانگیر کا ”بہترین فیصلہ“ بہت پسند آیا
نصرت جبین کا ”چاہت کے انداز“ میں سن کی خالہ نے
بہت اچھا کیا، اپنی بھانجی کو شکی انسان سے بچالیا۔ قاتلہ آپا
تو ہمیشہ کی طرح دل فتح کر لیتی ہیں البتہ رفعت قاطمہ کا
استنبول کی رائیٹر پر لکھائے انداز کا افسانہ بھی پسند آیا۔

ج: پیاری عشرہ! کافی عرصہ بعد محفل کو رونق بخشی
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک
آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ اب
باقاعدگی سے شرکت کرتی رہے گا۔

اقراء بتول آڑا اکبر شاہ سے لکھتی ہیں
نواد خان سے مجھے ملاقات پسند نہیں آئی۔ کچھ
خاص ان کا انٹرویو نہیں لگا آغا علی کا انٹرویو مختصر سا تھا۔ نسیم
کوثر کراچی میں رہنے کی وجہ سے ہمیشہ ان کا پہلا خط ہوتا
ہے۔ سب بہنوں کے احوال جان کر مزہ آتا ہے۔ دھوپ
درپچہ میں مجھے حارث سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ وہ
کول اور خالہ کی خاطر گھر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہ دونوں تو
ڈائن نگلیں آخر کار حارث کو باپ کے خلاف کر دیا۔ ذیل
پہلے ہی حالات کی باری ہوئی تھی۔ اب اس کے ساتھ یہ
حالات ہو رہے ہیں۔ اب کہانی ایک نئے موڑ پر آگئی
ہے۔ دعا ایوب کے افسانے ہمیشہ ایسے مشکل ہوتے ہیں۔
تیرے بعد میں باپ کے جانے کے بعد اولاد تخت سے جا
گرتی ہے۔ ان کے ساتھ معاشرہ جو حال کرتا ہے ان پر

مریم عزیز

گھر کی دھڑکی

لاہور کے ایکس بڑے بزنس مین غلام عباس کی خوب صورت بیٹی ہالہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے جہاں ایک لڑکا مقب اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ ہالہ اسے نظر انداز کرتی ہے۔ غلام عباس کا بڑا بیٹا حارث بزنس میں باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کی ناہید خالہ جولاہور کے پسماندہ علاقے میں رہتی ہیں اپنی پاؤں کے کہنے پر ان کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے، ان کی بڑی بیٹی کوئل حارث کے خواب دیکھتی ہے جبکہ حارث کی مغلنی بچپن ہی میں اپنے مرحوم چچا



ایاز کی بیٹی ذیل سے ہو چکی ہے۔ ذیل کی بااں فرحانہ کی شادی اس کے لالچی بھائی وحید نے عبدالقدوس سے کر دی تھی ذیل اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی۔ اس کے ماموں ممانی اس کی شادی پیسوں کے لالچ میں کسی غنڈے سے کرانا چاہتے تھے۔
میرون ملک سے آئی شاہناہ اپنی بیٹی ذیل کو غلام عباس کے گھر لے آتی ہیں۔

ضامن اور فرقان گہرے دوست ہیں ضامن کے باپ ہاشم اپنی بیوی شاہینہ سے دہتے ہیں جن کی کئی بہنیں کینیڈا میں رہتی ہیں۔ ضامن کی دوست علیزہ اس سے شادی کی خواہش مند ہے۔

کوئل ذیل کے آنے پر خوف زدہ ہے، وہ ہر حال میں حارث کو پانا چاہتی ہے اس کے لیے وہ نیند کی گولیاں کھا لیتی ہے مجبوراً حارث اس کو شادی کے لیے اپنا پہلا آپشن بتاتا ہے۔

ضامن کی پھوپھو کینسر کی مریضہ ہے اپنے بیٹے اسد کے ساتھ بھائی سے ملنے امریکہ جاتی ہیں۔

علیزہ کا کزن سمیر پاکستان سے امریکا جاتا ہے اسے علیزہ پسند آ جاتی ہے۔

سلیم صاحب اپنے بچوں کی خاطر ناہید بیگم کے ساتھ رہنا چاہتے تھے جو ان کو گوارا نہ تھا مجبوراً وہ بچوں کو اپنے گھر چلنے کا کہتے ہیں، ناہید بیگم ان پر بھڑک اٹھتی ہیں۔

سردار اکبر وحید کی شکایت پر سردار باذل سے باز پرس کرتے ہیں۔ جس پر وہ مزید اشتعال میں آ جاتا ہے۔ عشنا اپنی بہن کے کہنے پر ظہیر کو فائزہ کے خلاف بھڑکانی ہے ثاقب اپنی ماں سے عباس سے از حد نفرت اور انتقام کی وجہ پوچھتا ہے۔ حماد حارث اور غلام عباس کے امریکہ جانے کے بعد بزنس میٹنگ پر ہوٹل آتا ہے اور اس کی ٹکرافت سے ہوتی ہے جو ظہیر کی باتوں پر دھمی دھمی وہ اپنا دل رو کر ہلکا کرتی ہے۔ رضا صاحب اپنی بیٹی کے گفت پر بہت خوش ہیں۔

رضا صاحب اور غلام عباس کی پرانی دوستی تھی۔ حماد کی کامیابی پر دونوں بھائی مٹھائی لینے جاتے ہیں کہ راستے میں کوئل کی کال آ جاتی ہے۔ حارث اسے پک کرنے چلا جاتا ہے۔

سلیم صاحب اپنے گھر میں حارث کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں وہ ناہید کو ماضی میں غلام عباس کا رویہ یاد دلاتے ہیں، ناہید پر غلام عباس سے بدلہ لینے کا جنون سوار ہے۔

حماد شاہانہ اور اپنی ماں کو حارث اور کوئل کے بارے میں بتاتا ہے نفیسہ افسردہ ہیں کہ انہوں نے حارث کی ڈیوٹی اس عیار عورت کے گھر کیوں لگائی۔

ثاقب فائزہ کے ذریعے ہالہ کو اپنی سالگرہ پر مدعو کرتا ہے وہ انکار کرتی ہے تو فائزہ کے گھر آ کر جھوٹا بہانہ بنا کر اسے لے جاتی ہے ثاقب ہالہ سے اقرار محبت کرتا ہے اور ہالہ کوئی ریسپانس نہیں دیتی۔

کنول ثاقب کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتی ہے کہ وہ اس طرح غلام عباس سے بدلے کی آگ بجھانا چاہتی ہے۔

سردار باذل غلام عباس سے راہ و رسم بڑھانے کی خاطر بزنس میٹنگ کے بہانے ملتا ہے حارث کو اس پر شک ہے، علیزہ سمیر کے رشتے کو انکار کر دیتی ہے۔ اور ضامن سے شادی کا کہتی ہے جس پر اس کے والدین

ضامن کے والدین کو رشتہ لانے کا کہتے ہیں، ادھر حارث پاکستان جا رہا ہے اور عروج اس کے جانے سے پریشان ہے۔

غلام عباس ایک ریسٹورنٹ میں ناہید کو اس کے پرانے بوائے فرینڈ کے ساتھ دیکھ لیتے ہیں دونوں منہ چمپا کر بھاگ جاتے ہیں۔

شہر کے ہنگاموں میں ہالہ فائزہ پھنس جاتی ہیں حماد ان کو پک کرتا ہے۔ ذیل کے لیے حارث کی ڈیوٹی تھی پر وہ کوئل کے فون پر اسے لینے چلا جاتا ہے۔

غلام عباس حارث کو مل سے شادی کرنے کی خواہش کے باعث گھر سے نکال دیتے ہیں۔ نفیسہ بیٹے کے غم میں اسپتال پہنچ جاتی ہیں شاہانہ ہالہ کے بلانے پر آتی ہیں۔

فائزہ ہنگاموں کے باعث دیر سے گھر پہنچتی ہے۔ عشنا رضا صاحب سے غلط بیانی کرتی ہے کہ فائزہ گھر پر ہے وہ اس سے ناراض ہیں۔ فائزہ سے بدلہ لینے کی جلن عشنا کو تڑپاتی ہے وہ اس پر غصہ ہوتی ہے اور اچانک اپنا

موڈ بدل لیتی ہے رضا صاحب فائزہ کو قصور وار سمجھتے ہیں۔ عشنا ظہیر کو بھی فائزہ کے خلاف بھڑکائی ہے۔ کول حارث کا فون نہ ملنے پر ناراض ہے وہ ناہید سے غلام عباس سے نفرت کا سبب پوچھتی ہے پر وہ نہیں بتاتی۔ شاپنگ مال میں ایک ٹی وی پروڈیوسر سجاد رضوی اسے اداکاری کی آفر دیتا ہے۔

سولہویں قسط

”تم دونوں چل رہے ہو یا نہیں۔“ شاہانہ نے گھور کر اپنی اولاد کو دیکھا جو کب سے صوفے پر اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔
 ”ہم زیمیل آپ کے ساتھ لوڈو کھیلیں گے پھر وہ ہمارے لیے نوڈلز بنائیں گی۔“ یقیناً زیمیل نے انہیں لالچ دے کر روکا تھا۔
 ”زیمیل۔“ ان کے آواز دینے پر وہ کچن سے نکلی۔
 ”جی پھوپھو۔“

”بیٹا، یہ دونوں تمہیں تنگ کریں گے۔“
 ”نہیں کرتے پھوپھو، میں سنبھال لوں گی۔“ اس کے کہنے پر انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا تو اس کی نظر اندر داخل ہوتے حماد پر پڑی جو ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر مسکرایا تھا لیکن جس طرح وہ سارے گھر میں شرارتیں کرتا پھرتا تھا، وہ اس نے بند کر دیا تھا وہ کچھ بھی کہے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو زیمیل نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔

ایک شخص کے جانے سے سارے گھر کا ماحول بدل گیا تھا، اس دن کے بعد سے سب ایسے ظاہر کر رہے تھے جیسے سب ٹارٹل ہے لیکن ٹارٹل تو کچھ بھی نہیں تھا اور زیمیل کو اپنا آپ خطا وارد لگتا تھا وہ سب اس کے متعلق اس سے کوئی بات نہیں کرتے تھے انہیں لگتا تھا وہ کچھ نہیں جانتی۔

وہ سب ٹھیک کرنا چاہتی تھی اس سے نفیسہ کا افسردہ چہرہ، حماد کی سنجیدگی، ہالہ کے آنسو، انوری بوا کی خاموشی نہیں دیکھی جانی تھی اس نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ وہ اس کا نہیں..... اسے صبر نہیں آیا تھا پر درد برداشت کرنے کا سلیقہ آ گیا تھا، اسے سب کو یہی بتانا تھا اسے اس انکار سے کوئی فرق نہیں پڑا وہ بھی اس کے دل اور خواب و خیالوں میں نہیں رہا۔

”زیمیل۔“ انوری بوا کی آواز پر اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ ”ایسے کیوں کھڑی ہو۔“
 ”کچھ نہیں بوا، میں سوچ رہی تھی ان شیطانوں کو قابو کرنے کے لیے کیا کروں۔“ انوری بوا نے منہ بتاتے بندروں کی طرح قلابازی لگاتے رچا اور ایان کو دیکھا۔

”میرا خیال ہے انہیں خرگوشوں کے پنجرے میں بند کر دیتے ہیں۔“ انوری بوا کے کہنے پر وہ ہنس پڑی۔
 ”اور پھوپھو کو پتا چلا تو جانتی ہیں نا۔“

”ارے چھوڑو کون بتائے گا اس کے آنے سے پہلے انہیں باہر نکال لیں گے۔ اور کہہ دیں گے خود ہی بند ہوئے تھے۔“ زیمیل نے نفی میں سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے انہیں ہیری پورٹر لگا دیتے ہیں وہ سووی ان کو پسند ہے۔“
 ”ہاں وہ مجھے بھی پسند ہے۔“ انوری بوا جلدی سے بولیں۔

”چلیں پھر آپ ہالہ کو بلا لیں میں نوڈلز لے کر آتی ہوں۔“ وہ کوکہ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

وہ لاؤنج میں داخل ہوئے تو غیور اور فضیلت اسی طرف آرہے تھے یقیناً انہیں ان کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی فضیلت پہلے شاہانہ اور پھر نفیسہ کے گلے لگیں۔

”ارے بھابھی، بڑی کمزور لگ رہی ہیں طبیعت ٹھیک ہے آپ کی۔“

”ہاں اللہ کا شکر ہے بس تھوڑا سا بی پی لورہا ہے پچھلے کچھ دن۔“

”تب ہی میں کہوں آپ تو ہمیشہ بڑی فریض نظر آتی ہیں۔“

”اب یہیں ساری گفتیش کر لوگی۔ دیکھ بھی رہی ہوں ان کی طبیعت بہتر نہیں بجائے بٹھانے کے وہیں ساری انگوڑی کرنے کھڑی ہو گئی ہو۔“

غیور صاحب تپ کر بولے تو انہوں نے ایک غصیلی نظر شوہر پر ڈالی اور مسکرا کر سب کو دیکھ کر اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ ابھی بیٹھے تھے ڈرائنگ روم میں بھاری مردانہ آواز پر سب کی نظریں دروازے کی طرف گھومیں۔ ”السلام علیکم تایا جان۔“ وہ سیدھا غلام عباس کی طرف بڑھا عباس صاحب نے گرم جوشی سے اسے اگلے لگایا۔

”پہچانا بھائی کون ہے۔“ غیور صاحب نے خوشی سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔

”نہ پہچاننے والی کیا بات ہے غیور، یہ ہمارا حارب ہے۔“ انہوں نے پیار سے اس کا کندھا تھپتھپایا تو اس نے جھک کر ساتھ بیٹھی نفیسہ کو سلام کیا، انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیر کر اسے دعا دی، وہ مسکرا کر سیدھا ہوا اور نظر سامنے صوفے پر گئی۔ صرف ایک بل کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت اتری، اگلے ہی بل وہ شاہانہ کے گلے لگ گیا۔

”واٹ اے پلیمنٹ سر براؤز پھوپھو، مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں آپ بھی آئی ہوئی ہیں، پتا ہے کتنے سالوں بعد میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ بالکل ویسی کی ویسی ہیں آپ۔“ اس کے والہانہ انداز پر فضیلت کے منہ کا زاویہ بگڑا۔

پتا نہیں شاہانہ میں کیا جادو تھا سارے بھتیجے، بھتیجیاں اس پر فدا تھے، یہ حارب جو دو عیال پر واری صدقے جا رہا تھا، جب ماموں خالا میں آئی تھیں تو منہ کے زاویے ہی سیدھے نہیں ہو رہے تھے، خاندانی اکڑ کر ساتھ منہ سو جا کر بیٹھا تھا اب دانت ہی اندر نہیں جا رہے تھے وہ کڑھتی ہوئی بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ بھی حماد سلام کرتا اندر داخل ہوا۔

”کسے ہیں حارب بھائی۔“ حماد اس سے گلے ملتے ہوئے بولا۔

”یار، اگر تم مجھے بھائی نہ کہتے تو مجھے پتا ہی نہیں چلنا تھا تم کون، ہوج میں نے پہچانا ہی نہیں تھا ماشاء اللہ کتنے بڑے ہو گئے ہو۔“

”جب سالوں بعد ملو گے تو ایسا ہی ہوگا۔“ غیور صاحب کے طنزیہ انداز پر وہ مسکرا کر دوبارہ حماد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”حارث نہیں آیا۔“ اس کے سوال پر حماد نے غلام عباس کی طرف دیکھا۔

”وہ اس وقت پاکستان میں نہیں کام کے سلسلے میں دہلی گیا ہے۔“

”اچھا۔“ حارب نے سر ہلا یا وہ اب حماد سے اس کی تعلیم اور روئین کے متعلق بات کر رہا تھا جبکہ فضیلت کھانے کا انتظام دیکھنے اٹھ گئی تھیں۔

”بھابھی اہالہ اور زمیل کو بھی لے آئیں۔“ کھانے کے بعد وہ چائے پی رہے تھے جب فضیلت کو اچانک ہالہ اور زمیل کی یاد آئی۔

”انوری کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور بچے بھی کھیل میں لگن تھے آہی نہیں رہے تھے تو کسی کو ان کے پاس رکنا تھا اس لیے وہ دونوں گھر پر رک گئیں۔“

”اتوار کو غیاث کا نکاح ہے کل جمعہ ہے تو ہم نے میلاد رکھا ہے میرے سارے بہن بھائی آرہے ہیں اور رشتہ داروں کو بھی بلایا ہے، آپ تو گھر والے ہیں آپ لوگوں کی شرکت لازمی ہے ہالہ اور زمیل کو آپ نے لازمی لے کر آنا ہے میں کوئی یہاں نہیں سنوں گی۔“ فضیلت کے دو ٹوک انداز پر نفیسہ نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”پرسوں ڈھو کی رہی ہے میری بھتیجیاں اور بھانجیاں ضد کر رہی تھیں کوئی دھوم دھڑکا بھی ہونا چاہیے تو میں نے کہا چلو ڈھو کی رکھ لیتے ہیں، بچیاں بھی خوش ہو جائیں گی اور پھر اگلے دن نکاح ہوگا۔“ ان کی بات سن کر شاہانہ کی زبان میں زبردست جھلکی ہوئی تھی۔

”بھابھی، ڈھو کی، میلاد، نکاح، تین دن تو فنکشن ہو گیا اس سے بہتر تھا مہندی، نکاح اور ولیمہ کر لیتے بات ہی ختم ہوتی۔“

”یہی کہا تھا میں نے اسے لیکن پہلے کبھی اسے میری بات سمجھ میں آئی ہے جواب آتی۔“ شاہانہ کی بات پر غیور صاحب نے تپ کر بیوی کو دیکھا۔

”کوئی بات نہیں ابا، اگر امی کی ایسی خواہش ہے تو حرج کیا ہے۔“ حارب کی حمایت پر غیور صاحب کچھ نہیں بولے تو فضیلت نے بڑے فخر سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔

”شاہانہ میں ان شاء اللہ بڑی دھوم دھام سے اپنے بچے کے سارے فنکشن کروں گی، دو ہی تو میرے بچے ہیں یہ سب ان کا ہی تو ہے لیکن میں چاہتی ہوں پہلے حارب کی شادی ہو پھر غیاث کا نکاح تو اس لیے کرنا پڑا کیونکہ میری بھابھی کے والد بیمار ہیں اور وہ چاہتے تھے ان کے سامنے ان کی نواسی کا نکاح ہو جائے ورنہ میں تو صرف منگنی ہی کرتی ہاں یہ الگ بات ہے کہ وہ بھی بڑی دھوم دھام سے کرتی۔“

”اچھی بات ہے بھابی اللہ تعالیٰ یہ نکاح مبارک کرے۔“ شاہانہ کے دعا دینے پر سب نے آمین کہا تھا۔

”حارب! اب تم آئے ہو تو کرلو شادی یا پھر وہاں کوئی لڑکی پسند کی ہے۔“ شاہانہ نے شرارت سے اس کا چہرہ دیکھا اس سے پہلے وہ کوئی جواب دینا فضیلت بول پڑیں۔

”وہ کیوں کوئی لڑکی پسند کرے گا۔ میرا بچہ بڑا سیدھا اور فرماں بردار ہے جہاں ماں باپ کہیں گے وہیں کرے گا۔“ انہوں نے پیار سے حارب کا چہرہ دیکھا جوانگی سے اپنی ابرو کھجور ہاتھا۔

”ڈھو کی پر بہت سی لڑکیاں آرہی ہیں، میری بڑی بہن کی بیٹی بہت پیاری ہے، اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ حارب کا خیال آتا ہے اب حارب آیا ہوا ہے تو دونوں کو ملوادوں گی اور حارب کو پسند آجائے تو شادی، منگنی، نکاح جیسا چاہے۔“ وہ جیسے سب پہلے سے سوچ بیٹھی تھیں، حارب کو اپنے ارد گرد خطرے کی گھنٹیاں بجتی محسوس ہونے لگیں۔ اس کا کافی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور کسی کزن سے تو بالکل بھی نہیں۔

”امی، میرا خیال ہے، آپ غیاث کے نکاح کی تیاری کریں میرا خیال ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“ آخر اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات کردی لیکن اس کی بات پر فضیلت کا مسکراتا چہرہ بھجھ سا گیا۔

”لیکن حارب۔“

”فضیلت، سارے فیصلے تم نے آج ہی کرنے ہیں ابھی حارب کو آئے دو دن ہوئے ہیں، صبر کرو وہ ابھی یہیں ہے۔“ غیور صاحب کے کہنے پر انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو مزید کچھ کہنے سے روکا تھا۔

”بھائی، اب سب اکٹھے ہیں تو لگے ہاتھوں آپ بھی ذیل اور حارث کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“ غیور صاحب کی بات پر ان تینوں کے رنگ اڑے تھے انہوں نے غلام عباس کی طرف دیکھا جو مسکرا رہے تھے۔

”ہاں میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن۔“ ان کی لیکن پر نفیسہ نے بے ساختہ بے چینی سے پہلو بدلا۔

”لیکن۔“ فضیلت نے بے چینی سے پوچھا۔

”حارث اور ذیل کی عمر میں کافی فرق ہے اور مزاجوں میں بھی..... ایک تو ذیل کو پڑھنے کا بہت شوق ہے، دوسرا اس کی عادات اور مزاج دیکھ کر مجھے لگتا ہے کہ ابھی اسے شادی کی ذمہ داری میں نہیں ڈالنا چاہیے پھر حارث کی ماں اور پھوپھو نے اس کی شادی کا شور مچایا ہوا ہے تو میں نے سوچا حارث کی شادی کر دیتے ہیں جبکہ ذیل کے لیے کچھ سال بعد کوئی اچھا سارشتہ دیکھ کر اس کو بھی رخصت کر دیں گے۔“ عباس صاحب کے مطمئن انداز پر شاہانہ نے دزدیدہ نظر سامنے بیٹھے تینوں نفوس پر ڈالی، حارب کے تاثرات مارل تھے جیسے اسے اس بات سے کوئی سروکار نہ ہو، فضیلت کے چہرے پر تجسس تھا جبکہ غیور صاحب تھوڑے پریشان نظر آ رہے تھے۔

”اچانک آپ نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا ابھی کچھ دن پہلے آپ کہہ رہے تھے کہ ذیل اور حارث کا نکاح کر دیں گے اور اگر حارث راضی ہوا تو رخصتی بھی کر دیں گے ذیل بعد میں پڑھتی رہے گی۔ تو اچانک منع کیوں کر رہے ہیں۔“

”ابھی حالات دیکھ کر مجھے جو مناسب لگ رہا ہے اسی حساب سے فیصلہ کیا ہے۔“

”آپ کی بات سے تو لگ رہا ہے آپ منگنی ختم کر رہے ہیں۔“

”ہاں ایسا ہی ہے۔“ غیور صاحب کے پریشان انداز پر عباس صاحب اطمینان سے گویا ہوئے تو غیور صاحب نے پریشانی سے نفیسہ کو دیکھا جو سر جھکائے بیٹھی تھیں، جبکہ فضیلت کے دل میں کینہ سی خوشی جاگی تھی ناجانے کیوں انہیں لگ رہا تھا اس بات کے پیچھے کوئی بہت دھما کے دار خبر ہے۔

”کیا آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہے ہیں بھائی حارث اور ذیل کی بچپن کی منگنی ہے سارا خاندان اس بات کو جانتا ہے اور ہمارے خاندان میں منگنی توڑنا بہت برا سمجھا جاتا ہے رشتہ داروں کو باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔“

”مجھے رشتے داروں کی پروا نہیں میرے نزدیک ضروری ہے کہ میرے بچوں کے لیے کیا اچھا ہے۔“

”بھابھی، آپ کچھ نہیں کہیں گی۔“ عباس صاحب سے مایوس ہو کر انہوں نے نفیسہ کو مخاطب کیا۔

”آپ کے بھائی نے اگر یہ فیصلہ کیا ہے تو سوچ سمجھ کر کیا ہوگا، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ ان کی دھیمی آواز پر غیور صاحب نے گہرا سانس لیا۔ ماحول میں ایک دم محسوس کی جانے والی خاموشی چھانگنی سب کے چہرے پریشان تھے، سوائے فضیلت کے جو مسکراتی نظروں سے نفیسہ کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھیں انہیں اب یقین ہو چلا تھا کہ کچھ ہوا ہے ایسا جو کافی سالے دار ہے جس کے ہاتھ آتے ہی وہ برسوں کی جلن کو مٹا سکیں جو انہیں نفیسہ کی خوشی دیکھ کر ہوتی تھی۔

”اب بات نکلی تھی تو میں نے کر دی لیکن یہ بات تمہارے گھر سے فی الحال نہیں نکلی جائے گی کیونکہ غماٹ کا نکاح ہے سب رشتے دار جمع ہوں گے میں نہیں چاہتا انہیں الٹی سیدھی بات کرنے کا موقع ملے اور کوئی بد مزگی ہو جس سے تمہاری خوشی خراب ہو۔“ غیور صاحب کے بعد انہوں نے فضیلت کو دیکھا لیکن وہ تو اپنے خیالوں میں نفیسہ کو ذیل ہوتا دیکھ رہی تھیں۔ عباس صاحب، حماد، غیور اور حارب کی ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے جبکہ شاہانہ نفیسہ کے ساتھ چلتی کار کی طرف بڑھ رہی تھیں، اچانک نفیسہ لڑکھڑائی میں تو شاہانہ نے تیزی سے انہیں بازو

سے تھا۔
 ”طبیعت ٹھیک ہے بھابی۔“ پریشانی سے ان کا چہرہ دیکھا ان کا بازو بالکل سر دھتا۔
 ”شاہانہ، میرا دل بہت پریشان ہے تین ہفتے ہوئے ہیں حارث کو گھر سے گئے پتا نہیں وہ کہاں ہے کیسا ہے
 تم اپنے بھائی سے بات کرو کہ بے شک اسے نہ بلا میں لیکن یہ تو پتا کریں وہ کہاں ہے حیرت سے ہے۔“
 ”بھابی، آپ پریشان نہ ہوں میں بھیا سے بات کرتی ہوں۔ اور کیوں اسے گھر نہ بلا میں وہ ان شاء اللہ
 جلدی گھر آئے گا۔“ انہیں ساتھ لگائے وہ ہلکی آہ میں بولیں۔

☆☆☆

گاڑی سے اتر کر وہ اندر کی طرف بڑھ رہے تھے جب شاہانہ کی آواز پر رکے۔
 ”آپ کیا واقعی حارث اور زمیل کا رشتہ ختم کر رہے ہیں۔“
 ”یہ مشورہ تم نے ہی مجھے دیا تھا۔“
 ”میں نے ایسا کب کہا بھیا۔“ شاہانہ نے حیرت اور پریشانی سے انہیں دیکھا۔
 ”تم نے مجھے کہا تھا کہ اگر کوئی ہالہ کے لیے ایسا انکار کرتا تو کیا میں اسے اپنی بیٹی دیتا۔ تو بس یہی سوچ کر
 میں نے فیصلہ کیا ہے۔“
 ”چلیں اب سب مجھ پر ڈال دیں۔“ وہ افسوس سے بولی۔
 ”اگر آپ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے تو پھر حارث کو بھی واپس بلا لیں۔“ ان کی بات پر عباس صاحب کے ماتھے
 پر ہل نمودار ہوئے۔

”میں نے یہ فیصلہ زمیل کی بہتری کے لیے کیا ہے لیکن حارث نے جو غلطی کی ہے اس کی سزا تو اسے ملے
 گی اور ممکن توڑنے کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ اس لڑکی کو میں اس گھر کی بہو تسلیم کر لوں گا۔“
 ”میں بھی بالکل اس حق میں نہیں کہ حارث اس لڑکی سے شادی کرے، میں تو بس یہ کہہ رہی ہوں حارث کو
 گھر بلا لیں سب کتنے پریشان ہیں اور بھابی وہ ماں ہیں، وہ بے چاری باپ بیٹے کی لڑائی میں پس رہی ہیں نہ
 آپ کو کچھ کہہ سکتی ہیں اور نہ حارث کو کچھ کہہ سکتی ہیں۔“
 ”یہ تو اسے اپنی بہن سے ہمدردی کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“
 ”چھوڑ دیں بھیا، پرانی باتیں، حارث کی مجھے کبھی ٹینشن ہو رہی ہے پتا نہیں بے چارہ کیسے گزرا کر رہا ہو
 گا۔“ ان کی ہمدردی پر عباس صاحب نے ابرو اچکا کر انہیں دیکھا۔
 ”بے چارہ کیسے ہو گیا، کون سا وہ مجبور بے کس غریب آدمی ہے، کروڑوں اس کے بینک اکاؤنٹ میں
 موجود ہیں جس دن میں نے اسے گھر سے نکل جانے کو کہا، موصوف لاہور کی سڑکوں پر بے یار و مددگار نہیں پڑے
 تھے بلکہ اسی رات فلائٹ پکڑ کر وہی کالج گئے تھے نواب صاحب اور بجائے ہوٹل میں رکنے کے اپنے اپارٹمنٹ
 میں بسیرا ڈال کر بیٹھے ہیں، شکر کرو گھر سے نکالا ہے بینک اکاؤنٹ بند نہیں کروائے۔“ ان کے طنز یہ انداز پر شاہانہ
 کی ہلکی نکل گئی۔

”کتنے جالاک ہیں آپ بھیا، اسی لیے اتنے مطمئن تھے آپ، کیونکہ آپ کو اس کے پل پل کی خبر تھی لیکن
 مجھے بھابی کی فکر ہے بے چاری بیٹے کی جدائی میں بیمار ہو گئی ہیں۔“
 ”میں غلطی کرنے والوں کو اتنی جلدی معاف نہیں کرتا۔“
 ”اس معاملے میں آپ ابا جی پر نہیں بالکل دادا جان پر چلے گئے ہیں۔ دادی بتاتی تھیں وہ جس کو سزا دینا
 چاہتے تھے اسے بھگا بھگا کر ترسنا ترسنا کر سزا دیتے تھے۔“ ان کی بات پر عباس صاحب نے گہرا سانس لیا۔

”میں ظالم نہیں شاہانہ، معاف کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے اور میں اس کا ادنیٰ سا بندہ ہوں۔ ہاں میرے کچھ اصول ہیں میں زیادتی نہیں کرتا اور اگر کوئی مجھ سے دغا بازی یا زیادتی کرے تو جلدی میرا دل صاف نہیں ہوتا، میں پھر اسے اپنی تکلیف ضرور دیتا ہوں کہ اسے اندازہ ہو کہ اس نے اگلے انسان کو کتنی تکلیف دی ہے اگر اس وجہ سے میں کسی کو برا یا ظالم لگتا ہوں تو مجھے پروا نہیں۔“

”کون کہتا ہے آپ ظالم ہیں۔“ شاہانہ نے مسکرا کر اپنے شان دار بھائی کو دیکھا۔

”منہ پر تو کوئی نہیں کہتا لیکن انداز بتا دیتے ہیں، اپنی بھابھی کی مثال لے لو ایسے معصوم شکل بنا کر مجھے دیکھتی ہے جیسے مجھ سے زیادہ بے رحم کوئی بھی نہیں۔“

”معصوم تو ہیں میری بھابھی، اس میں تو کوئی شک نہیں اب بے چاری منہ سے کچھ نہیں کہیں تو آنکھوں سے بھی شکوہ نہ کریں۔“

”تم..... تمہاری بھابھی اور تمہارا بھتیجا ہی مظلوم ہیں۔“ وہ جل کر بولے تو وہ کھل کر ہنس دیں حارث کی خیریت کا سن کر دل سے جیسے کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔

”بھیا، اگر آپ نے زیمیل اور حارث کے بارے میں سوچ لیا تھا تو کم از کم غیور بھائی کے گھر اس بارے میں بات نہیں کرنی چاہیے گی، بھابھی کی عادت کا تو آپ کو پتا ہے ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹ دیں گی۔“

”میں، آتے ہوئے غیور کو منع کیا تھا اس بات کا ذکر وہ کسی سے نہ کرے اور وہ نہیں کرے گا۔“

”غیور بھائی کی تو میں بات ہی نہیں کر رہی وہ تو سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ میں تو فضیلت بھابھی کی بات کر رہی ہوں جن کے ڈیلے اسی وقت ادھر ادھر گھومنے لگے تھے، انہیں تو ویسے بھی لوگوں کی کمزوریوں کو ہائی لائٹ کرنے میں مزہ آتا ہے اور بھابھی سے ویسے بھی وہ حسد کرتی ہیں۔“

”اب اس کے حسد کا تو میں کوئی علاج نہیں کر سکتا یہ بات تو تمہاری معصوم بھابھی اور بھتیجے کو سوچنا چاہیے تھا کہ لوگ کیا کہیں گے اور دوسرا اگر فضیلت یہ بات خاندان میں پھیلائی ہے تو بھی اچھی بات ہے آج نہیں تو کل سب کو پتا چلنا ہی ہے تو ویسے نہ سہی ایسے ہی سہی۔“ انہوں نے کہنے کے ساتھ اسے بازو کے حلقے میں لیا تو شاہانہ نے بغور اپنے بھائی کا چہرہ دیکھا۔

”پتا نہیں کیوں پر مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے آپ تو اتنی آسانی سے نہ ہار مانتے ہیں اور نہ ضد سے جھجھکتے ہیں، پھر آپ نے حارث کی بات کے آگے اتنی جلدی سرینڈر کیسے کر دیا۔“ انہوں نے آنکھیں سکیڑ کر مشکوک نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھا تو ان کے انداز پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے جبکہ ان دونوں کو دیکھنے آئے حماد نے خوش گواری حیرت سے باپ کے قہقہے کو سنا اور ان کے قریب آیا تو عباس صاحب نے حماد کو اپنے دوسرے بازو کے حلقے میں لے لیا۔

”تمہیں کس نے کہا میں نے حارث کی بات مان لی ہے، میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں ناہید کی بیٹی کبھی میری قیمتی کا حصہ نہیں بن سکتی اور جہاں تک زیمیل کی مشکلی ختم کرنے والی بات پر میں رضامند ہوا ہوں تو اس میں زیمیل کی بھلائی اور حارث کی سزا ہے اور یہ آنے والا وقت خود بتائے گا۔“ ان کے کہنے پر شاہانہ نے جاچتی نظروں سے ان کا چہرہ دیکھا جبکہ حماد نے ناگہی سے شاہانہ کو دیکھا۔

”اب اگر تمہاری تسلی ہو گئی ہو تو اندر چلیں دیر ہو گئی ہے مجھے صبح جلدی آفس جانا ہے۔“ ان کے کہنے پر شاہانہ نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تو وہ یوں ہی دونوں کو بازوؤں کے حلقے میں لیے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

”ابا، آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔“ وہ دیکھ رہا تھا جب سے عباس صاحب گئے تھے وہ کچھ پریشان

تھے۔

”میں پریشان نہیں صرف سوچ رہا ہوں کہ بھیا کے اس اچانک فیصلے کی کیا وجہ ہے کچھ دن پہلے تو وہ کافی خوش تھے، ہالہ کے ساتھ حادث کے نکاح کے بارے میں سوچ رہے تھے اور آج وہ منگنی ختم کرنے کا کہہ رہے ہیں وہ بھی سالوں پرانی مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی۔“ اندر آئی فضیلت استہزائیہ انداز میں مسکرائیں۔

”آپ یہاں بیٹھ کر جتنا مرضی کڑھ لیں فائدہ نہیں کیونکہ عباس بھائی نے آج تک آپ سے اپنے دل کی بات کی ہے جواب کریں گے۔ چاہیں اندر ہی اندر کیا کچھڑی پکار ہے ہیں آپ کے عباس بھائی..... آپ مانیں یا نہ مانیں کوئی بہت بڑی کڑ بڑ ہے دیکھا نہیں سارے کتنے چپ چاپ تھے اور غصہ بھائی ان کو تو میں نے پہلی بار یوں کم صدم دیکھا ہے اور تو اور حادث بھی یہاں نہیں ایک ہفتے پہلے غیاث بتا رہا تھا وہ آفس گیا تھا پتا چلا حادث دو ہفتوں سے آفس ہی نہیں آرہا، مجھے تو کوئی بڑا چکر لگتا ہے۔“ وہ آنکھیں گھماتے بولیں۔

”امی! بتایا جان بتا تو رہے تھے وہ بزنس کے سلسلے میں دعویٰ کیا ہے۔“

”نا بیٹا میں تم لوگوں کی طرح پاگل نہیں اپنی آنکھیں اور کان دونوں کھلے رکھتی ہوں انہوں نے کہا اور ہم نے مان لیا اتنا ہی آسان ہے نا لوگوں کو پاگل بنانا۔“ وہ طنز یہ نہیں۔

”چلو اس نے اب نئی نکالی ہے۔“ غیور صاحب بے زاری سے بولے۔

”نہ مانیں پر میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا، یہ سب کسی لڑکی کا چکر ہے ورنہ آپ خود سوچیں اگر شادی کے لیے راضی ہوتا تو مسئلہ ہی کیا تھا، مسئلہ تو یہ ہے وہ راضی نہیں اور جب وہ راضی نہیں ہوا ہوگا تو عباس بھائی نے غصے سے حادث کو گھر سے نکال دیا ہوگا یا وہ خود گھر چھوڑ کر چلا گیا ہوگا اور اب دوسروں سے چھپانے کے لیے بزنس ٹرپ کی کہانی بتا رہے ہیں۔“

حارب مسکرا ہٹ رو کے اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا جنہوں نے ایک کامیاب رائیٹر کی طرح کڑی سے کڑی جوڑ کر پوری کہانی تیار کر لی تھی۔

”یا اللہ کیا کروں میں اس عورت کے سازشی دماغ کا، جس طرح کی خود ہے ویسے ہی اگلے سے گمان رکھتی ہے۔“ غیور صاحب چڑکے بولے۔

”میں سچ بھی ہوں پھر بھی آپ نے مجھے ہی غلط کہنا ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولیں۔

”میری ایک بات کان کھول کر سن لو فضیلت۔ یہ بات اس گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں جانی چاہیے آئی بات سمجھ میں۔“ انہوں نے انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں انہیں دیکھا تو بڑی مشکل سے انہوں نے سر اثبات میں ہلایا۔

”آؤ حارب، باہر غیاث کے دوست آئے ہیں تم سے ملنے۔“

”جی ابا۔“ وہ ایک مسکراہٹ ماں کی طرف اچھالتا غیور صاحب کے ساتھ باہر نکل گیا تو فضیلت نے موبائل اٹھا کر اپنی بہن کو کال نکالی۔

”ہیلو رحمت، ایسی خبر سنانے والی ہوں، سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔“ دو گھنٹوں میں وہ آدھے رشتے داروں کو یہ خبر سنا چکی تھیں اور ہر کال کے آخر میں میرا نام نہ آئے کہنا نہیں بھولتی تھیں۔

☆☆☆

”ایسی کون سی خاص بات تھی جس کے لیے تم نے مجھے اتنی صبح میسج کر کے بلایا ہے۔“ وہ تیز تیز قدموں سے اس کے ساتھ چل رہا تھا میسج کے قریب پہنچنے پر وہ رک گئی اور کیر کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئی اور ہاتھ میں

پکڑی بوتل منہ سے لگا کر لمبے لمبے گھونٹ لیے جبکہ سمیر منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”کل مئی نے مجھے بتایا کہ سنگلی آنٹی کا فون آیا تھا اور وہ ہمارے رشتے کی بات کر رہی تھیں۔“ سمیر نے دونوں آنکھیں بند کر کے سر جھٹکا۔

”میں نے امی کو منع بھی کیا تھا ابھی آنٹی سے بات نہ کریں میں پہلے خود تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔“
 ”سمیر۔“

”علیزہ، پلیز پہلے میری بات مکمل ہونے دو۔“ کہہ کر اس نے زبان لیوں پر پھیری۔
 ”میں جب یہاں آ رہا تھا تو امی نے مجھ سے تمہارے بارے میں بات کی تھی انہیں تم پسند ہو اور وہ چاہتی تھیں میں تم سے مل لوں تم مجھے پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگیں، میرا ارادہ نہیں تھا یہاں رکنے کا صرف تمہاری وجہ سے میں یہاں رک گیا اور تمہیں جان کر تمہارے لیے میری پسندیدگی مزید بڑھ گئی ہے اسی لیے میں نے امی سے کہا تھا کہ وہ آنٹی سے بات کر لیں لیکن آنٹی نے ٹائم مانگا تو مجھے لگا میں خود تم سے بات کر کے تمہیں بتاؤں تم میرے لیے بہت خاص ہو اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ علیزہ کو ایسی ہی بات کی امید تھی اس لیے وہ حیران نہیں ہوئی۔

”سمیر، میں تمہاری فیملی کی قدر کرتی ہوں اور تم بھی مجھے پسند ہو لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“ سمیر نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”میں سمجھا نہیں اگر تم مجھے پسند کرتی ہو تو شادی کیوں نہیں کر سکتیں۔“
 ”کیونکہ تم مجھے صرف ایک دوست کی حیثیت سے پسند ہو جبکہ شادی کے لیے میں کسی کو پسند کر چکی ہوں۔ تم مل بھی چکے ہو اس سے۔ میرا دوست ضامن۔“

سمیر کتنی دیر اس کا چہرہ دیکھتا رہا جہاں کوئی افسوس یا پچھتاوا نہیں تھا۔
 ”اگر تم ضامن کو پسند کرتی تھی تو مجھے اتنا اسپیشل ٹریٹ کیوں کیا کہ میں غلط فہمی کا شکار ہو گیا۔“ اس نے اب نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لی تھیں۔

”میں نے کیا نا سمیر، تم مجھے پسند ہو اور میں واقعی تمہیں اچھا دوست سمجھتی ہوں اگر تمہیں میرے بی ہوؤر سے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی تو رشتہ بھیجے سے پہلے مجھ سے کفرم کرنا چاہیے تھا۔“
 ”ہوں۔“ کافی دیر بعد سمیر نے سر اثبات میں ہلایا۔
 ”دیکھو سمیر۔“

”اس اوکے میں سمجھ گیا ہوں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔
 اپنی بات کہہ کر وہ اس پر نظر ڈالے بغیر تیز تیز قدموں سے چلا اس کی نظروں سے اوچھل ہو گیا۔ وہ تیار ہو کر نیچے آئی تو سمیر ڈائینگ ٹیبل پر موجود نہیں تھا وہ بھی اس کا پوچھے بغیر ناشتا کرنے لگی وہ اسے جواب دے چکی تھی، پر پتا نہیں کیوں اس کا یوں خاموش ہو جانا اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا، اس نے اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن بار بار نو انسرینک کی شپ سنائی دے رہی تھی۔ وہ اتنی جھنجھلائی ہوئی تھی کہ اس سے سارا دن ٹھک سے کام بھی نہیں ہوا گھر پہنچ کر بھی اسے سمیر نظر نہیں آیا شاید وہ ابھی آفس سے لوٹا نہیں تھا، فریش ہو کر آدھے گھنٹے بعد جب وہ واپس آئی تو وہ سیدھی اس کے کمرے کی طرف بڑھی، ناک کرنے کے بعد کوئی جواب نہ آیا تو اس نے ہینڈل پر دباؤ ڈال کر دروازہ کھولا صاف سترے کمرے کو اس نے حیرت سے دیکھا عموماً اس کے کپڑے بکھرے رہتے تھے جبکہ سائیڈ ٹیبل پر اس کا لیپ ٹاپ چار چار اور اس کا فیمیلی فوٹو رہتا تھا وہ حیران ہوئی واپس مڑی۔
 ”ممی۔“ وہ فرح کو آواز دیتی کچن میں آئی جہاں وہ کباب تیار کر رہی تھیں۔

”سمیر آ یا نہیں ابھی۔“ اس کے سوال پر انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔
 ”اس نے تمہیں بتایا نہیں۔“
 ”کیا۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”وہ شفٹ ہو گیا ہے یہاں سے، یہاں سے دور پڑنا تھا اس کا آفس تو وہیں آفس کے قریب اسے کمرہ مل گیا ہے تو صبح ہی وہ اپنا سارا سامان لے گیا۔“ فرح تفصیل پر وہ کتنی دیر اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی اور اگلے پل اس نے ہونٹ میچ کر دوبارہ اس کو کال ملائی اور اس دفعہ بھی اس کا نمبر آف جا رہا تھا۔
 ”بھاڑ میں جاؤ۔“ اس نے غصے سے اس کا نمبر بلاک کر دیا۔

☆☆☆

رات کو سجاد رضوی سے میسجز پر بات کرتے ہوئے وہ لیٹ سوئی تھی اب بھی آنکھ میچ ٹون کی وجہ سے کھلی اس نے سر ہانے رکھا موبائل اٹھا کر دیکھا جہاں ایس آر لکھا تھا اس نے میچ اوپن کیا جہاں گڈ مارنگ کے ساتھ ڈھیر سارے ایہوجی تھے اس نے مسکرا کر میچ دیکھا، جب سے سجاد رضوی نے اس کا نمبر لیا تھا وہ روزانہ اسے میسجز کرتا اس کے میسجز اس کی تعریفوں سے بھرے ہوتے تھے وہ ہمیشہ اس کو اسپشیل فیل کروانا تھا، کول کو اس سے بات کرنا اچھا لگتا تھا چارون ہو گئے تھے ان کو میسجز پر بات کرتے ہوئے اس نے اب تک فون نہیں کیا تھا پردن میں کتنے ہی میسجز کرتا تھا گڈ مارنگ کا میچ کر کے وہ ابھی تو باہر سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دروازے کے قریب کھڑے ہو کر اس نے آواز پہچاننے کی کوشش کی جو کسی عورت کی بھی یقیناً کوئی محلے والی آنٹی آئی ہوں گی۔ اس نے سر جھٹک کر سوچا اور باتھ روم میں مہس گئی فریش ہو کر باہر آئی تو ناہید کے ساتھ فضیلت کو بیٹھا دیکھ کر کافی حیران ہوئی اور ان کے دیکھنے پر سلام کرنی ماں کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ فضیلت نے بغور کول کا جائزہ لیا جو دھلے چہرے کے ساتھ بہت فریش لگ رہی تھی۔

”میں نے تو سنا تھا تم نوکری کرتی ہو۔“ اس کی گھر میں موجودگی پر انہوں نے سوال کیا۔

”جی کرتی تھی پر چھوڑ دی۔“ آپ نے کچھ لیا نہیں آنٹی۔“

”نہیں ناہید کے ساتھ چائے پی ہے، غیاث کا نکاح ہے، اس سلسلے میں دعوت دینے آئی تھی فون پر بھی اطلاع دے سکتی تھی لیکن کافی عرصہ ہو گیا تھا ناہید سے ملے سوچا مل بھی آؤں گی اور دعوت بھی دے آؤں گی۔“
 ”مہربانی ہے تمہاری فضیلت، کہ تم نے ہمیں یاد رکھا ورنہ رشتہ داروں نے تو اپنی خوشی میں ہمیں شامل کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

ان کے دھمی انداز پر کول نے ناگواری سے پہلو بدلا، ماں کی یہ ہمدردی لینے والی عادات اسے سخت بری لگتی تھی اگر ان کے رشتے دار نہیں بلا جاتے تھے تو وہ کون سا مرے چارے تھے ان سے ملنے کے لیے۔

”کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں تم نہ صرف میری کزن ہو بلکہ میری سہیلی بھی ہو۔ یاد ہے نا بچپن میں تم، میں نفیسہ پاؤں اور کنول ہاتھی کتنے مزے کرتے تھے۔“

”ہاں وہ دور واقعی بہت اچھا تھا پھر سب جیسے ختم ہو گیا۔“ کچھ یاد آنے پر وہ افسردگی سے بولیں۔

”کنول ہاتھی کی کوئی خبر ملی بھی۔“ فضیلت کے پوچھنے پر ناہید نے افسوس سے سرنگی میں ہلایا۔

”وہ بھی ایسی بے وفائلی دوبارہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔“ فضیلت کے کہنے پر ناہید نے افسوس سے سر جھٹکا۔
 ”جو ان کے ساتھ ہوا تھا اس کے بعد یہاں دوبارہ دیکھنے کا جواز ہی نہیں بننا تھا۔“

”یہ کنول کون ہے۔“ خاموشی سے سستی کول کے استفسار پر وہ دونوں چوٹیں جو اس کی موجودگی کو فراموش کر چکی تھیں۔

”کوئی نہیں تم خالہ کے لیے کھانے کی تیاری کرو۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں باہر ڈرائیور کھڑا ہے، مجھے شاپنگ پر بھی جانا ہے میں تو بس تمہیں دعوت دینے آئی تھی۔ اور ایک بات بھی بتانی تھی۔“ ان کا انداز ایسا تھا کہ ناہید کے ساتھ کوئل نے بھی چوبک کر انہیں دیکھا۔

”کل عباس بھائی شاہانہ اور نفیسہ بھابھی آئے ہمارے گھر، نفیسہ بھابھی کا ہوتا ہے نا تمہیں ہمیشہ ٹپ ٹاپ سے رہتی ہیں، نہ بھی رہیں تو بھی ہمیشہ فریش اور خوب صورت نظر آتی ہیں۔“ فضیلت کی تعریف پر ناہید کے چہرے کا زاویہ بگڑا تھا۔

”پر کل تو وہ بیمار اور پریشان حال نظر آ رہی تھیں میں نے تو پوچھ ہی لیا تو کہنے لگیں بی بی لو تمہا اس وجہ سے ڈل ہیں۔ میں سن کر خاموش ہو گئی پھر تھوڑی دیر بعد عباس بھائی نے جو بات کہی وہ کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔“ انہوں نے سنسنی پھیلانے والے انداز میں بات کر کے دونوں ماں بیٹی کے چہرے دیکھے جو تجسس نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”کہہ رہے تھے انہوں نے حارث اور زمیل کی منگنی ختم کر دی ہے۔ ہے نا دھماکہ دار خبر۔“ بات کہہ کر انہوں نے داد طلب نظروں سے ناہید کو دیکھا۔

”تم یقین کرو مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ سنا ہے عباس بھائی منگنی توڑنے کی بات کر رہے تھے، جو کہتے تھے جو رشتہ طے ہو گیا وہ پتھر پر لکیر ہے اس بات پر یاد ہے نا کیا کچھ کیا تھا انہوں نے۔“ انہوں نے ناہید کو پچھلی بات کا حوالہ دیا۔

”اب جب بات اسنے بیٹے پر آئی تو اصول ہی بدل گئے۔“

”پر کوئی وجہ تو بتائی ہوگی۔“ حیرت کے جھٹکنے سے نکلنے کے بعد ناہید نے سوال کیا۔

”بڑی کوئی بے تکی سی وجہ دے رہے تھے جس کا نہ سر تھا نہ پیر، ویسے بھی پورے خاندان میں ان کے بچے اپنی قابلیت خوب صورتی اور فرماں برداری کے لیے مشہور ہیں۔ اب جب یہ بات کھلے کی تو مزہ آ جائے گا۔“ کہہ کر انہوں نے خوشی سے اپنے دونوں ہاتھ ملے۔

”عباس بھائی کا جتنا رعب ہے نا ان کا ایک بار کہنا ہی کافی ہوتا ہے، ہمارے گھر تک ان کا حکم چلتا ہے لیکن لگتا ہے اپنے بیٹے کو قابو کرنے میں نا کام رہے ہیں، لازمی بات ہے یہ منگنی عباس بھائی نے تو توڑی نہیں ہوگی یقیناً حارث نے منع کیا ہے اور مجھے تو کسی لڑکی کا چکر لگتا ہے اسی لیے تو نفیسہ بھابھی کا برا حال تھا۔“

”ناہید، تمہیں دیکھنا چاہیے تھا نفیسہ بھابھی کا چہرہ۔“

”کاش۔“ فضیلت کے کہنے پر وہ نفرت سے دل میں بول اٹھیں جبکہ خوشی کے پارے کوئل کی تو بولتی بند ہو گئی تھی۔ حارث نے منگنی توڑ دی یہ تو واقعی اس صدی کا معجزہ تھا اور یقیناً اس کی وجہ وہی تھی اور اس کا دل خوشی کے مارے تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

”آئی، ان لوگوں نے بتایا نہیں کہ لڑکی کون ہے جس کی وجہ سے حارث نے منگنی ختم کی۔“ کوئل کے سوال پر فضیلت نے افسوس سے سرنگی میں ہلایا۔

”تمہیں لگتا ہے وہ اتنے بے وقوف ہیں کہ اپنے منہ سے اپنی ہار کا اعتراف کریں گے، لڑکی کا تو ذکر بھی نہیں ہوا پر مجھے پتا ہے وجہ لڑکی ہی ہے ورنہ خود سوچو اتنی خوب صورت لڑکی جسے بیٹھے بیٹھائے مل رہی ہو وہ کیوں انکار کرے گا اگر انکار کر رہا ہے تو ضرور دوسری لڑکی ہے اب بڑے بزرگ ٹھیک ہی کہتے ہیں آدمی کے دل کا کوئی بھروسہ نہیں دل اگر گدھی پر آ جائے تو حور کیا چیز ہے۔“

ان کی مثال پر کوئل نے بے ساختہ پہلو بدلا۔

”اور وہ حارث بھی ساتھ تھا۔“ آخر ناہید نے وہ سوال کر لیا جو کب سے کول کرنا چاہ رہی تھی۔
 ”نہیں یہ ایک اور کہانی لگ رہی ہے حارث کو کافی دنوں سے کسی نے نہیں دیکھا میں اور غیور کچھ دن پہلے
 گھر گئے تھے، وہ گھر پر نہیں تھا حارب آیا ہوا ہے اس نے ملنا چاہا تو عباس بھائی نے بتایا وہ دی گیا ہوا ہے، غیاث
 بھی چار دن پہلے حارث سے ملنے آفس آ گیا تو وہاں بھی حارث نہیں تھا پوچھنے پر پتا چلا وہ کئی ہفتوں سے نہیں آ
 رہا اور کیوں نہیں آ رہا دفتر والوں کو پتا نہیں اور عباس بھائی کہہ رہے ہیں وہ آفس کے کام سے دی گیا ہے مجھے پتا
 ہے کیا لگتا ہے۔“ وہ آواز دھیمی کر کے آگے ہوئیں تو غور سے سنی کول اور ناہید بھی بے ساختہ آگے ہوئیں۔
 ”عباس بھائی نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔“ کول آنکھیں پھیلا کر پیچھے ہٹی۔
 ”گھر سے نکال دیا مطلب۔“ ناہید نے الجھ کر فضیلت کو دیکھا۔

”تمہیں لگتا ہے عباس بھائی اتنی آسانی سے کسی کو معاف کرتے ہیں اگرچہ انہوں نے مجبوری میں یا کسی بھی
 وجہ سے حارث کی بات مان کر معافی توڑ دی ہے لیکن اس بات کی سزا وہ ضرور دیں گے اور وہ دے سکتے ہیں اسی
 لیے مجھے لگتا ہے انہوں نے نا صرف اسے گھر سے بلکہ اپنی جائیداد سے بھی عاق کر دیا ہے۔“ اس دی جانے والی
 خبر پر ناہید نے پریشانی سے فضیلت کو دیکھا جبکہ خوشی سے جھومتی کول کو بھی جھٹکا لگا۔
 ”کیا انہوں نے ایسا کہا۔“

”نہیں عباس بھائی نے خود تو نہیں کہا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔“ وہ عورت اپنے اندازے بتا رہی تھی پر
 وہ یہ نہیں جانتی تھی اپنے اندازوں سے وہ ماں بیٹی کو جھٹکے پہ جھٹکے دے رہی ہے۔
 فضیلت کے فون پر بیل بجی تو انہوں نے چونک کر اپنا موبائل دیکھا۔
 ”دیکھو باتوں میں مجھے یاد ہی نہیں رہا ڈرائیور باہر کھڑا ہے اور بھی رشتہ داروں کے گھر جانا ہے۔ زیادہ
 لوگوں کو نہیں بلایا لیکن قریبی رشتے دار تقریباً سبھی انوائٹڈ ہیں۔“

”نفیسہ آ پا رہی ہیں۔“ وہ جو دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں رک کر ناہید کو دیکھا۔
 ”ظاہری بات ہے غیور کے لیے ان کی ٹیلی پہلے ہے اور نفیسہ بھابھی تو تمہیں پتا ہے سب کی فیورٹ
 ہیں۔“ وہ منہ ٹیڑھا کر کے بولیں جیسے کڑوا ہوا دم چھالیا ہو۔
 ”اچھا ناہید۔“ کچھ یاد آئے۔ ”بروہ ان کے قریب ہوئیں۔“

”یہ تو بچی بات ہے عباس بھائی کے گھر کچھ تو گڑبڑ چل رہی ہے لیکن مجھے پتا ہے سب اتنے بکے ہیں کوئی
 ہوا نہیں نکالے گا۔ اب پرسوں تم میلاد میں آ رہی ہو تو کیا تم نفیسہ بھابھی سے بات کرو گی آخر وہ تمہاری بہن ہیں
 شاید تمہیں بتا دیں۔“

”ہونہ بتا ہی نہ دیں۔“ وہ سر جھٹک کر بولیں۔

”تم لوگوں کو نہیں بتایا تو مجھے کیا خاک بتائیں گی۔“

”ہوں۔“ فضیلت نے سمجھ کر سر ہلایا۔

”بہر حال پرسوں تم نے سب بچوں کے ساتھ آنا ہے میں انتظار کروں گی۔“ کہہ کر وہ باہر نکل گئیں تو ناہید
 گہرا سانس لے کر واپس آئیں جہاں کول گہری سوچ میں تھی۔ وہ اس پر ایک نظر ڈال کر خاموشی سے اس کے
 سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اس کے بیٹھنے پر کول نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔
 ”آپ نے سنا، حارث نے منگنی توڑ دی سچ بتاؤں مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی اور خوشی
 کے ساتھ بے یقینی بھی ہے۔“ جبکہ خاموش بیٹھی ناہید نے ایک گہری نظر بیٹی کے جھگڑتے چہرے پر ڈالی۔
 ”سچ کہوں تو مجھے یقین نہیں جو فضیلت نے کہا۔“ اس کی بات پر کول کی مسکراہٹ سکڑی۔

”کیوں امی، انہیں کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔“

”ہوسکتا ہے جھوٹ نہ ہو لیکن یہ بات بھی نہ ہو۔ اسے ویسے بھی رائی کا پہاڑ بنانا آتا ہے۔“ کوئل نے ایسے سر جھٹکا جیسے اسے ماں کی بات پسند نہ آئی ہو۔

”امی، انہوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے عباس انکل نے کہا ہے کہ انہوں نے حارث اور زبیل کی منگنی ختم کر دی ہے اور یقیناً حارث نے یہ منگنی میری وجہ سے توڑی ہے۔“

اس نے فخریہ انداز میں شہادت کی انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ تو ناہید نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

”زیادہ خوش فہم ہونے کی ضرورت نہیں تم نے شاید اگلی بات پر دھیان نہیں دیا کہ عباس بھائی نے حارث کو گھر سے نکال دیا ہے۔“

”ہوسکتا ہے یہ فضیلت آنٹی کا اندازہ ہو۔“

”ہاں جو بات تمہارے مطابق نہ ہو وہ اندازہ ہو جاتا ہے۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولیں تو کوئل کچھ ہل خاموش ہو کر اندازہ لگانے لگی واقعی تقریباً مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا حارث نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا خیر وہ تو پہلے بھی فون میسجز نہیں کرتا تھا پر اس کے ہر فون اور میسج کا رپہلائے ضرور کرتا تھا۔ پر اب تو اس کا فون بھی آف جا رہا تھا۔

”تو آپ کو لگتا ہے کہ عباس انکل نے حارث کو گھر سے نکال دیا ہوگا۔“ کچھ دیر بعد جب وہ بولی تو اس کی آواز بے یقینی لیے ہوئے تھی۔

”غلام عباس سے کچھ بعید نہیں کب کیا کر دے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولیں۔

”میری اصل پریشانی تو یہ ہے کہ کہیں عباس بھائی نے حارث کو جائیداد سے عاق نہ کر دیا ہو۔“

”اللہ نہ کرے امی۔“ کوئل نے جیسے دہل کر ماں کو دیکھا۔ ”وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ ان کا سب سے بڑا بیٹا ہے سارا بزنس اس نے سنبھال رکھا ہے اب اتنی سی بات پر کہ وہ اپنی پسندگی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے کوئی گھر سے جائیداد سے بے دخل نہیں کر دیتا۔ ہزاروں لوگ ماں باپ کی مرضی کے خلاف جا کر شادی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ تو چھپ کر اور کچھ بھاگ کر بھی شادی کر لیتے ہیں لیکن ماں باپ کچھ عرصہ ناراض ہوئے کے بعد مان جاتے ہیں اور یہاں تو معاملہ ان کے لاڈلے بیٹے کا ہے مجھے یقین ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا فضیلت آنٹی واقعی رائی کا پہاڑ بنارہی ہیں، وہ منگنی سے انکار کرنے پر حارث سے ناراض ہو سکتے ہیں لیکن اسے جائیداد سے یا گھر سے بے دخل نہیں کر سکتے۔“

وہ ماں سے زیادہ خود کو یقین دلانے والے انداز میں بولی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ ان کے مایوس انداز پر کوئل نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

”آپ کو تو عادت ہو گئی ہے ٹیکلیو باتیں کرنے اور سوچنے کی۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے امی، جیت ہماری ہو رہی ہے، مال ہمارے کورٹ میں ہے، ہم جس طرح چاہیے اس کا استعمال کر سکتے ہیں۔“ اس نے کسی خیال کے آتے ماں کو مسکرا کر دیکھا۔ ناہید بھی مسکرائی۔

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو واقعی بازی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ میں ہمیشہ یہی چاہتی تھی غلام عباس اور نفیسہ کو ہارا ہوا دیکھوں اور پرسوں جب میں نفیسہ اور غلام عباس کے مایوس اور بے بس چہرے دیکھوں گی یقیناً مانو دل کو ایسا سکون ملے گا جو برسوں سے نہیں ملا۔“

”ایسا ہی ہوگا امی، میں حارث کو ایسے اپنی مٹھی میں کروں گی کہ وہ میرے لیے سب کو چھوڑ دے گا میں راج کروں گی اس کے محل نما گھر پر ہر سال چھٹیوں میں سنگاپور، ملائیشیا، دبئی، سویٹزرلینڈ، انگلینڈ جاؤں گی۔“ وہ جاگتی

آنکھوں سے بڑے بڑے خواب دکھ رہی تھی۔
 ”اور اس چکر میں تم ہمیں بھول گئی ہو۔“ ناہید ناراضی سے کہنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
 ”بے فکر رہیں آپ کو کون کو بھی پیش کرواؤں گی۔“

”اب ناشتا کر کے میرے لیے اچھا سا جوڑا استری کر دو، بلکہ ایسا کر دو جو کریم کلر کا چکن کا سوٹ ہے وہ استری کر دو۔“ ناہید کسمندی سے کہہ کر وہیں صوفے پر لیٹ گئی، جبکہ کوئل ناشتا بناتے ہوئے مسلسل فوج پلاننگ کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ تیار ہو کر ڈائینگ روم میں آئے تو نفیسہ، ہالہ اور حماد پہلے سے موجود تھے جبکہ گلشن ناشتے کے لوازمات ٹیبل پر رکھ رہی تھی بیٹھتے ہوئے انہوں نے ایک سرسری لیکن گہری نظر نفیسہ پر ڈالی جو سر جھکائے بیٹھی تھیں، ان کا اترا ہوا چہرہ اور ٹھکی ہوئی آنکھیں بے خوابی کی ترجمانی کر رہے تھے انہوں نے گہرا سانس لے کر جوس کا گلاس اٹھا لیا۔ بھی زیمیل اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں نفیسہ کا فون تھا جو مسلسل بج رہا تھا عباس صاحب کو دیکھ کر اس نے جلدی سے سلام کیا اور فون نفیسہ کی طرف بڑھایا۔

”تائی امی آپ کا فون۔“ نفیسہ نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا اور اسکرین پر فضیلت کا نام دیکھ کر ان کا چہرہ مزید اتر گیا۔

”السلام علیکم۔“ انہوں نے فون کان سے لگا کر بات کا آغاز کیا جبکہ زیمیل ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگی۔ فون بند کرنے کے بعد انہوں نے عباس صاحب کی طرف دیکھا جو منتظر نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”بھابھی کہہ رہی تھیں ہالہ اور زیمیل کو میلاد سے پہلے بھیج دیں۔“ ان کے کہنے پر عباس صاحب کے ماتھے پر ہل پڑے۔

”کیوں۔“
 ”کہہ رہی تھیں اکیلی ہیں سو کام ہیں بچیاں ساتھ ہوں گی تو مدد بھی ہو جائے گی اور ان کا دل بھی لگا رہے گا۔“

”تو جو اس کی اتنی بھتیجیاں بھانجیاں ہیں وہ مدد نہیں کر سکتیں۔“ ان کے سوال پر نفیسہ خاموش رہیں اب اس بات کا وہ کیا جواب دے سکتی تھیں۔

”خوشی کا موقع ہے منع کرنا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی فضیلت نے کون سے ان سے کام کروانے ہیں۔ کام والی بہت ہیں ان کے گھریلو سے بلارہی ہے۔ دوسرا اس نے شکوہ کیا ہے کہ زیمیل پر ہم قبضہ جما کر بیٹھ گئے ہیں اگر یہ اس کے تایا کا گھر ہے، تو وہ بھی اس کے تایا کا گھر ہے انہیں لگتا ہے ہم اسے وہاں جانے سے منع کرتے ہیں۔“

اس الزام پر زیمیل نے گھبرا کر غلام عباس کی طرف دیکھا وہ بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”ہوں۔“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔

”میلاد سے پہلے حماد چھوڑ آئے گا۔“ ان کی اجازت پر زیمیل نے مایوس ہو کر سر جھکا لیا وہ بالکل وہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔

”اور بھابھی بتا رہی تھیں شاید وہ پروگرام میں تہذیبی کریں کل میلاد ہے پہلے اگلے دن ڈھولکی کا پروگرام تھا اب شاید کل رات کو ہی ڈھولکی کر لیں، پروگرام بتاتے ہوئے وہ خود کنفرم نہیں تھیں۔ کیونکہ غیور بھائی اتنے بے

چوڑے فنکشن نہیں کرنا چاہتے۔“

”ٹھیک کیا ہے غیور نے، تک بھی نہیں بنتی تھی، نکاح کرنا تھا کرتے اور بس، شادی ہو تو سمجھ میں بھی آتا ہے۔ مہندی، بارات، ولیمہ، نکاح کے ساتھ تین دن کے فنکشن میری سمجھ سے باہر ہے۔“ بے زاری سے بولے۔
”کیا تحفہ دینا ہے غیاث اور اس کی منکوحہ کو۔“ عباس صاحب کے سوال پر انہوں نے گڑبڑا کر انہیں دیکھا۔

”جو آپ کو ٹھیک لگے۔“ عباس صاحب نے جھنجھلا کر انہیں دیکھا وہ جتنا نارمل بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہ اتنا محتاط جواب دے رہی تھیں۔

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا یہ تمہارا شعبہ ہے۔“ وہ اپنا آلیٹ ختم کر چکے تھے تو نشو سے ہاتھ صاف کرنے کے بعد انہوں نے چائے کا کب اٹھا کر نفیسہ کو دیکھا۔

”میں نے سوچا تھا غیاث کی بیوی کو گولڈ کا سیٹ دوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔

”لیکن پھر شادی پر کیا دوں۔“ نفیسہ نے اپنی اچھن بیان کی تو عباس صاحب نے گہرا سانس لیا۔

”میرا خیال ہے ابھی دونوں کو کیش دے دو پھر جب شادی ہو تب گولڈ وغیرہ جو بھی دینا ہو دے دینا۔“

”جی۔“ وہ سر ہلا کر دوبارہ خاموش ہو گئیں جبکہ اس دوران وہ تینوں خاموشی سے انہیں سن رہے تھے حماد کے ہوتے کبھی اتنی خاموشی نہیں ہوتی تھی لیکن حارث کے جانے کے بعد سے، ہر کوئی خاموش تھا اور یہ خاموشی زمیل کو گلٹ کی طرح محسوس ہوتی تھی۔ غلام عباس اور حماد کے جاتے ہی زمیل نے نفیسہ کی طرف دیکھا۔

”نانی امی۔“ اس کی پکار پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”جی سچے۔“ وہ محبت سے بولیں۔

”نانی امی میں.....“ وہ رکی۔

”مجھے وہاں نہیں جانا میں کسی کو جانتی بھی نہیں۔“ وہ جانے سے پہلے ہی پریشان ہو گئی تھی۔

”مجھے پتا ہے بیٹا، تم وہاں کسی کو نہیں جانتیں لیکن وہ تمہارے تایا کا گھر ہے اور فضیلت تو پہلے ہی کہہ چکی ہے

میں تمہیں آنے نہیں دیتی تو اگر میں تمہیں وہاں بھیجنے سے انکار کرتی تو اس نے اس بات کو اور لمبا کر دینا تھا۔“ ان کی بات پر زمیل کا چہرہ اتر کر رہ گیا۔

”تم پریشان کیوں ہو رہی ہو ہالہ ہے نا تمہارے ساتھ۔“ اس کا نام لینے پر ہالہ نے احتجاجی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”اماں، میں کون سا وہاں سب کو جانتی ہوں مجھے تو خود پتا نہیں کتنے مہینے یا سال ہو گئے وہاں گئے اور چچی جان کے رشتے دیراتنے عجیب ہیں مجھے تو ایسے دیکھتے ہیں جیسے میں ایلین ہوں۔“ بات کرتے ہوئے وہ منہ کے زاویے بھی بنا رہی تھی، اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر زمیل کو ہنسی آرہی تھی اندر داخل ہوئی انوری نے ہالہ کا آخری جملہ پورا سنا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہے ہالہ، کوئی ضرورت نہیں اکیلی بچیوں کو وہاں بھیجنے کی۔ نظر لگوانی ہے کیا۔“ انہوں نے

بیار بھری نظروں سے ہالہ اور زمیل کو دیکھا۔

”چلو اب تمہاری کسر رہ گئی تھی۔“ نفیسہ نے قدرے ناراضی سے انوری کو دیکھا۔

”نہ بھیج کر فضیلت بھابھی کی باتیں سنوا نہیں دیے ہی موقع چاہے اپنی ناراضی دکھانے کا پھر کوئی الٹی

سیدمی باتیں کر کے غیور بھائی کا دل خراب کریں گی ہماری طرف سے، پہلے ہی انہوں نے سارے خاندان میں

مشہور کر رکھا ہے کہ نفیسہ اور اس کے بچے بڑے مغرور ہیں۔
 ”دنیا والوں کا کام ہے باتیں کرنا۔ سوان کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔“ انوری بوانے لا پرواہی سے ہاتھ جھلائے بات کو سرسری انداز میں لیا۔

”ہم دنیا میں رہتے ہیں انور، تو دنیا کی باتوں کی پرواہ کرنی پڑتی ہے۔ خوشی کا موقع ہے اور پہلے کون سا فضیلت یوں اصرار کرتی ہے۔ اگر عباس منع کر دیتے تو میرے پاس منع کرنے کا جواز موجود تھا کہ عباس نے اجازت نہیں دی، اب اگر میں نے دونوں کو نہ بھیجا تو عباس کو برا لگے گا اور میں گھر میں حرید کوئی بدحرکی نہیں چاہتی میں پہلے ہی پریشان ہوں۔“

آخری بات پر ان کی آواز بھرا گئی تو انہوں نے تیزی سے پلکیں جھپکتے ہوئے سامنے رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ تینوں پریشانی سے نفیسہ کا چہرہ دیکھنے لگے جو ایک دم مرجھا گیا تھا۔
 ”ٹھیک ہے تم پریشان نہ ہو میں ان دونوں کے ساتھ چلی جاؤں گی کیونکہ میرا تو دل بالکل نہیں مان رہا کہ میں اپنی بچیوں کو فضیلت کے زرخے میں اکیلا چھوڑ دوں“ ان کے انداز پر ان دونوں کی ہنسی چھوٹی جبکہ افسردہ بیٹھی نفیسہ بھی بے ساختہ مسکرائیں۔

”آپ کی مثال سے تو ایسا لگ رہا ہے بوا، جیسے میں اور زمیل ننھے ننھے ہوں اور چچی جان خونخوار شیر۔“ ہالہ نے شرارت سے بوا کا چہرہ دیکھا۔

”ارے میرے نزدیک وہ خونخوار بھیڑیے سے کم نہیں جو ہر وقت حملے کی تاک میں رہتی ہے۔“
 ”اوں ہوں انور۔“ نفیسہ نے سرزنش کرنے والے انداز میں ٹوکا۔
 ”بڑی ہے وہ، یوں بچوں کا دل خراب نہ کرو وہ صرف زبان کی تھوڑی تیز ہے ورنہ دل کی اچھی ہے۔“
 نفیسہ کے کہنے پر انور نے سر جھٹک کر ہونہہ کہا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائیں۔

”اور پلیز انوری وہاں جا کر کوئی فضول بات نہ کرنا۔“
 ”مطلب کیا ہے تمہارا میں فضول باتیں کرتی ہوں۔“ نفیسہ کے کہنے پر وہ ناراضی سے بولیں۔
 ”میرا مطلب ہے فضیلت اگر کوئی بات کرے تو جواب دینے کھڑی مت ہو جانا۔“
 ”دیکھوں گی۔“ اب کی بار بھی وہ اپنے مخصوص لا پرواہ انداز میں ہاتھ ہلا کر بولیں اور برتن اٹھا کر ڈائیننگ روم سے باہر نکل گئیں۔

”اماں، آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گی۔“ ہالہ نے پریشانی سے پوچھا۔
 ”میں سارا دن وہاں نہیں رک سکتی ہالہ، میرا بھی تم لوگوں کو وہاں اکیلے بھیجنے کا دل نہیں مان رہا تھا لیکن اب انوری ساتھ ہوگی تو مجھے فکر نہیں ہوگی میں تمہارے بابا کے ساتھ آؤں گی اور توشش کروں گی جلدی آ جاؤں تم پریشان نہ ہو۔ اور بہن کا خیال رکھنا اسے اکیلے مت چھوڑنا۔“ انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے زمیل کی طرف اشارہ کیا۔

”جی۔“ ہالہ نے مسکرا کر زمیل کی طرف دیکھا جو محبت بھری نظروں سے نفیسہ کو دیکھ رہی تھی۔
 ”حماد کو میں نے کہہ دیا تھا شام کو جلدی آئے تم لوگوں کو جو شاپنگ کرنی ہے اس کے ساتھ چلی جانا۔ زمیل کے لیے اچھا سا ڈریس لینا اس کی پسند کا۔“ انہوں نے ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تو زمیل کی آنکھیں بے ساختہ نم ہوئیں۔ ہالہ نے غور سے اپنی کھڑی ماں اور ان کے سامنے کرسی پر بیٹھی اپنی کزن کو دیکھا دونوں کی آنکھیں جھکی تھیں پروہ جانتی تھی دونوں کی آنکھیں نم ہیں۔ اس نے گہرا سانس لیا۔
 ”چلو زمیل، تیار ہو جاؤ۔ منفرد نظارے دیکھنے کے لیے چچی جان کے گھر تمہیں بہت سی عجیب و غریب

چیزیں اور لوگ دیکھنے کو ملیں گے۔“ ہالہ کے کہنے پر زیمل نے منہ بسور کر اسے دیکھا۔
”میرا جانا ضروری ہے کیا۔“

”بالکل ضروری ہے، جتنی کزن میں ہوں غیاث بھائی کی اتنی تم بھی ہو اور اس فنکشن میں تمہیں سب سے ملنے کا موقع ملے گا اور جہاں تک مجھے لگ رہا ہے میرا خیال ہے یہ پہلا موقع ہے کہ تم کوئی ٹیلی فنکشن اینڈ کر رہی ہو۔“ ہالہ کے کہنے پر اس نے سر اٹات میں ہلایا۔
”پھر تو تمہیں ایکساٹمنٹ ہوگی۔“ ہالہ کے کہنے پر اس نے سر نفی میں ہلایا۔
”نہیں بس عجیب لگ رہا ہے کیونکہ مجھے اجنبی لوگوں سے خوف آتا ہے۔“ اس کے کہنے پر ہالہ ایک ہل کے لیے خاموش ہو گئی۔

”ارے میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ میں بھی سب کو کہاں جانتی ہوں پہلے میلاد ہے میں تمہارے ساتھ ہوں گی اس کے بعد چچی جان کو اگر کوئی مدد چاہیے ہوئی تو وہ کر دیں گے شام کو ڈھونڈ لیں گے۔ ہم دونوں اچھے سے تیار ہوں گے پھر تم اپنے موبائل سے میری اور اپنی سیلفی لینا جو تصویر اچھی آئے گی اسے ہم دونوں ان لارج کروا کے اپنے کمرے میں لگائیں گے۔ پھر جو ڈھونڈ لیں گے۔ پھر جو ڈھونڈ لیں گے ہم بھی پاس بیٹھ کر تالیاں بجا دیں گے تب تک اماں، بابا اور حماد بھی آ جائیں گے اور ہو سکتا ہے پھوپھو پہلے سے وہاں موجود ہوں۔“ ہالہ اس کی سلی کے لیے بڑے پرجوش انداز میں سارا نقشہ کھینچ رہی تھی اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہی تھی کیونکہ زیمل کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

”تصویروں کا تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں بھی تمہاری بابا بوائے امی، حماد بھائی سب کی ڈھیر ساری تصویریں کھینچوں گی۔“

”اور اگر پھوپھو وہاں ہوں گی تو پھر تو سب ٹھیک ہوگا۔“ وہ جیسے شاہانہ کی وہاں موجودگی کا سوچ کر ہی مطمئن ہو گئی تھی وہ دونوں اب کپڑوں کے متعلق بات کرتی ہالہ کے کمرے کی طرف جارہی تھیں۔

☆☆☆

”آرام سے بھائی آرام سے۔“ لاؤنج کے دروازے کے قریب کھڑی شاہانہ تیزی سے آگے بڑھیں دو مزدور جوئی وی ٹرائی لیے اندر آ رہے تھے صوفے سے ٹکرانے والے تھے جب شاہانہ بے ساختہ پکار اٹھیں کیونکہ ان کے ٹکرانے کی صورت میں ٹرائی پر رکھا شیشہ ٹوٹ سکتا تھا۔

”آیان۔“ انہوں نے غصے سے آیان کو آواز دی جو صوفے پر اچھل رہا تھا۔ ”رجا کہاں ہے جاؤ اور اس کے ساتھ کھلیو۔“ ان کے کہنے پر وہ بکھری چیزوں پر حسرت بھری نظر ڈال کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں رجا اپنا ڈول ہاؤس کھولے بیٹھی تھی۔ اسے ڈول میں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ تو مزدوروں کے ساتھ مل کر چیزوں کی تباہی پھیرنے میں دلچسپی رکھتا تھا شاہانہ کو اس کے تیور صاف نظر آ رہے تھے۔ مزدوروں کو صوفے کھینٹا دیکھ کر شاہانہ نے بے ساختہ دانت کچکچائے۔ اس سے پہلے وہ پھر غصے سے چلاتیں جنید اندر داخل ہوئے۔

”خدا کے لیے جنید، انہیں سمجھائیں تمیز سے کام کریں احتیاط کریں کیسے کھینٹ رہے ہیں وہ دیکھیں نیبل کھینٹنے سے ٹائل پر نشان پڑ گئے ہیں یہ اب جانے بھی نہیں۔“ انہوں نے سفید چمچائی ٹائل جس پر کالی لکیریں پڑ گئی تھیں دکھ سے دیکھا۔

”یار کیوں پریشان ہو رہی ہو اب اتنا دینی سامان ہے اٹھانے رکھنے میں کچھ نشان تو لگ جاتے ہیں۔“ ان کے مطمئن انداز پر شاہانہ نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔

”اگر کام احتیاط سے کریں گے تو نشان بھی نہیں پڑیں گے ٹویٹر اوپر لے کر گئے اور ساری دیوار پر نشان

ڈال دیئے، کونوں سے سینٹ بھی اکڑ گیا ہے کہا بھی تھا آپ سے، صبر کر لیں میں حماد کو بلا لیتی ہوں۔ وہ میری مرضی کے مطابق کام کروائے گا۔ لیکن آپ بھی نا۔“

”کمال کرتی ہوشاہانہ، فارغ تھوڑی ہے وہ آفس جاتا ہے اب اپنا کام چھوڑ کر وہ یہاں مزدوروں کے ساتھ منہ ماری کرتا، پہلے ہی ہم انہیں تکلیف دے چکے ہیں بار بار چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے کہنا اچھا نہیں لگتا۔“ ان کی سنجیدگی پر شاہانہ کچھ بول ہی نہیں سکیں۔

”مجھے پتا ہے بچے تم سے پیار کرتے ہیں تم بلاؤ گی وہ انکار نہیں کریں گے لیکن ان کی اپنی پرسنل لائف ہے اور بچوں کو تھوڑی اسپیس دینی چاہیے۔“

”یہ یورپ نہیں جنید، جہاں بچوں سے پیار جتانے پر ان کی پرائیویسی متاثر ہو جاتی ہے۔ میں کسی پر بوجھ نہیں ڈال رہی اور میں کیا کرتی ہوں مجھے پتا ہے۔“ وہ منہ پھلا کر ناراضی سے بولی۔

”ناراض ہو گئی ہو۔“ انہوں نے مڑ کر ان کا پھولا ہوا چہرہ دیکھا تو ان کی شرارت محسوس کر کے وہ مسکرا دیں۔

”میں کوشش بھی کر لوں آپ ناراض ہونے ہی نہیں دیتے۔“ ان کو مسکراتا دیکھ کر جنید بھی مسکرا دیئے۔

”اچھی بات ہمیشہ غلط موقع پر کرتی ہو جب میں تمہیں داد بھی نہیں دے سکتا۔“ جنید نے مزدوروں کی طرف دیکھ کر کہا تو ان کا مطلب سمجھ کر شاہانہ کھل کر ہنسی تھیں۔

”ابھی کے لیے اتنا کافی ہے جنید، میں تھک گئی ہوں ان مزدوروں اور کام والی کو فارغ کریں اور پلیز تھوڑی دیر بچوں کو باہر لے جائیں، میں تھوڑا کچن کا کام دیکھ لوں پھر گھر چلتے ہیں کیونکہ کل غیور بھائی کے گھر فنکشن ہے تو وہاں جانا ہے اور اس کے لیے فریش نظر آنا بھی ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے تم تھوڑا آرام کر لو میں آتے ہوئے کھانا بھی لے آؤں گا۔“ ان کے کہنے پر وہ سر ہلاتی کمرے کی طرف گئی جہاں آیاں اور رجا کھیل رہے تھے۔

☆☆☆

وہ نہا کر باہر نکلیں تو ان کا موبائل بج رہا تھا، وہ خیزی سے تو لیے کوبالوں پر لیٹتی موبائل کی طرف بڑھیں لیکن موبائل پر نظر آتے نمبر کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئیں لیکن اگلے ہی پل انہوں نے ہونٹ جھنجھک کر فون آن کر کے کان سے لگایا۔

”السلام علیکم پھوپھو۔“ دوسری طرف سے آتی بھاری مردانہ آواز پر انہوں نے گہرا سانس لیا۔

”وعلیکم السلام۔“

”کیسی ہیں آپ۔“

”میں تو ٹھیک ہوں، تم ٹھیک ہونا کہ مجھے فون کر رہے ہو یا غلطی سے میرا نمبر مل گیا۔“ ان کے طنزیہ انداز پر دوسری طرف سننے حارث نے پچھلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔

”پھوپھو، کیا آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں۔“

”میں بھی سے کیا مطلب ہے حارث، تم نے جو حرکت کی ہے اس کے بعد تم امید رکھتے ہو کہ میں تم سے

ناراض نہیں ہوں گی۔“

”مجھے لگام از کم آپ مجھے سمجھیں گی۔“ اچانک اس کے لہجے میں باپوسی اور تسکین اتر آئی، شاہانہ کو صاف

محسوس ہوئی۔

”ابھی کہاں ہو۔“

”ایئر پورٹ سے نکل رہا ہوں۔ وہاں سے ہوٹل جاؤں گا۔“

”ہوٹل کیوں۔“ شاہانہ کے ماتھے پر ہل پڑے۔

”تو اور کہاں جاؤں پھوپھو، گھر تو جائیں سکتا۔“ شاہانہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

”میری طرف آ جاؤ۔“ ان کی بات پر وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا۔

”پھوپھو، وہاں جنید انکل کی میٹلی بھی ہے۔“

”میں اپنے گھر کی بات کر رہی ہوں۔ شغفنگ کر رہی ہوں اکیلی ہوں یہاں۔“

”پھوپھو، بابا کو پتا چلا آپ مجھ سے ملی ہیں تو وہ آپ سے بھی ناراض ہو جائیں گے۔“

”کون بتائے گا انہیں، اس بات کی فکر چھوڑو تم آ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے میں بیک ہوٹل میں رکھ کر آپ کی طرف آتا ہوں۔“

”حارث، تمہیں ایک بار کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ تم ہوٹل نہیں جا رہے ایک مہینہ ہوٹل میں گزار کر تمہارا

دل نہیں بھرا جو پھر ہوٹل جانا چاہتے ہو یا پھر تم نے سوچ لیا ہے کہ اب آنے والی زندگی میٹلی کے بغیر گزارنی

ہے۔“ ان کے غصیلے لہجے میں کی ہوئی بات جیسے تیر کی طرح اس کے دل پر لگی تھی۔

”اللہ نہ کرے پھوپھو۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”جلدی آؤ میں انتظار کر رہی ہوں۔“ فون بند کر کے انہوں نے جلدی سے گیلے بالوں کو سمیٹا اور کچن کی

طرف بڑھ گئیں جہاں کھانے کا کچھ سامان موجود تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ڈور بیل بجی تو وہ تیزی سے باہر کی طرف

بڑھیں، ان کے باہر نکلنے تک چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا جہاں حارث ایک کندھے پر لیپ ٹاپ کا بیگ دوسرے

ہاتھ میں ٹریولنگ ٹریلی کا ہینڈل پکڑے اندر آ رہا تھا ان پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں بیک زمین پر رکھ کر تیزی سے

ان کے گلے لگا اور کتنی دیر تک اور ساتھ لگا رہا وہ جانتی تھیں وہ رو رہا ہے لیکن اپنے آنسو انہیں دکھانا نہیں چاہتا اس

لیے ان سے الگ نہیں ہو رہا۔ انہوں نے پیار سے اس کی پشت کو سہلایا تو حارث نے دائیں ہاتھ سے اپنی دونوں

آنکھوں کو صاف کیا اور مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر چہرہ ان کی سامنے کیا۔ شاہانہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا انہیں وہ

پہلے کی نسبت کمزور لگا تھا، ان کو اپنی طرف بغور دیکھتا پا کر اس نے بے ساختہ نظریں چرا لیں۔

”اب اندر چلو یا ساری رات یہیں گزارنی ہے۔“ ان کے کہنے پر وہ سر ہلاتا ہوا پیچھے مڑا اور اپنے دونوں

بیک اٹھا کر ان کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ انہیں حارث پر بہت غصہ تھا لیکن اس وقت اسے اپنے سامنے دیکھ کر

ان کا سارا غصہ جیسے دھواں بن کر اڑ گیا تھا، وہ اب بڑے پیار سے اسے دیکھ رہی تھیں جو بڑی رغبت سے دال

چاول کھا رہا تھا۔

”پلین میں کھانا نہیں کھایا۔“ ان کے شرارتی انداز پر اس کا ہاتھ ایک پل کے لیے رکا اور پھر مسکرا کر دوبارہ

پلیٹ میں اور دال ڈالنے لگا۔

”میں پلین میں بہت کم کھاتا ہوں اور اتنے دنوں سے ہوٹل کا کھانا کھا رہا ہوں میں بتا نہیں سکتا یہ دال

چاول مجھے من و سلوی سے کم نہیں لگ رہے۔“

”یہ کہاں بھی لو۔“ انہوں نے ایک کہاں اس کی پلیٹ میں رکھا۔

”فریج میں چکن اور مٹن کا سالن بھی تھا لیکن وہ دونوں بازار کے کھانے ہیں یہ دال چاول میں نے ابھی

بنائے ہیں تمہارے لیے، میں تو بریانی یا پلاؤ بناتی پر ابھی شغفنگ مکمل نہیں ہوئی صرف فریج پر آیا ہے یا چکن کے کچھ

برتن، مجھے بس کینٹ میں یہ دال ہی ملی تھی۔“

”نہیں پھوپھو، یہ بہت اچھا ہے مجھے بہت مزہ آیا۔“ وہ پلیٹ صاف کرتے ہوئے بولا۔

”تم بیٹھو میں چائے بناتی ہوں چائے پیتے ہوئے دونوں ہاتھیں بھی کرتے ہیں۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ کچن میں چلتا ہوں۔“

”ہاں چلو۔“ ان کے اٹھنے سے پہلے وہ اپنے برتن اٹھا کر کچن میں آ گیا۔

”آپ اکیلی ہیں جنید انکل اور بچے کہاں ہیں۔“

”وہ بھی یہیں تھے زبردستی انہیں باہر بھیجا ہے ورنہ شاید ان کی حرکتیں دیکھ کر میرا دماغ پھٹ جاتا۔“ ان کے اکتائے ہوئے لہجے پر وہ مسکرا کر انہیں دیکھتا رہا جو چوہے کے آگے کھڑی تھیں۔

”آپ اکیلی سب کر رہی ہیں گھر سے ہالہ اور حماد کو بلا لیتیں۔“

”پہلے انہوں نے ہی مدد کی ہے سینیٹنگ میں، اب بھی ارادہ تھا لیکن کل غیور بھائی کے گھر فنکشن شروع ہو رہے ہیں تو سب وہاں انوائٹڈ ہیں تو اسی وجہ سے کسی کو زحمت نہیں دی۔“

”کیسا فنکشن۔“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”غیرانہ کا نکاح ہے۔“ کہنے کے ساتھ انہوں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا جو خاموش ہو گیا تھا۔ انہوں نے جائے ٹنگ میں ڈالی اور دونوں ٹنگ لے کر کچن میں موجود چھوٹے ڈانگ ٹیبل کی طرف آ گئیں ایک کرسی حارث ٹھیکٹ کر بیٹھ گیا تھا اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے ٹنگ اس کے آگے رکھ کر بغور اس کا چہرہ دیکھا جو سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

”حارث۔“ ان کے پکارنے پر اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”چائے۔“ انہوں نے آنکھوں سے ٹنگ کی طرف اشارہ کیا تو اس نے سر ہلا کر ٹنگ اٹھا لیا، کتنی دیر وہ اس پر نظریں جمائے منتظر رہیں کہ وہ بات کرنے میں پہل کرے لیکن جب وہ یونہی خاموش بیٹھا رہا تو انہوں نے خود بات کا آغاز کیا۔

”دیے مجھے تم سے اس بچکانہ حرکت کی امید نہیں تھی کیا گھر چھوڑ دینے سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔“

حارث نے سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا جیسے اسے پہلے سے ہی اندازہ تھا کہ وہ کیا کہنے والی ہیں۔

”میں نے گھر چھوڑا نہیں پھوپھو، مجھے نکالا گیا ہے۔“

”انہوں نے کہا چلے جاؤ اور تم چلے گئے۔“ شاہانہ نے ابرو اچکائے۔

”اس وقت یہی مناسب تھا اگر میں مزید کچھ کہتا یا جانے سے انکار کرتا تو باہا اس سے سخت ری ایکشن دیتے وہ جتنے ناراض اور غصے میں تھے مجھے وہاں سے چلے جانا ہی ٹھیک لگا۔“

”ایسی نوبت کیوں آئی حارث، کہ انہوں نے تمہیں گھر سے چلے جانے کو کہا۔“

”آپ کو پتا ہی ہوگا پھوپھو۔“ اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

”میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔“

”میں کیا بتاؤں مجھے تو ابھی تک خود اپنا جرم سمجھ نہیں آیا جس کی پاداش میں مجھے گھر بدر کر دیا گیا ہے۔“

”رہی۔“ شاہانہ نے استہزاء سے انداز میں اسے دیکھا۔

”تمہیں واقعی نہیں اندازہ حارث، تم نے کیا کیا ہے۔“ شاہانہ کے لہجے میں غصہ تھا۔

”بچپن کی منگنی تھی تمہاری جسے تم نے فضولی سی توجیہات دے کر توڑ دیا۔ تمہیں ذرا بھیا کی عزت کا خیال نہیں آیا جب سب کو یہ بات پتا چلے گی لوگ کتنی باتیں بتائیں گے۔ سب لوگ جانتے ہیں عباس بھیا اپنے اصولوں کے تحت کتنے سچے ہیں جب یہ بات لوگوں کو پتا چلے گی کتنی باتیں بنیں گی کہ غلام عباس بیٹے کے لیے اپنی زبان سے مکر گیا، یتیم بھیجی سے منگنی توڑ دی۔“ ان کی آواز اب غصے کے باعث اونچی ہو گئی تھی۔

”پھوپھو، میں ایک بار نہیں مٹی بار کہہ چکا تھا اماں کو بھی بتایا تھا اور آپ کو بھی کہ میں ذیل کو فوج وائف

کے طور پر نہیں دیکھتا اپنی لائف پارٹنر کے لیے میری جو سوچ ہے ذیل اس سے الگ ہے، میں نے کئی بار اماں کے منہ سے سنا تھا کہ ایاز چاچو کی بیٹی سے میری بات ملے ہے جسے ہم بھی نہیں ملے تھے سالوں سے رابطہ نہیں تھا مجھے نہیں لگتا تھا کہ بچپن میں کی بات کو بابا یوں میرے لیے زندگی موت کا مسئلہ بنا دیں گے، شادی ایک بار ہوئی ہے اور جس نے ساری زندگی گزارنی ہے کیا اسے حق نہیں کہ اپنی پسند بتا سکے۔ اگر مجھے کوئل پسند ہے تو اس میں برائی کیا ہے۔“

”کوئی ایک ہو تو بتائیں بھی۔“ شاہانہ طنزیہ انداز میں بولیں تو حارث نے افسوس سے سر ہلایا۔
 ”آپ بھی بابا والی بات کر رہی ہیں یقیناً آپ کو بھی وہ اس لیے پسند نہیں وہ لوگ غریب ہیں اور اس لیے کہ میں نے ذیل کے بجائے اسے چوز کیا۔“
 ”ہاں بالکل ایسا ہے کیونکہ وہ لڑکی کسی بھی اینگل سے ذیل کے مقابلے کی نہیں یہاں بات غریبی امیری کی نہیں، شرافت اور مخلص ہونے کی ہو رہی ہے۔“

”پھوپھو، میں کیسے آپ کو یقین دلاؤں وہ شریف لوگ ہیں۔ بابا کو بھی لگتا ہے وہ مجھے پھنسا رہے ہیں وہ خالہ کے لیے بھی برے الفاظ استعمال کر رہے تھے وہ خالہ ہیں میری اماں کی بہن۔“ شاہانہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بغور حارث کا چہرہ دیکھا جو جھنجھلایا ہوا نہیں دیکھ رہا تھا۔

”بات ایسی ہے حارث، بعض دفعہ کسی مصلحت کے تحت یا کسی کی عزت کی خاطر کچھ باتیں چھپائی جاتی ہیں تمہاری ماں اور باپ نے بھی کسی کا بھرم رکھنے کی غلطی کی ہے، جس کی سزا انہیں تمہاری صورت میں مل رہی ہے تمہاری خالہ کا ماضی غلطیوں سے بھرا ہوا ہے اگر بھیا اور بھابھی نے کہیں کچھ نہیں بتایا تو مجھے نہیں لگتا کہ میرا کچھ کہنا صحیح ہوگا۔“ حارث نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

”پھوپھو، آپ کو کوئی غلطی ہوئی ہے۔“ اس کی بات پر شاہانہ صرف مسکرائی تھیں۔
 ”اچھا چلیں ماں لیا ماضی میں ان سے کچھ غلطیاں ہوئی ہوں گی پر اب تو وہ بہت سادہ اور نیک نمازی عورت ہیں اور کوئل وہ بھی بہت مختلف ہے۔ میچور، سین سٹو، بڑوں کی عزت کرنے والی آپ ایک دفعہ اس سے ملیں آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا۔“

”مجھے ضرورت نہیں حارث، میں ایک دفعہ ملی ہوں اس سے مجھے تو وہ کوئی ایسی توپ چیز نہیں لگی جس کے لیے تم ذیل جیسی لڑکی کو چھوڑ دو۔“
 ”پھوپھو۔“ حارث زنج ہو کر بولا۔

”آپ سب کو میری اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ ذیل مجھے پسند نہیں وہ ہوگی کوئل سے زیادہ خوب صورت اچھی اور بھی ساری خوبیاں ہوگئی لیکن میرا دل نہیں مانتا مجھے نہیں لگتا کہ وہ میرے ساتھ چل سکتی ہے جب دیکھا نہیں تھا تب بھی وہ میرے نزدیک چھوٹی سی اور ملنے کے بعد تو ثابت ہو گیا وہ واقعی امیچور ہے۔“
 ”حارث۔“ شاہانہ نے اسے ایک دم ٹوکا۔

”ساری باتیں سننے کے بعد مجھے افسوس ہے ان لوگوں پر جو کہتے ہیں حارث، بہت عقل مند اور سمجھ دار ہے، تمہاری سمجھ شاید کاروبار میں بہت اچھی ہو لیکن افسوس صد افسوس تمہیں انسانوں کی بالکل پہچان نہیں، اگر ذیل امیچور ہوئی یا تم اس کے ساتھ خوش نہ رہ سکتے تو کوئی تمہیں مجبور نہ کرتا، یہ رشتہ کرنے پر لیکن تمہارے ماں باپ نے تمہارے لیے بہترین لڑکی کا انتخاب کیا تھا لیکن تمہارے جیسے نادان لوگ ہوتے ہیں جو جلتے ہوئے کوئلے کو ہیرا سمجھ لیتے ہیں۔“

”پھوپھو۔“ شاہانہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بات کرنے سے روک دیا۔

”ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ ذیل اتنی فالتو نہیں کہ اسے زبردستی تمہاری زندگی میں شامل کیا جائے۔ مزید اب کوئی تم سے ذیل کی بات نہیں کرے گا۔“ ان کی بات پر جھنجھلائے ہوئے حارث نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”بھائی نے مغلّی ختم کر دی ہے۔“ شاہانہ بغور حارث کا چہرہ دیکھ رہی تھیں جس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

”چلو تمہاری جان چھوٹی۔“ شاہانہ نے مسکرا کر اسے دیکھا جو بے حد سنجیدہ تھا۔

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کوئل کے لیے مان جائیں گے وہ تو ناممکن سمجھو۔“ وہ اب بھی خاموش تھا شاہانہ کے لیے اس کی خاموشی عجیب تھی اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا اسے مسلسل خاموش دیکھ کر شاہانہ نے دوبارہ بات کا آغاز کیا۔

”بعض بچے ایسے ہوتے ہیں جن پر ماں باپ کو اندھا اعتماد ہوتا ہے اور وہ بچے کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہر وقت ماں باپ کی دعاؤں کے حصار میں رہتے ہیں تم بھی ان میں سے ایک تھے۔“ تھے پر جیسے حارث کی دھڑکن سست ہوئی تھی ”کیا وہ لڑکی تمہارے لیے اتنی اہم تھی کہ تم نے گھر چھوڑ دیا۔ اپنی ماں کی پرواہ نہیں کی تمہیں اندازہ ہے بھابھی کتنی بیمار ہیں۔“

”اماں کو کیا ہوا۔“ وہ تڑپ کر بولا۔

”اس ماں کو کیا ہوگا جس کا جوان بیٹا ان کے فیصلے کے خلاف جا کر گھر سے چلا جائے اور رابطہ بھی نہ کرے۔“

”پھوپھو، آپ کو کیا لگتا ہے میں بہت سکون میں تھا میں نے یہ چار ہفتے صحیح معنوں میں کانٹوں پر گزارے ہیں نہ مجھے نیند آتی تھی اور نہ بھوک لگتی تھی، میں بھی اماں، بابا کا دل دکھانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا لیکن بابا ہمیشہ مجھ سے کسی نہ کسی بات پر ناراض ہو جاتے ہیں اور اگر میں نے رابطہ نہیں کیا تو کسی نے بھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر سچ فون میں اس امید پر دیکھتا تھا گھر سے ہوگا لیکن سب مجھ سے ناراض ہو کر بیٹھ گئے۔“

”کسی نے منہ نہیں موڑا اور نہ کوئی تمہیں بھولا ہے بس مجبور ہیں تم جانتے ہو بھابھی کو انہوں نے سب کو منع کیا ہے تم سے بات کرنے کو، تو تم بھی جانتے ہو جب وہ کسی بات سے منع کرتے ہیں تو کوئی اس بات کے خلاف نہیں جاتا۔“

”کیا پھر بابا مجھے معاف نہیں کریں گے۔“ وہ بڑی آس سے شاہانہ کو دیکھ رہا تھا، شاہانہ کو اس کا چہرہ دیکھ کر ترس آیا تھا۔

”حارث، بات وہی ہے کہ غلطی تمہاری ہے لیکن تم ماننے کو تیار نہیں، جھگڑا سارا ذیل کا تھا وہ تو ختم ہوا۔ معافی مانگ لو شاید معاف کر دیں۔ پر جہاں تک میں بھابھی کو جانتی ہوں ان کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور وہ اتنی جلدی تمہیں معاف کرنے والے نہیں۔“

”جانتا ہوں۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

گلرو صند

مکتوب سی سی خوشی

”وہ بھی کیا عیدیں ہوتی تھیں جب چاند دیکھنے کے لیے سب چھتوں پہ چڑھ جاتے تھے اور چاند کے نظر آتے ہی ایک بڑی سی کڑاہی چولہے پر چڑھادی جاتی تھی حلوہ بنانے کے لیے اور اب تمہاری ماں اس کے تو کیا ہی کہنے کبھی، پتلی پانی سی کھیر کس بنا دے گی اور بھی سویوں کا حلوہ بنا کے رکھ دے گی بھی جو یہ عورت مجھ بوڑھی کے اداس دل کا خیال کرتے کسی عید پر دیکھی تھی کا حلوہ ہی بنا دے۔“ دادو نے ایک اداس کر دینے والی آہ بھر کے یونہی نظر گھما کی تو جیسے سنا رہی تھیں، اُسے فون میں غرق دیکھ کے ایک زوردار دھموکا اُس کی کمر پر جڑ دیا۔

”میرے اللہ! دادو آپ نے تو میری کمری



توڑ دی۔" ماہا نے کمر ملتے ہوئے دہائی دی۔

"کمر تو تمھاری ٹوٹتی ہی تھی، نہ میں اپنے دور کی اتنی قیمتی باتیں تمھیں سنارہی ہوں اور تم ہو کہ اس ناس پیٹے فون میں سر دیے بیٹھی ہو۔"

"قسم لے لیں دادو! میں آپ کی ساری باتیں سن رہی تھی یہ تو میری دوست نمرہ کا ضروری میسج تھا جو دیکھنے کے لیے فون اٹھایا اور آپ نے اپنے ہتھیار کھول دیے۔" ماہا نے اُن کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"اور آپ فکر نہ کریں اس دفعہ آپ ایسی عید منائیں گی کہ آپ کو اپنے دور کی عیدیں بھول جائیں گی اور میں آپ کو بڑی سی کڑا ہی میں بنا آپ کا من پسند حلوہ بھی کھلاؤں گی۔"

"چل چھوٹی کہیں کی، تیری کنجوس ماں بنا ہی نہ دے مجھے دیسی گھی کا حلوہ" دادو نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا "اچھا چل چھوڑ حلوے کو۔"

"ماں تیری سوئی ہوئی ہے اُس کے اٹھنے سے پہلے ہی میرے اور اپنے لیے بہت سارا دودھ ڈال کے چائے بنالا۔"

"کیا مطلب دادو! اپنے لیے اور آپ کے لیے روزہ ہے میرا۔ البتہ آپ کے لیے ابھی بنالاتی ہوں لیکن آپ کی یادداشت اب کمزور ہو رہی ہے۔" ماہا نے افسوس سے کہا۔

"کیا کروں دل تو کرتا ہے کہ سارے روزے رکھوں پر یہ جو معدہ خالی ہونے کی وجہ سے الٹی آجاتی ہے اس کی وجہ سے ایک روزہ بھی نہیں رکھ پاتی۔" دادو نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا آپ اب اداس تو نہ ہوں نا، پیار کو ویسے بھی چھوٹ ہے۔ آپ لیٹ جائیں تھوڑی دیر میں تب تک آپ کے لیے چائے بنالاتی ہوں۔" ماہا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

دادو جن کا نام زریں بیگم تھا اپنے بیٹے بہو اور دو عدد پوتیوں ماہا اور زویا کے ساتھ ضلع ایک کے ایک

قصبہ نما گاؤں میں آباد تھیں۔ زریں بیگم کے گھرانے کی زندگی ویسے تو بہت پرسکون تھی لیکن زریں بیگم اپنی بہو کی کنجوسی کی وجہ سے سخت نالاں رہتی تھیں کیونکہ انہیں اچھا کھانے پینے کا بہت شوق تھا لیکن ان کی بہو جس کا نام رخسانہ تھا انتہائی کنجوس تھی۔ کھانا بنانے کے معاملے میں بھی انتہائی کنجوسی سے کام لیتی۔ کوشش کرتی کہ کھانا بھی ایک دن بنائے اور دو دن چلے جس کی وجہ سے زریں بیگم اور رخسانہ میں شدید قسم کی بحث ہوتی جو بغیر کسی نتیجے کے اختتام پذیر ہو جاتی۔

"ماہا! کیا سوچ رہی ہو؟" زویا نے کب سے سوچ میں گھری ماہا سے پوچھا

"یار زویا! میں بہت پریشان ہوں۔ عید میں صرف چند دن رہ گئے ہیں اور میں نے دادو سے وعدہ کیا ہے کہ اس عید بر میں انہیں اُن کا پسندیدہ دیسی گھی میں بنا حلوہ کھلاؤں گی اور امی کا کہیں پتا ہے نا، دیسی گھی کا سن کے ہی انہوں نے بے ہوش ہو جانا ہے۔" "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ تمہاری اور میری پاکٹ منی ملا کے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" زویا نے کہا۔

"پر امی بنا کے دیں گی تب نا حد ہے۔ ویسے اتنی چھوٹی سی بات کے لیے ہم ایسے پریشان ہیں جیسے کہ کے ٹوسر کرنا ہے اور یہ صرف ہماری امی کی وجہ سے ہے، اتنی مجھے شرمندگی ہوتی ہے ناں جب لوگ ہمارے منہ پہ ہماری ماں کے کنجوسی کے قصے بیان کرتے ہیں اور یہ بھی تو دیکھو ہماری امی کو اس بات کا ذرا احساس نہیں ہے کہ وہ ماہا کی ماں ہیں۔ ہماری بڑی ہیں، وہ ہمیشہ جب بھی کوئی خواہش کرتی ہیں کہ آج یہ پکایا جائے۔ امی اُن کی بات رد کر دیتی ہیں اور ماہا بھی کچھ نہیں کہتے۔ وہ یہ بھول چکے ہیں یہ وہ ہی ماں ہے جو اُن کی ہر خواہش پوری کرتی تھی۔ اب ہمارا فرض بنتا ہے کہ جس طرح ہمارے بڑے ہماری چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو پورا کرنے میں ہلکان ہوتے تھے، ہم بھی اسی طرح اُن کی خواہشات کو پورا

کریں۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے کہ یہ ہمارے والدین ہیں، ماں باپ کو تو بچوں کا آئیڈیل ہونا چاہیے نہ کہ ایسے ہوں کہ اولاد کو شرمندگی ہو۔“ ماہا رو ہانسی ہو کے بولی۔

”اچھا تم پریشان نہ ہو، زویا نے ماہا کو تسلی دی وہ اپنی حساس بہن کو اچھے سے جانتی تھی جو باتیں دوسروں کے لیے معمولی تھیں وہ ماہا کے لیے ہرگز بھی معمولی نہ تھیں۔“

☆ ☆ ☆

آج اٹیسواں روزہ تھا امید تھی کہ آج عید کا چاند نظر آجائے گا اور ماہا بے چاری کا پریشانی سے برا حال تھا وہ حلوے کے لیے دیسی مٹی لے آئی تھی اور اپنی الماری میں چھپا دیا تھا پر مسئلہ یہ تھا کہ پکائے گا کون، رخسانہ نے تو اتنے خرچ کا سنتے ہی واہ پلا مچا دینا تھا۔ پورا دن اللہ پاک سے دعائیں کرتی رہی۔ دادو کی یہ چھوٹی سی خوشی پوری ہو جائے۔

اظہار اور مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر ماہا اور زویا دادو کو لے کے چھت پر چلی گئیں کہ آج دادو کے ساتھ مل کر عید کا چاند تلاش کریں گی۔ کچھ دیر بعد ہی گلیوں میں شور کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ زویا اور ماہا کو بھی عید کا چاند نظر آ گیا تھا۔ وہ دادو کے ساتھ مل کے چھت سے ارد گرد کی رونقیں دیکھتی رہیں، کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دادو کو دیسی مٹی میں سو جی بھوننے کی خوشبو محسوس ہوئی۔

”ارے یہ حلوہ کون بنا رہا ہے بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے“ دادو نے کہا۔

دادو کی بات سنتے ہی ماہا کو فکر نے آ گھیرا کہ ابھی اسے بھی ماں کی منتیں کر کے اور بے عزتی کروا کے حلوہ پکوانا تھا لیکن جیسے ہی وہ لوگ نیچے آئے تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ سامنے ہی کچن میں رخسانہ بڑی سی کڑاھی چڑھائے حلوہ بنانے میں مصروف تھیں اور جو خوشبو میں اٹھ رہی تھیں، وہ ان کے اپنے ہی کچن سے اٹھ رہی تھیں، تینوں کو ہی اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ارے رخسانہ خیر تو ہے نا طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری کہیں بخار تو نہیں چڑھ گیا دارغ کہ۔“ دادو نے رخسانہ کا ماتھا چھوتے ہوئے کہا۔

رخسانہ جھینپ کے ہنس دیں ”اچھا ناں اماں اب شرمندہ نہ کریں میں نے سوچا آپ ہر عید یہ کہتی ہیں اس دفعہ آپ کی یہ چھوٹی سی خوشی پوری کر رہی دوں اور ویسے بھی ماں باپ کو ایسا ہونا چاہیے کہ ان کے بچے فخر محسوس کریں نہ کہ شرمندگی۔“ وہ ماہا کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

دادو تو ایک دم ہی خوش ہو گئی تھیں اور ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے وضو کرنے چل دیں۔

”امی میری بات کا یہ بالکل مطلب نہیں تھا۔“ دادو کے جاتے ہی ماہا شرمندہ ہوتے ہوئے بولی اسے سمجھ میں آ گئی تھی کہ رخسانہ نے اس کی باتیں سن لی تھیں۔

”ارے تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو، مجھے تو فخر ہے کہ میری بیٹی اتنی سمجھ دار اور اچھی ہے تم نے تو میری آنکھیں کھول دیں ماہا! اس دن اگر میں تم لوگوں کی باتیں نہ سنی تو مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس نہ ہوتا۔“ رخسانہ ماہا کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔

”اور ابھی تم دونوں بھی میرا ہاتھ بٹاؤ، کل عید کے میوے میں میں نے بہت کچھ بنانا ہے۔ ابھی تیاری کریں گے تو ہی کل کا زبردست ساچ تیار ہو سکے گا نا، یہ سنتے ہی ماہا اور زویا خوشگوار حیرت میں گھر گئی تھیں۔

”اور ہاں یاد آیا ماہا! وہ جو تمہاری الماری میں دیسی مٹی کا ڈبہ پڑا ہے ناں دو جدھر سے لائی تھیں واپس کر آنا۔ وہ خالص دیسی مٹی نہیں ہے۔“ رخسانہ نے ہنستے ہوئے ماہا سے کہا

ماہا ایک دم سے شرمندہ ہوتے ہوئے ہنس دی تھی۔ وہ خوش تھی کیونکہ یہ عید اس کے گھر میں ایک بہت بڑی اور خوش گوار تہہ پائی لے کر آئی تھی۔ یہ عید تو واقعی ان سب کو یاد رہ جانے والی تھی۔

☆ ☆

قرآن مجید

اس نے پلاؤ کی بیٹی تیار کر لی تھی اور اب بڑے اہتمام سے ٹرے سجا کر بیٹے کی منتظر تھی۔ ڈور بتل پر لگی تو رملہ کا خوشی سے تھمتا چہرہ دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ”باجی! بڑے اچھے لوگ ہیں۔ اتنے بڑے گھر میں ایک اکیلی اماں جی تھیں مجھے اتنی محبت سے اپنے پاس بٹھایا اور اتنی دیر تک میرے بارے میں پوچھتی رہیں۔“ رملہ کی آنکھوں میں حیا کے رنگ تھے۔

”سیج۔ مطلب ہماری محنت رنگ لائی ہے میں تو پہلے ہی امی سے کہہ رہی تھی کہ دیکھنا میری رملہ کے لیے کیسے آسمان سے شہزادہ اترتا ہے اور دیکھ ہوا ناں ایسا۔“

”باجی اس کا کیا مطلب ہوا ویسے۔“ وہ جانتے ہوئے بھی انجان بننے کی فضول اداکاری کر رہی تھی پر اس وقت رفعت کو اپنی بہن پر پیارا آ رہا تھا بس جھٹ اس کی بلائیں لیں اور بولی۔

”تو تو بدھو ہے رملہ، جب کسی جوان لڑکے کی ماں کسی لڑکی سے اس کی پوچھ گچھ کرے تو جان لے کہ اسے وہ لڑکی اپنے بیٹے کے لیے پسند آگئی ہے اور ان کو بھی تو اچھی لگی ہے۔“

رملہ نے شرم سے سر جھکا لیا۔

☆☆☆

پورے ہفتے رفعت اچھے اچھے پکوان بنا کر کبھی رملہ کے ہاتھ بھی خود بھی دے آتی۔ اس پورے دو مہینے کے گھر میں بس دو چان ہی رہتی تھیں۔ ایک کام والی کام کرنے آ جاتی تھی۔ اماں جی کی دو بیٹیاں بیرون ملک رہتی تھیں۔ ان کا اپنا گھر بحرہ ٹاؤن میں تھا پر شہر سے دور ہونے کے باعث ان کے بیٹے کو دور

”چل جلدی کر.....“ رفعت نے بڑے سلیقے سے ٹرے رملہ کی جانب بڑھائی۔

”اچھا ناں، ذرا صبر تو کرو.....“

رملہ نے اپنے سر پر اچھی طرح دوپٹہ سیٹ کیا اور آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔

”ٹھیک لگ رہی ہوں ناں۔“ اس نے رفعت سے پوچھا۔ یہ جملہ کوئی اس نے پانچویں بار دہرایا تھا۔

”ہاں ہاں بڑی سونی لگ رہی ہے۔ میری رملہ رانی۔“

رملہ نے ٹرے تھامی اور سامنے والوں کے گیٹ کی جانب چلی۔ ابھی انہیں اس محلے میں آئے ہفتہ ہی ہوا تھا۔ ان کے طور طریقے بظاہر تو بڑے رعب داب والے تھے اور سب سے بڑی بات ایک ہینڈ سم سا جوان بھی، جو ہر صبح اپنی موٹر بائیک بڑی شان سے نکالتا تھا۔ بس یہ ہی دیکھ کر رفعت کا دل اس پر آ گیا تھا۔ رملہ کے ساتھ اس کی جوڑی کیا خوب سیج گی۔

رملہ اس کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ کسی اچھے رشتے کی تلاش میں اس کی عمر تین سال ہونے والی تھی۔ اس کے تو ہاتھ پیر پھول جاتے تھے اس کا سوچ سوچ کر رفعت سب سے بڑی بہن تھی، اس کے دونوں بچے بھی اب گیارہویں بارہویں میں آچکے تھے، رملہ اس سے سات برس چھوٹی تھی۔ نئے لوگوں کی آمد نے اور خاص کر اس ہینڈ سم نو جوان نے اس کے دل میں رملہ کی شادی کا خیال جگا یا اور یوں اس نے جھٹ رملہ کو اپنے گھر کچھ دن کے لیے بلوالیا تھا۔ وہ بے چینی سے اس کی آمد کی منتظر تھی۔ صبح ہی

بڑتا تھا۔ لہذا مجبوراً اسے کرائے پر چڑھا کر اندرون شہر کرائے پر لیا تھا۔

ہے۔ ”کیسی باتیں کرتی ہو، رفعت، ابھی انہیں آئے

دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور تم شادی بیاہ کا سوچ رہی ہو۔“

نعمان نے سختی سے اعتراض اٹھایا تھا اور رفعت کا منہ بن گیا۔

ان کے بیٹے کا اپنا بزنس تھا، امپورٹ

ایکسپورٹ کا، رفعت کے لیے تو یہ ہی کافی تھا کہ اماں جی کا راجان رملہ کی طرف ہے۔ سب کچھ تو اچھا نظر

آ رہا تھا۔ اچھا گھر ہینڈسم لڑکا چھوٹی میلی پھر اور کیا چاہیے ہوتا ہے لڑکی والوں کو۔ امی بھی رفعت کی بتائی



”تو اور کیسے رشتے ہوتے ہیں جی۔“

”خاندان کا پتا ہے تمہیں، پیچھے سے کیا ہے کون

لوگ ہیں اور تم۔“

”تو اور کیسے پتا کرنا ہے بتایا تو ہے آپ کو اماں جی نے خود بتایا ہے کہ بلکہ میری خود کئی بار اسامہ سے بات ہوئی ہے بڑا افس کھ لڑکا ہے..... آپ کو تو بس سوال کرنے ہیں۔“

رفعت کا مود خراب دیکھ کر نعمان چپ ہو رہا وہ رشتے میں اس کی دور کی خالہ زاد بھی پر شادی سے پہلے اس کی ماں نے رفعت کے گھر کے کتنے چکر لگائے تھے، تب کہیں جا کر رشتہ ڈالا تھا اور یہاں تو گویا پہلی پہ سروسوں جمائے جا رہی تھی۔

”بہر حال رملہ میری بھی چھوٹی بہن ہے بوجھ نہیں ہے وہ۔“

وہ کہہ کر چلتا بنا اور رفعت دیر تک اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہی۔

☆☆☆

سب کچھ ٹھیک ہوتا جا رہا تھا اماں جی نے دبے لفظوں اسامہ کے لیے رملہ کی بات کی بھی مانو اس کا تو سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ اس نے جھٹ ای کو فون لگایا تھا۔ انہیں رملہ کی عمر پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا اسامہ رملہ کے ساتھ کا ہی تھا، یا ایک دو سال بڑا پر سب خوش تھے، نعمان بھی خود کو لعنت ملا مت کر رہا تھا وہ دل سے رملہ کے لیے اچھا چاہتا تھا اور اس کے لیے کچھ لوگوں سے بات بھی کی تھی۔

اتوار کا دن تھا سب چھٹی کے مزے لیتے اپنے گھروں میں دیر تک سو رہے تھے تب ہی شور۔ کی آوازیں ہی ابھری تھیں۔ بند دروازہ میں اس کے کان سننے کے قابل ہی کہاں تھے۔ نیند کا بھی زور تھا پھر چھٹی کے دن نعمان سب کے لیے باہر سے ناشتہ لے کر آتا تھا تو لہذا چھٹی ہی چھٹی تھی۔

”ارے کچھ سنا تم نے۔“ نعمان باورچی خانے میں ناشتے کا سامان رکھ کر اس کی جانب لپکا تھا جو باہر بیٹن پر کھڑی منہ دھو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر

ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”کہا ہوا اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔“

اس نے پانی کے چھپا کے منہ پر مارے۔

”سانے پولیس آئی تھی۔“ نعمان کے الفاظ

تھے کہ کرنٹ وہ پٹی۔

”کدھرا“ آنکھیں حیرت سے پھٹیں۔

”اسامہ کے گھر۔“

رفعت کا دل جیسے بند ہونے کو تھا۔ دیوار کا سہارا

لیا۔

”اس کے سالے پولیس لے کر آئے تھے اس

نے اور اس کی ماں نے اپنی بیوی کو۔ جلائے کی

کوششیں کی تھی ایک بچی کی ماں کو۔“

”سالے..... بیوی، بچی.....“ آسمان گول

گول سا گھوم رہا تھا۔

”مجھے تو پہلے ہی شک تھا پر تم نہ مانتی تھیں ایسے

کھڑے چڑھے رشتے ہوتے ہیں بھلا..... شکر کرو

اپنی رملہ بچ گئی خاندان سے فرار ہو کر لاہور آئے تھے

دونوں فراڈی، سال بھر سے اس کے سالے پیچھے لگے

تھے پولیس کہاں کھوج لگاتی ہے، بہنوں کے بھائی ہی

بن جاتے ہیں رکھوالے اور دیکھو مظلوم کی پکڑ میں

آگئے..... پہلے بھی ایک لڑکی کی زندگی خراب کر چکے

ہیں وہ بد بخت۔“

نعمان بولے جا رہا تھا اور رفعت کو چکر آرہے

تھے قریب تھا کہ وہ گر ہی جاتی کہ نعمان نے اسے تھام

لیا اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ ”ہائے میری رملہ۔“

”ارے رفعت“ نعمان نے اسے پکارا پر وہ

اپنے ہوش میں کب تھی بہن کے رشتے کے ٹوٹنے کا غم

کتنا بھاری ہوتا ہے، نعمان کو اندازہ تھا پر ان فراڈیوں

کی گرم گرم خبر نے اسے وہ اچھی خبر سنانے سے باز رکھا

تھا۔ صبح ہی صبح اس کے سامنے فون کا فون آیا تھا وہ

آج شام رملہ کے رشتے کے سلسلے میں آرہے ہیں

انہیں رملہ پسند آئی تھی۔

☆☆

دوستی کا سامنے تھی

فضا ساکت تھی۔ کالونی میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رونقیں اب گھروں تک محدود ہو چکی تھیں۔ اذانِ مغرب میں کچھ وقت ہی رہ گیا تھا۔ ”اظہار کے انتظار میں وہ سب دسترخوان پر براجمان ہوں گے۔“

اس نے اپنے سامنے لٹ گریں گیٹ کو دیکھتے سوچا۔ اسے ابو کے الفاظ یاد آئے تھے۔ گیٹ سامنے تھا۔ وہی گیٹ جس سے وہ بڑے غصہ و زعم سے نکلا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ دوبارہ ”یہاں“ نہیں آئے گا۔ کم از کم خود سے تو نہیں۔ جب تک ”وہ“ لوگ اسے منانے نہیں آتے۔ شاید تب۔ تب بھی اس کا زعم۔ اس کی ”انا“ اسے یوں جھکنے نہ دیتی مگر آج جب کہ وہ یہاں کھڑا تھا تو اسے احساس ہو چکا تھا کہ محبت صرف لینے کا ہی تو نام نہیں۔ ہ تو تھوڑی سی عنایت کے بدلے میں بھی سب کچھ دان دے دیتا ہے۔ بغیر طمع کے بغیر واپسی کے تقاضے کے۔

رشتے نبھانا بھی ایک فن ہے اور وہ آج تک اس فن سے نا آشنا ہی رہا۔ ”غزل“ کی باتیں سن کر اس نے اپنا موازنہ کیا تو وہ اسے کہیں بلندی پر نظر آئی۔ غلطی کہاں پر ہوئی تھی رستہ کہاں چوکا تھا؟ وہ جان گیا تھا اور جب جان گیا تو مردوں کی طرح بہادری سے اعتراف کرنے آیا تھا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ شور سے کھلی تھی۔ نکیہ سر پر رکھ کر دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر بے سود، آوازیں نہیں کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں، کچھ دیر تو وہ نظر انداز کیے پڑا رہا پھر نکیہ بچ کر اٹھ بیٹھا۔

اتوار کا دن تھا اور اس کا ارادہ دیر تک سونے کا تھا مگر اس گھر میں یہ ناممکن تھا۔ کچھ غصے سے اٹھا اور کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھول کر بالکنی سے نیچے جھانکا۔ محن میں بیٹی، فیری، بلو اور مالی شور مچاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سنان اور منان بھی کسی سے کم نہیں تھے وہ سائیکلیں دوڑائے پھر رہے تھے اور محترم خواتین، اس شور شرابے میں یوں اطمینان سے بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں جیسے شور نہ ہو بیک گراؤنڈ میوزک ہو۔ اس کا غصہ سوانیزے پر پہنچ گیا۔

”چپ۔ خاموش ہو جاؤ تم لوگ.....“ اوپر سے دھاڑا گیا۔ بچے ڈر کر رک گئے۔ سراٹھا کر دیکھا تو وہ کھڑا خشکیں نکا ہوں سے انہیں ہی گھور رہا تھا۔ ”خبردار جواب کسی کی آواز آئی تو۔ بچے ہویا جنگلی۔ ذرا تیز دہنذیب نہیں ہے تم لوگوں میں.....“ خوب اچھی طرح انہیں ڈانٹا، آپوں کو نظر انداز کرتا وہ واپس مڑ گیا۔ دروازہ زوردار آواز سے بند ہونے کی آواز پر دونوں نے سوالیہ نظروں سے گھر کی خواتین کو دیکھا۔

”اسے کیا ہوا ہے تالی امی! نہ دعا نہ سلام۔ الٹا کٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔“ تانیہ آپی کو شدید برا لگا تھا۔ ”چھوڑو تم اپنا! اس کا تو لگتا ہے دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ تالی خود اس کے رویے پر سر منڈھ گئیں۔ ”مگر پھر بھی کچھ پتا تو چلے نا۔“ حسنا آپی نے بھی ماں سے پوچھا۔ آج اتوار تھا سودو نوں کا میکے کا ٹور باہمی پلان کر کے بنا تھا۔ دونوں ہم عمر تھیں پھر دوستی بھی خوب تھی سوا کچھ رد گرام بنا کر اٹھنے آیا کرتیں۔ وہ اکثر مزاج ضرور تھا مگر اتنا بد اخلاق تو کبھی نہیں رہا۔

”بس بھی کرو تم دونوں بچہ ہے۔ آج کل کام کالوڈ بھی زیادہ ہے۔ نیند خراب ہوئی ہوگی۔ چلو بچو..... تم سب اندر جا کر کارٹون لگا لو۔ چاندی ان کے لیے فراز بناؤ۔“ رفعت تائی نے بات سنبھالی۔ بچوں کو اندر بھاگایا۔ چاندی کو ہدایت دی۔ وہ سب اچھلتے کودتے اندر بھاگ گئے۔ دونوں آپوں کے منہ لٹک گئے۔ خوب سمجھ گئی کہ ٹالا گیا ہے۔ اب نیند دوبارہ کس کافر کو آتی تھی۔ کتنی دیر کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی دیکھی تو وہ سوا گیارہ بج رہے تھے۔

”تف ہے تم پر وجدان مصطفیٰ! ایک گھنٹہ فضول کروٹیں بدلنے میں ضائع کر دیا تم نے۔“

کمرٹ دورا چھال کر وہ فریش ہونے واش روم میں گھس گیا۔ نیچے آیا تو ہال کمرے سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ نظر انداز کرنا سیدھا چکن میں چلا آیا۔ چاندی بھی سبزیاں کاٹ رہی تھی۔ چولہوں پر بڑے بڑے تیلے چڑھے ہوئے تھے۔ چکن میں پھیلی اشتہا انگیز خوشبو میں بتا رہی تھیں کہ ٹھیک ٹھاک دعوت کی تیاری ہے۔ ہانیہ اور بیابھی وہیں تھیں۔

”مجھے ناشتہ بنا دو بیا۔“ آرڈر دے کر وہ ہال کمرے میں چلا آیا۔ اسے اندر آتے دیکھ بچے بڑے ادب سے بیٹھ گئے۔ سلام کے جواب میں حسنہ آپلی نے تو خوب ہی لٹے لیے۔

”آگیا دعا سلام کا خیال.....؟ صبح تو کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے تم۔ بڑی بہنوں کے آنے کی خوشی کیا ہی ہوگی۔ اللہ جناب کے مزاج ہی نہیں مل رہے تھے۔“

”سوری آپلی۔ دراصل سر میں درد تھا میرے۔ رات بھی لیٹ سوا تھا۔ بس اسی لیے شور شرابے سے ڈسٹرب ہو گیا تھا۔“ الفاظ کے برعکس لہجے اور چہرے پر کوئی شرمندگی نہ تھی جیسے ایک فارمیسی نبھارہا ہو۔ حسنہ اور تائی امی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”ناشتہ بناؤں تمہارے لیے.....“ جہاں آرانے اسے دیکھا صاحبزادے روٹھے ہوئے سے لگ رہے تھے۔

”کہہ آیا ہوں بیا سے۔ شکریہ۔“ پھر موہا مل نکال کر وہ اس میں مصروف ہو گیا۔ اس کی اتنی سرد مہری پر سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ بیا

ناشتے کی ٹرے لے آئی۔ چائے پینے کے دوران بھی وہ موہا مل پر ہی مصروف رہا۔ بچے کب تک کب کر بیٹھتے چکے چکے وہاں سے کھسک لیے۔

”امی! بیا بتا رہی تھی کہ سونیا آنٹی کی بیٹی بھی آئی تھی۔“ ”ہاں.....“ وہ نجانے کہاں کھوئی ہوئی تھیں۔ ”کیسی ہے وہ..... لڑکیاں تو بتا رہی ہیں کہ بڑی طرح دار اور خوب صورت ہے۔“ ان کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

”خوب صورت تو بہت ہے مگر اس میں زیادہ کیا اس کے پارلر کا بھی ہوگا جہاں باقاعدگی سے جاتی ہوگی۔“ اندر آتی بھا بھی نے مسکراتے ہوئے رائے دی۔ وجدان نے کچھ کوفت واکتاہٹ سے جملہ خواتین کو دیکھا۔

”بھئی سونیا تو خود بھی سولہ برس کی سمجھتی ہے خود کو۔ کیا ماں۔ کیا بیٹی دونوں ہی ایک دوسرے کے مقابلے میں تیار ہوئی تھیں۔“

رفعت تائی کو سونیا کے انداز یاد آئے تو لہجے میں ناگواری آئی۔ وجدان نے چائے کا کپ پٹا۔ جہاں آرا بیٹے کے انداز پہچان رہی تھیں۔ انہوں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”بھئی ہمیں کیا۔ وہ جو کرتی پھرے جیسی رہے۔“

”ہمیں کیا ہے کا کیا مطلب ہے آپا آپ کا۔ اس کے انداز دیکھیے نہیں تھے آپ نے؟ اتنے برسوں بعد دوبارہ واپس آئی ہے تو بیٹی کو ہتھیاروں سے لیس کر کے لائی ہے۔ نجانے اب کس پر نظر کرم ہوگی اس کی۔“ رفعت ان کی واپسی پر خوش نہ تھی۔

”آپ کیوں فکر کرتی ہیں بھا بھی..... بھائی صاحب کی عمر گزر چکی اور رہ گیا سا گردہ تو پہلے سے بک ہے۔ البتہ وجدان کی خیر منانا چاہیے۔“ پچی نے انہیں چھیڑا۔ وجدان جواب تک بڑے ضبط سے بیٹھا تھا۔ اچانک کھڑا ہو گیا۔ وہ جس طرح ناگواری وغصے سے گیا تھا۔ جہاں آرا مزید رنجیدہ ہو گئیں۔ جانتی تھیں اسے کیوں غصہ آ رہا تھا۔

گیارہ سال کی تھی۔ وہ کلنڈری من موچی سی تھی۔
یہ ایک مالی لحاظ سے خوشحال اور مضبوط گھرانہ تھا
مگر اپنی روایات کو مضبوطی سے تھامے محبتوں اور
مروت کی ڈور میں بندھا ہوا بھی۔

☆☆☆

جب دل ہی ٹوٹ گیا۔
ہم جی کے کیا کریں گے۔
وہ اس وقت آفس میں تھا اسے چڑانے کو گانا
سائرا سے سخت زہر لگا۔
”بکواس بند کرو اپنی۔“

”اوکے..... پھر یہ کیسا رہے گا؟ اے کاتب تقدیر
مجھے اتنا یاد دے۔ کیوں مجھ سے خفا ہے تو، کیا میں نے کیا
ہے۔ کیا میں نے کیا ہے؟ کیا میں نے کیا ہے؟ کیوں
مجھ سے خفا ہے تو۔“ وہ لمبے لمبے سرکھینچے جا رہا تھا۔ وجدان
نے غصے سے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اسے گھورا۔

”جیسے میں سب کی آئی ہیں، زمین بہا رہی
”بدبختیاں“ لیکن مجھے پیچھے سے پکاریں۔“

”دل پوشٹ اپ..... یا بلاؤں پہون کو تمہیں
دھکے دے کر باہر نکالے.....“ اس کے تیور دیکھتا سائر
بے ساختہ ہنسنے لگا۔ جانتا تھا کہ وہ یہ بھی کر گزرے گا۔
”میں تو تمہارا کتھار سس کرنا چاہ رہا ہوں۔“

اس نے معصومیت سے دانت نکالے۔
”کتھار سس کے بجائے میرا بلڈ پریشر بڑھا
رہے ہو تم۔“

”اس کام کے لیے تو آپ کی! منظور نظر کافی
ہے۔“

”لینکو جی پلیز.....“ اسے برا لگا۔
”سوری..... محترمہ بھابھی نیگم صاحبہ المعروف
غزل“ وہ اب بھی سنجیدہ نہ تھا۔ اس نے فون کی جانب
ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کے تیور دیکھتا سائر فوراً
مودب ہو کر بیٹھا۔

”اوکے اوکے..... اب کوئی مذاق نہیں..... میں
سنجیدہ ہوں۔“

وجدان سر جھٹکتا پھر سے لیپ ٹاپ پر مصروف

☆☆☆

آج کل کے افراتفری اور نفسا نفسی کے دور میں
بھی یہ گھر محبتوں کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ مصطفیٰ ہمدانی
مرضی ہمدانی اور دلی تینوں بھائی اپنے خاندانوں کے
ساتھ محبت و یگانگت کے ساتھ کئی سالوں سے یہاں
آباد تھے۔ اس گھر کو مضبوطی سے جوڑے رکھنے میں
مصطفیٰ ہمدانی تانیا ابواور تائی جہاں آرا کا بہت اہم اور
مرکزی کردار تھا جہاں سب کے لیے چمتار اور سایہ
دار درخت کی مانند تھے وہاں باقی سب نے بھی ان کی
تعظیم و محرم میں کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔

جہاں آرا نے ہمیشہ سب کو اہمیت دی تھی تو
مصطفیٰ ہمدانی نے والدین کے بعد ان کا کردار بخوبی
بھاریا تھا۔ مصطفیٰ صاحب کے چار بچے تھے۔ بڑے
ریحان تھے پھر ان سے چھوٹی حسہ آبی، ریحان کی
شادی ہو چکی تھی اور موصوف خیر سے تین عدد ہونہار
سپوتوں کے والد محترم تھے ان کی بیوی سمیہ بھابھی جو
کہ ان کی خالہ زاد بھئی تھیں نہایت خوش مزاج لیکن
ست الوجود عورت تھیں۔ سات سالوں میں تین
نمونوں کے بعد، پھیل کر مزید ڈھیلی ہو گئی تھیں پھر
حسہ آبی تھیں جو کہ خیر سے اپنے گھر کی تھیں ان کے
بھی دو عدد نمونے تھے۔

مرضی چچا کی ٹائیہ ان کی ہم عمر ہی تھیں ان کی بھی
شادی خانسا ہادی ہو چکی تھی۔ تیسرے نمبر پر تھے۔ ذرا
سا اکھڑ اور کچھ بد مزاج سے وجدان مصطفیٰ جن کے
ماتھے پر بل آج کل کچھ زیادہ ہی رہنے لگے تھے۔

اس کو برداشت کرنے کا حوصلہ صرف سائر میں
تھا جو ٹائیہ سے چھوٹا تھا۔ بڑم خود ”بیٹ بڈی آف
وجدان مصطفیٰ، وجدان سے چھوٹی بھابھی۔ سائر کے
بعد ہادی اور مونا تھیں۔ دلی چچا چونکہ سب سے چھوٹے
تھے سو چچی کو اکثر یہ گلہ رہتا۔ انہیں چھوٹا سمجھ کر سب
نے چچی پر ہی ظلم کیا ہے جو اب تک بڑے ہونے کا
نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

چچی کے تین بچے تھے علی، احمد اور عائرہ..... علی
میٹرک میں تھا۔ احمد آٹھویں گریڈ اور عائرہ ابھی

بات کرو وہ خود تاپا ابو سے بات کر لیں گے۔ دیکھو ان کی کیا رائے ہے۔ اگر تمہاری رضا و خوشی اس میں ہے تو مجھے یقین ہے تاپا ابو تاپی جان کو قائل کر لیں گے۔“ سائر کا مشورہ اچھا تھا وہ سوچ میں پڑ گیا۔

یہ سارا معاملہ اس دن شروع ہوا تھا جب سونیا آنٹی ان کے شہر میں دوبارہ سے شفٹ ہوئی تھیں۔ وہ ابو کی رشتے میں کزن تھیں، پہلے وہ اسلام آباد میں ہوتی تھیں مگر شوہر کے انتقال کے بعد وہ اپنے آبائی شہر لوٹ آئیں۔ غزل ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بہت خوب صورت، طرح دار۔ وہ ان کے گھر اب تک دو مرتبہ آ چکی تھی اور وہ تو وجدان کو پہلی مرتبہ ہی ایک ہی نظر میں ہی بہت منفرد سی لگی تھی اپنے گھر کی باقی لڑکیوں سے قطعی مختلف، نسبتاً زیادہ ذہین۔ اب ٹو ڈیٹ اور پراعتمادی کہتے ہیں تاکہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے تو گھر کی لڑکیوں کی اہمیت بھی دال برابر ہی تھی۔

حالانکہ سونا، بیا، ہانہ تینوں بونی ورثی میں بڑھتی تھیں خوب صورت بھی تھیں، مگر ان میں وہ طرح داری نہ تھی جو غزل میں دکھ رہی تھی۔ اس کا سر پہ لہجہ گفتگو کا پراعتماد انداز۔ مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا۔ اس کا حلیہ، شاعرانہ ڈرامائی سنس، وجدان جو پہلے ہی گھر کے ہنگاموں، شور شرابے سے عاجز تھا۔ سونیا آنٹی کے ہاں کے ایک دو چکر میں ان کا خوب صورت، صاف ستھرا پرسکون گھر دیکھ کر مزید متاثر ہو گیا۔

حالانکہ ہمدانی دلا، ان کے گھر کے مقابلے میں زیادہ بڑا اور خوب صورت بنا ہوا تھا مگر یہاں ہر وقت ایک افراتفری اور جنگ کا سماں رہتا۔ سنان، افتان اور حنان بھائی کے تینوں بیٹوں کے کھلونے۔ بیٹ ہال سارے صحن میں بکھرے رہتے اور اگر وہ لاؤنج میں ہوتے تو وہ غدر چٹا کہ الامان۔ اسٹیکس کا گند۔ صوفے کے کسٹمر فرائز کے کٹڑے غرض ذرا بھی تمیز طریقہ بھابھی نے نہیں سکھایا تھا۔ کہنے کو وہ اس کی سگی خالہ زاد تھیں مگر انتہائی پھوہڑا اور بے سلیقہ۔ یہ اس کا ذاتی خیال تھا اور اس تک ہی محدود تھا۔ یہ بات نہیں

ہو گیا۔ ”کیا کہا تاپی جان نے پھر.....؟“ کچھ دیر کے بعد زبان میں سے پھر بھجلی ہوئی۔ ”کچھ نہیں۔“

”مطلب..... ان کا لخت جگر سر پر سہرا سجانا چاہتا ہے۔ اور وہ چڑھنے کو گھوڑی فراہم کرنے کو تیار نہیں۔“ وہ اسے نظر انداز کرتا یونہی چپ چاپ کام کرتا رہا۔ ”ویسے جناب نے یہ بھی جاننے کی کوشش کی ہے کہ دوسری پارٹی کا انٹرسٹ اس ”ڈیل“ میں کتنا ہے؟“ ”تاپی بھی ایک ہاتھ سے سچی ہے.....؟“ اس کا جواب واضح تھا وہ ان کے انداز میں ہونٹ سکڑ کر رہ گیا۔ ”یعنی کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی ہے آہم م م م..... ویسے تاپی جان کو اعتراض کیا ہے۔ بلکہ کس پر ہے.....؟“

وجدان خود بہت ڈپریس اور الجھا ہوا تھا۔ جہاں آرا بہت نرم مزاج کی محفل خاتون تھیں مگر اس معاملے میں ان کا رد عمل بہت مختلف اور سخت قسم کا تھا۔ اسے ان کا دو ٹوک انداز یاد آیا تھا۔ وہ کرسی سے ٹیک لگا تا بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

”والدہ کو اعتراض ان کے اور ہمارے گھرانے کے مختلف رہن سہن پر ہے۔ اس کا پاؤ ہونا ان ہی بے بنیاد خدشوں میں گھیر رہا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ غزل ہماری ٹیلی میں ایڈجسٹ نہیں کر سکے گی بلکہ شاید ہمارے ماحول اور روایات کو خراب کر دے گی۔“ آخر میں اس کا لہجہ ذرا سچ ہو گیا۔

”لیکن یہ تو کوئی سولڈ ریزن نہیں ہیں۔ لگتا ہے پس پردہ بات کچھ اور ہے۔ ورنہ ٹوی بھابھی بھی شادی سے پہلے کتنی ماڈرن اور فیشن اسٹیبلش ہوا کرتی تھیں اب دیکھو تو مہینوں بالوں بھی کٹ گئی ہیں کرسیں۔“ اس نے مبالغے کی حد کر دی۔

”بھئی تو میں سمجھ نہیں پا رہا۔ امی، ابو مجھ سے بات کرنے کو تیار نہیں، اگر ایسا ہی رہا تو یہ معاملہ آگے کیسے بڑھے گا۔“ سائر کچھ دیر سوچتا رہا۔

”تم یوں کیوں نہیں کرتے کہ ریمان بھائی سے

تھی کہ گھر میں کام والی ماسی نہ تھی چاندی تو شام گئے گھر جاتی۔ منائی، کپڑوں کی دھلائی والی الگ سے تھیں پھر تینوں لڑکیاں بھی یونیورسٹی سے آکر مقدور بھر ہاتھ بٹاتیں مگر ریحان بھالی اور چاچو کے بچے مل کر بہت پھیلاوا پھیلا دیتے۔

اکثر بے وقت آنے والے مہمانوں کی آمد پر جو محن کا حشر نظر آتا، کئی بار وہ خود شرمندہ ہو جایا کرتا تھا۔ ڈرائنگ روم تو اب مستقل مقفل رکھا جانے لگا تھا تاکہ بچوں کی پہنچ سے دور رہے اور محفوظ بھی۔ ایک کینال پر بنے گھر میں لان بھی تھا۔ اندر خوب صورت کشادہ محن اور طویل رانداریاں تھیں۔ یہ گھر روایت اور جدت کا احتزاج تھا اگر محن میں کھلنے والے دروازے بند کر دیے جاتے تو سارا گھر اندر تک پیک ہو جاتا۔ سردیوں میں وہ ایسا ہی کرتے اور گرمیوں میں ساری کھڑکیاں دروازے کھول دیے جاتے تھے تاکہ سارا گھر روشن اور خوب ہوا دار ہو جائے۔ باہر کی سمت کچن۔ ڈرائنگ روم اور ہال کمرے کے دروازے کھلتے تھے کچن کا ایک دروازہ اندر اور پچھلا دروازہ لائڈری کی سائیڈ میں کھلتا تھا۔ کشادہ خوب صورت کچن تھا۔

اپنے نقشے اور سہولت کی وجہ سے یہ گھر ہر موسم کے لیے موزوں تھا مگر وجدان اسے پھیلاوا ہاؤس کہتا۔ جہاں ہر قدم پر کچھ نہ کچھ تو لازمی گرا ملتا ہے۔ اور چلتے وقت کسی نہ کسی چیز سے ٹھوکر لازمی لگتی ہے۔ یہ سب اس کی نفاست پسند طبیعت پر گراں گزرنے لگا تھا۔ اس لیے وہ سارے سیٹ اپ سے بڑی حد تک بےزار ہو چکا تھا۔

☆☆☆

جاتی سردیوں کے دن تھے بہار کی آمد آمد تھی۔ ہادی کی صرف ایک کلاس تھی سو وہ پوائنٹ لے کر گھر آئی۔ بپا کو لاہری میں کام تھا اور مونا کی کلاسز بھی باقی تھیں۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ محن میں چلی آئی۔ دھلے دھلائے محن میں کناریوں پر بنی کیاریوں اور مکلوں میں ٹہنیاں سبز ہو رہی تھیں، تالی اور امی وہیں بیٹھی سر جوڑے نجانے کون سے مسئلے بھاری تھیں۔

اسے آتا دیکھ دونوں چپ ہو گئیں۔

”اگر دونوں خواتین کو میری موجودگی میں راز و نیاز کرنے میں مسئلہ ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔“ وہ ہلکی سی شرارت سے کہہ کر ابھیں دیکھنے لگی۔

”نہیں بھی تم سے کیا مسئلہ ہوگا ہم تو اپنی الجھنوں میں ہیں۔“ جہاں آرا آج کل بہت چپ چپ اور انسر دہرہنے لگی تھیں۔ وہ مسکراتی ہوئی ان کے پہلو میں آ بیٹھی اور محبت سے بازو ان کے گرد حائل کر کے تسلی دینے لگی۔

”کیا بات ہے تالی جان..... آپ تو بہت پازینو اور حوصلے والی ہیں۔ اتنی مایوس لگ رہی ہیں۔ میں تو اپنی دوستوں کو آپ کی مثال دیتی ہوں کہ جیسی بھی صورت حال ہو آپ بھی ناامید نہیں ہوتیں۔“

”مایوس نہیں ہوں بیٹا! بس جب آپ حقیقت کو بھی چھپانا چاہیں اور سامنے والے کو تکلیف سے بھی بچانا چاہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے جبکہ سامنے والا سمجھنا اور سننا بھی گوارا نہ کرتے۔“

”آپا..... دل کیوں چھوٹا کرتی ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ مہناز یقیناً سب جانتی تھیں۔ ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر دلاسا دیا تو وہ پھیکا سا مسکرا دیں، مہناز ان کی چچا زاد تھیں برسوں کا خلوص بھرا ساتھ تھا۔ ہانیہ ادھر ادھر کی باتوں سے انہیں بہلانے لگی۔ بھابھی اور چھوٹی چچی بھی فارغ ہو کر کینوں کی ٹوکری اٹھائے ادھر چلی آئیں۔ چھوٹا حنان اپنی ٹوائے کار میں بیٹھا ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ باقی سب چونکہ اس وقت اسکول میں تھے لہذا افراتفری اور بھراوا نہیں تھا۔ دھوپ کو کہ چیز بھی مگر چلتی ٹھنڈی ہوا بدن کو خوش گوار لگ رہی تھی۔ وہ بھابھی کی باتیں بغور سنتی ساتھ میں کینو بھی کھائے جارہی تھی۔ جب وجدان کی اچانک ابھرتی کچھ حیرت زدہ کچھ طنزیہ آواز پر بے ساختہ مڑ کر دیکھنے لگی۔

”واہ۔ آج تو کمال ہو گیا ہے۔ گھر بہت صاف ستھرا نظر آ رہا ہے۔“ اس کے ہاتھ میں ٹیلی فون کی فائل تھی۔ یقیناً آفس سے آیا تھا۔

”نہ رستے میں پڑی چیزیں۔ نہ ہی بچوں کا

شور..... نہ ہی جگہ جگہ پڑا کھرا..... لگتا ہے خواب دیکھ رہا ہوں۔“ جہاں آ رہا نے تادی نظروں سے اسے دیکھا مگر ادھر پروا کے تھی۔

”کیوں..... کیا ہمارے بچے بد تہذیب اور گندے ہیں جو تم یوں کہہ رہے ہو.....“ ٹومی بھابھی بڑے دنوں سے اس کے رویے اور جملوں کو نظر انداز کر رہی تھیں مگر آج ضبط نہ ہوا تو بول گئیں۔

”میرے سر ٹیکلیٹ کی کیا ضرورت ہے، آپ بہتر جانتی ہیں انہیں.....“ بے نیازی سے کہتا وہ اندر کی جانب بڑھ گیا۔ تائی کا ملال اس کے انداز پر مزید بڑھ گیا۔ ٹومی بھابھی نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”دیکھ! آپ نے خالہ جان! کیسے میرے منہ پر جتا گیا ہے وجدان۔“

”جانے دو ٹومی..... وہ کوئی دل سے تو نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کی عادت کا تو تمہیں علم ہے۔ تم دل برا مت کرو۔“ مہناز نے سبھاؤ سے سمجھایا۔

”ہمیشہ سے نہیں تھا وہ ایسے چھوٹی خالہ! پہلے پھر بھی کچھ لحاظ و مروت تھی مگر اب تو بالکل بھی پروا نہیں کرتا۔“

بھابھی سچ کہہ رہی تھیں۔

”چھوڑیے بھابھی! یہ بتائیے کہ حنا کی شادی کے لیے کیا ڈیسیائیڈ کیا ہے آپ نے؟“

ہانیہ نے اس بحث کو طوالت سے بچانے کے لیے پھر سے وہی موضوع چھیڑا، جس پر وجدان کے آنے سے پہلے بھابھی اس سے ڈسکس کر رہی تھیں اور وہ کامیاب بھی ہوئی، براتو اسے بھی لگا تھا وجدان کا یہ انداز مصلحت اسی میں تھی کہ اس وقت اس بات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ وجدان فائل لیے جب واپس جانے کے لیے خن میں آیا تو حنا ان اپنی گاڑی سے لکر مار کے دو گئے گرا دیا تھا، کیونکہ سنے ہاتھ منہ لیے وہ تھک تھک ادھ کھائی قاشیں گرانے میں لگن تھا، اور بھابھی حسب عادت بے نیازی سے بیٹھی گپ شب میں مصروف تھیں۔ یہ نہیں کہ بچے پر بھی نظر رکھتیں۔

وجدان ان پر ایک طنزیہ نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا اور اس کی ان طنزیہ نظروں کو کسی اور نے دیکھا ہو یا نہیں

مگر ہانیہ نے شدت سے محسوس کیا اور الجھ سی گئی۔

☆☆☆

اس کے بدلتے تیور جہاں آ رہا تھے سے محسوس کر رہی تھیں۔ اندر سے قدرے بے چین، وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ بات کھلے اور مصطفیٰ صاحب کے کانوں تک بھی جا پہنچے۔ وہ ضدی تھا۔ اس کا انداز ہمیشہ قدرے لیے دیے رہا مگر آج کل وہ جس طرح سے انہیں نظر انداز کر رہا تھا وہ ان کے دل کو تھیں پہنچا رہا تھا۔

ایک نئی محبت کے پیچھے وہ اپنی ماں کو یوں فراموش کر دے گا انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وجدان ناراض تھا کہ وہ اتنی سختی سے انکار کیوں کر رہی تھیں۔ وہ مختلف مزاج کا تھا۔ اس کی سوچیں اس کے آئیڈیل میں کسی کزن ٹائپ کی لڑکی کی گنجائش نہیں تھی۔ غزل میں ایسے اپنا آئیڈیل نظر آیا تھا پھر وہ ابو کے کزن کی بیٹی تھی۔ فیملی بھی دیکھی بھالی تھی۔ اعتراض کا بظاہر کوئی پہلو نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے اس کے وہ قدرے ماڈرن تھی۔

اور یہ بھی کوئی ایسا سولڈ جواز یا اعتراض نہیں تھا۔ وہ جہاں آ رہا سے دوسری بار بھی بات کر چکا تھا مگر ان کی ٹال مٹول اسے اچھی طرح سمجھا گئی تھی کہ وہ یہ نیا پار لگانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ صرف مہناز یہ بات جانتی تھیں اور جہاں آ رہا کی خواہش بھی، جو ہانیہ کے حوالے سے تھی مگر یہ سب تو نصیبوں کا کھیل ہے اگر ان کی بیٹی کا نصیب، وجدان سے جڑا ہوگا تو دنیا کی کوئی طاقت بھی یہ ہونے سے نہیں روک سکے گی۔ مگر وہ بے خبر تھیں کہ وجدان ان دنوں کسی اور سچ پر سوچ رہا ہے۔

☆☆☆

وہ دونوں آج آئی ہوئی تھیں پورے گھر میں ایک خوش گواری چل رہی ہوئی تھی۔ آج ویک اینڈ تھا اور بچوں کی ہفتے، اتوار کی چھٹی ہوئی تھی لہذا ان کا ادھر ہی رات رکنے کا ارادہ تھا اور ان کے رکنے کا بن کر بچے بہت بر جوش اور خوش تھے۔ بچا اس دن یونیورسٹی نہیں گئی تھی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ مونا اور ہانیہ جب گھر آئیں تو خن میں بچوں نے ایک

ہنگامہ مچایا ہوا تھا۔ ان کے رکنے کا سن کر ان دونوں کا موڈ بھی خوش گوار ہو گیا۔ رات گئے تک چلیں لڑانے اور ساتھ میں ٹوٹتے رہنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا تھا۔ بلا کا تو نزلے سے برا حال تھا اور مونا بچوں میں گمن بھی اس لیے ہانیہ ہی گمن میں چلی آئی۔

سب کچھ تیار تھا سوائے چپاتیوں کے۔ اس نے چاندی کی ٹیبل لگانے میں مدد کی پھر سب کو بلا کر چاندی کے ساتھ مل کر روٹیاں پکانے لگی۔ کھانے پر چونکہ افراد زیادہ تھے تو وہ بے جاری اتنے سارے لوگوں کے لیے اکیلے کیسے پکا سکتی تھی۔ دوسرا تو ار رکھ کے وہ بھی مصروف ہو گئی، کھانے میں پلاؤ کے ساتھ تورمہ اور چکن کڑا ہی بنی تھی۔ اس کے فارغ ہوتے ہوتے تقریباً سب ختم ہو گیا۔

صرف ایک پلیٹ پلاؤ اور ذرا سا تورمہ ہی بچ سکا جو اس نے چاندی کو دے دیا، وہ صبح سے ہی کاموں میں لگی ہوئی تھی اتنا حق تو اس کا بنتا ہی تھا۔ وہ منگھور ہوئی، جلدی جلدی کھانے لگی کہ بہت بھوک لگی ہوئی تھی اس کی ایثار پسند طبیعت ایسی ہی تھی کہ اکثر وہ اپنا حصہ بھی یونہی چپ چاپ چھوڑ دیا کرتی تھی۔ گمن میں آئی بھابھی نے جب اسے چپاتی اٹھے کے ساتھ کھاتے دیکھا تو افسوس کرنے لگیں۔

”ذرا سا سالن بچا تو تھا۔ تم کھا لیتیں۔ چاندی اپنے لیے اٹھہ بیٹا لیتی۔“

”کوئی بات نہیں بھابھی۔ مجھے یوں بھی زیادہ بھوک نہیں تھی۔“ اس نے مسکرا کر انہیں تسلی دی۔

”خیر اب یوں تو مت کہو۔ یونیورسٹی سے آ کر لگی ہوئی ہو۔ یہ جتان جان کو نہ چمٹا ہوتا تو میں چپاتیاں بھی ڈال دیتی۔“ وہ سست سستی مگر بہت پر خلوص تھیں اور ان کی یہ صفت ان کی باقی مادوں پر بھاری تھی۔

”جانتی ہوں بھابھی۔ ویسے بھی پلاؤ آپ نے ہی بنایا تھا نا؟ اس کی خوشبو سے مجھے ہٹانک چل گیا تھا۔“

باقی بچی روٹی کو دسترخوان میں لپیٹ کر وہ ہاتھ دھونے لگی۔

”بس اس وقت یہ آفت سویا ہوا تھا تو میں نے

جلدی جلدی پکالیا۔ اچھا..... اب تم گرین فی مت بنانے لگ جانا۔ تم اندر جا کر بیٹھو میں بناتی ہوں۔“

اسے چوبیس کی طرف بڑھتے دیکھ کر انہوں نے ٹوک دیا۔ پانی وہ جو لیے پر پہلے ہی رکھ چکی تھی۔ لہذا کندھے اچکانی وہ مسکرائی باہر نکل گئی۔ رات کو چونکہ سب ہی افراد کھانے پر موجود ہوتے اس لیے وہ اور مونا بچی چاندی کے ساتھ عصر سے ہی گمن میں لگ گئیں۔ بیا الرجی کی ٹیبلٹ کے زیر اثر غنودہ سی تھی جہاں آرا اور مہنا زاب زیادہ ایکٹو نہیں رہی تھیں۔

وہ صرف بیٹھ کر ہدایات جاری کرتیں چاندی اکیلی کتنا کام کر سکتی تھی، شام کی چائے پر بھابھی نے ریحان بھائی سے بیکری کا سامان منگوا لیا تھا۔ کیونکہ بچوں کو ہر تھوڑی دیر بعد کچھ نہ کچھ کھانے کو چاہیے تھا۔ نانی کا گھر نہ تھا گویا کوئی پکنک اسپاٹ تھا ان کے لیے علی اور احمد نے لگے ہاتھوں بچوں کے ساتھ کرکٹ میچ لگا لیا تھا جس میں ان کی بے ایمانی کے اعلیٰ مظاہروں پر وہ بے چارے چیختے ہی رہ گئے۔ مگر وہ دونوں بیٹ چھوڑنے کو تیار نہیں تھے، آخر کار بھابھی نے ڈانٹ ڈپٹ کر چھوٹوں کو بھی بیٹ دلوا دیا اور یہ سارے ہنگامے آنجناب عزت مآب وجدان مصطفیٰ کی آمد سے پہلے کے تھے ان کی انٹری کے بعد سب دبک کر لاؤنچ ٹیک محدود ہو گئے ماتھے پر بل آنکھوں میں ناگواری لیے اس نے لان اور گمن میں بکھرے بیڈ بال اور سائیکلز کو دیکھا تھا۔ پھر یونہی تیوری چڑھائے کسی سے ملے بغیر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بچوں کو تیز کے جامے میں آتا دیکھ کر خواتین جان گئیں کہ وجدان آیا ہے۔

”یہ تو لگتا ہے ساری میز و تہذیب بھول چکا ہے۔ امی سچ بتائیں..... کیا ہوا ہے اسے جو پچھلے ایک ماہ سے صاحبزادے کے تیور ہی بدلے ہوئے ہیں.....“

حسنہ آپی کو اس کا انداز کھلاتا تھا۔ لہذا اب وہ جہاں آرا سے استفسار کر رہی تھیں۔ اس وقت تانیہ یہاں موجود نہیں تھی۔ اس لیے وہ کھل کر ماں سے بات کر سکتی تھیں۔

”دماغ خراب ہوا ہے اس کا اور کچھ بھی نہیں۔“
ان کا کچھ چھپاتا تھا کا سانداز حسنہ کو ٹھکانا گیا۔

”کیوں دماغ خراب ہوا ہے اس کا ایسی کیا بات ہوئی ہے.....؟ آپ بتائیں مجھے۔ ضرور آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔“

”کچھ نہیں چھپا رہی میں.....“ وہ تشہیر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

”تو پھر اتنی فکر کر کیوں تنکے لگی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔“

”ہال بس۔ بی پی آج کل ٹھیک نہیں رہ رہا۔“
وہ بات کو اپنی بیماری میں چھپا گئیں۔

”چلیں انھیں۔ میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے کے چلتی ہوں۔ اتنی لا پرواہی کیوں برت رہی ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں۔“

ان کی فکر مندی پر وہ قدرے جھلا گئیں۔
”اوہو..... اب ایسا بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔“

دوا لے رہی ہوں اپنی۔ انہیں ٹالتے ہوئے وہ لیٹ گئیں۔ وہ انہیں پر سوچ نظروں سے دیکھے گئیں اور جب کھانے کے وقت وجدان کمرے سے نکلا۔ تو حسنہ نے اسے ذرا بھی رخ نہ دیا۔

اس کے سلام اور حال احوال پوچھنے پر روکھے سا جواب دے کر وہ کھانے کی طرف ہی متوجہ رہیں۔ تانیہ نے البتہ اسے خوب لتاڑا اور اس معاملے میں سائر بھی

اسے مزید شہ دے رہا تھا اور رات کو جب وہ بیا اور مونا کے مشترکہ کمرے میں آئی تو وجدان ہی موضوع بحث تھا۔ بیا اور مونا لاعلمی کا اظہار کر رہی تھیں۔ انہیں خود علم نہ

تھا کہ وہ آج کل کیوں ایسا ہو رہا تھا چڑچڑا اور بد لحاظ سا۔ ”ہونہ ہو کسی لڑکی کا چکر ہے۔“ تانیہ دور کی کوڑی لائی تو سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔

”ہوں..... ٹھیک کہہ رہی ہوں تم..... موصوف ضرور کسی چکر میں ہیں.....“

یہ بات حسنہ کے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ حسنہ نے ذرا غور کیا تو کڑیاں خود بخود ملنے لگیں۔ امی کا تکتا

تھکر انداز اور وجدان کی جھنجھلاہٹیں، یقیناً کچھ ایسا ہی

ہے۔ جب ہی تو امی اتنی ٹینس نظر آتی ہیں۔ شاید انہیں اس کی پسند پر اعتراض ہو یا شاید اس کی پسند

بہت غیر متوقع ہو مگر وہ تو بہت نرم فطرت کی تھیں۔ کبھی کسی چراپنی مرضی نہیں تھوپی، ضرور کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوگی۔ انہوں نے چند محو میں سارا عقدہ حل کر لیا۔

”ارے نہیں آپی..... وجدان بھائی آپ کو ایسے نظر آتے ہیں۔“ بیا بے یقین بھی مگر مونا تو ایک

دم سے ایکسا پٹنڈ ہو کر حسنہ کے قریب کھسک آئی۔
”کیوں۔ کسی کو پسند کرنا کوئی غیر معمولی، ان ہونی

بات تو نہیں جو وجدان نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی لگتا ہے یہی وجہ ہے جو آج کل سب کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہے ہیں۔“

”مونا.....“ مونا کی چیخی کی طرح چلتی زبان کو تانیہ کی تنبیہی آواز نے بریکٹ لگائی تو حسنہ کو دیکھ کر وہ کھسیا سی گئی۔

”چلو، جو بھی معاملہ ہوا پتا چل ہی جائے گا۔ ابھی تو مجھے یہ بتاؤ حسنہ کہ تمہارے چچا سر کے بٹے کی شادی کیسی

رہی۔ فون پر تم نے کہا تھا کہ مل کر تفصیل بتاؤ گی اس چھمک چھلو کی جو عادل بھائی پر فیدا ہوئی جا رہی تھی۔“

تانیہ فطرتاً لا پرواہ تھی۔ زیادہ دیر کسی بات کو سر پر سوار رکھنا اس کی عادت نہ تھی۔ اس پورے قصے سے زیادہ

اسے اس قصے کو جاننے میں زیادہ دلچسپی تھی جو چھپا تھا۔
عادل حسنہ کا شوہر تھا۔ وہ سب بھی ہمہ تن گوش

ہو گئیں۔ حسنہ آپی اب ہنس ہنس کر لڑکی والوں کی طرف سے آئی اس حسینہ کی داستان غم سنار ہی تھیں، جو عادل

بھائی کو کنورا سمجھ کر ان پر ڈورے ڈالنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی مگر جب بیٹی اور بھلو کو انہیں پایا کہتے سنا تو بے

جاری کی حالت دیکھنے والی تھی۔ وہ سب بھی اب موہک چھلی اور چپس سے لطف اندوز ہوتی دلچسپی سے یہ قصہ سن

رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ بھرپور تبصرے بھی جاری تھے۔
انہیں اب رات گئے تک جاگنا تھا کہ بیٹوں بعد تو یوں مل

بیٹنے کا موقع ملتا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن اتوار اور گھر میں چونکہ رش تھا۔ وجدان سوچ سمجھ کر بارہ بجے تیار ہو کر نیچے آیا۔ جملہ خواتین محسن

میں ہی براجمان تھیں سو جب وہ کچن سے ناشتا کر کے نکلا تو اسے یوں تیار شیار دیکھ کر حسنه آپی نے بڑے انداز سے کھوجا۔ اور جب بولیں تو انداز بڑا سادہ تھا۔
”خیریت وجدان..... اتنے تیار ہو۔ لگتا ہے ڈیٹ پر جا رہے ہو۔“

”جی ضروری ڈیٹ ہے، ملاقات ہوگی۔“ جمال ہے جو وہ ذرا بھی چونکا ہوا یا چہرے پر ہل بھر پر کوئی تاثر آیا ہو وہ اسی سنجیدگی سے کہتا جملہ خواتین کو ہکا بکا چھوڑ کر نکلتا چلا گیا۔

حسنہ البتہ گہری سوچ میں ڈوبی گیٹ کو دیکھتی رہیں۔ سائر جو چائے کا تیسرا گک ہاتھ میں لیے جمائیاں لیتا باہر نکلا تھا اس بات پر اس کا کھلامنہ اسی زاویے پر رہ گیا۔ ساری سستی ہوا ہوئی۔ سوئی حیات پوری طرح جاگ اٹھیں۔ ”ارے..... کیا واقعی وجدان ڈیٹ پر گیا ہے۔“ ٹومی بھابھی جو کچن سے نکلی تھیں اب بڑی حیرت سے افراد خانہ سے تصدیق چاہ رہی تھیں۔

”یونہی بول دیا ہوگا۔ شاید حسنہ کا انداز برا لگا ہوگا۔“ رفعت تانی نے بات کو بے نظر بننے سے پہلے سنبھالنے کی کوشش کی۔

”نہیں خالہ۔ دال میں کچھ تو ضرور کالا ہے۔ سائر تم بتاؤ۔ تم تو اس کے ککے بڑی ہوتا۔“ اور سائر نے حفظ ماتقدم کے تحت فوراً گک لبوں سے لگا کر بے نیازی دکھائی۔

”بھوجی۔ اب استادی مت دکھاؤ۔ تمہیں یقیناً پتا ہے کہ وہ کہاں گیا ہے کس سے ملنے گیا ہے۔“

ٹومی بھابھی کے ہاتھ جیسے کوئی دلچسپ موضوع آگیا تھا۔ سائر دل میں جھلایا۔ اسے وجدان سے ایسے جیلے کی توقع نہ تھی اور پر سے بھابھی کا مزا لیتا انداز، تانی امی یہاں نہیں تھیں وہ نہ انہیں بہت افسوس ہوتا۔ سائر نے خود کو سنبھالا۔ چائے کا ایک گھونٹ بھرا اطمینان سے انہیں دیکھا۔

”جی..... مجھے پتا ہے کہ وہ کہاں گیا ہے۔ آج واقعی اس کی ڈیٹ ہے۔“ وہ ہل بھر کور کا پھر اضافہ کیا، ”بزگس ڈیٹ ہمارے کلائنٹ کی مسز ہیں۔“

واصفہ خلیل ان کے ساتھ۔“

”لو۔ کھودا پہاڑ..... نکلا چوہا۔“ انہیں جان کر شدید مایوسی ہوئی۔ ریحان بھائی کے پکارنے پر وہ چلی گئیں تو سائر نے بلا ٹلنے پر دل میں شکر ادا کیا اور پکا فیصلہ کیا کہ آج تو اس وجدان مجنوں کو چھوڑے گا نہیں۔ ان تمام باتوں سے لائق حسنہ کچھ اور سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

ایک دو ضروری کام نمٹانے کے بعد وجدان اپنے پسندیدہ ریسٹورینٹ میں بیٹھا غزل کا انتظار کر رہا تھا۔ سنڈے کا لچ کل سے پلان تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی خوشبو میں بسی فریش فریش سی غزل بھی چلی آئی۔ اس نے رسٹ کمر کی لائنگ اسٹائش شرٹ پہن رکھی تھی۔ بلیک ہینڈ بیگ اور برانڈڈ گلاسز لگائے اس نے صرف ڈارک میرون کمر کی لپ اسٹک لگائی تھی جس نے اس کے سفید چہرے کو مزید چار چاند لگا دیے تھے۔ اسٹیب میں کیے بلوینڈ اسٹریک ہال گندھوں پر بے نیازی سے بکھرائے وہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ اور پراعتماد لگ رہی تھی۔

”زیادہ انتظار تو نہیں کروایا تھا۔“ بیک ٹبل پر رکھتے اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ وجدان جواباً مسکرایا۔
”ناٹ ایٹ آل، لکنگ گڈ۔“ اس نے حق سمجھ کر تعریف کی۔

”لائیک آلویز..... ویسے ہائی داوے۔ کیا مجھے بھی تمہاری تعریف کرنی پڑے گی۔ آبی مین ریٹرن۔“
”اوں ہوں..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں وہ پڑھ لی ہے۔“
اس کا خود پر یقین بے جا نہ تھا۔ وہ بلا کا خود آگاہ تھا غزل کھکھلائی۔

”دیری کلیور چلو پہلے کچھ آرڈر کر لیں۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ یونوج سے صرف ایک گلاس فریش جوس ہی پیا ہے۔

”اور وہ صبح کتنے بجے ہوئی تھی ہائی داوے۔“ اس نے ہمنویں اچکاتے استفسار کیا۔ وہ پھر کھکھلائی۔
”مکشہ بھر پہلے وہ بیڈ پر تو تھی۔ وجدان جانتا تھا۔“

”جانتے تو ہوں تم۔ آج سنڈے ہے یعنی میرا آف ڈے۔“ وہ اس کے سارے معمولات سے باخبر تھا۔ یہ احساس اسے خوش گوار لگا تھا۔ وجدان اب ویٹر کو بلارہا تھا۔ وہ دونوں اس پورے ماحول میں سب سے نمایاں تھے۔ بھرپور اور منفرد۔

”خیریت..... آج بہت سیریس لگ رہے ہو؟“

ویٹر آرڈر لے کر چلا گیا تو غزل نے پوچھا جو کافی غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

”وہ تو میں ہوں..... تمہارے لیے۔“ ذرا رک کر اس نے جملہ کھل کیا تو غزل مسکرا دی۔ ایک اطمینان بھری مسکراہٹ۔ وجدان نے آج تک نہ ہی کھل کر اظہار کیا تھا اور نہ ہی کوئی عہد و پیاں مگر آج وہ اس سے سب کچھ کھل کر کہہ دینا چاہتا تھا۔ امی سے دوبارہ بات کرنے سے پہلے اس کی رائے جانتی ضروری تھی گو کہ وہ اس کی نظروں میں چھپی پسندیدگی کو جانتی تھی اور اس نے بھی اس پر اعتراض بھی نہیں کیا تھا اس لیے وجدان کو یقین تھا کہ وہ اس کا پروپوزل بلا جھجک قبول کر لے گی۔

”غزل..... اگر میں تمہیں پروپوز کروں تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟“ اس کے روشن چہرے کو نگاہوں کی گرفت میں لیے اس نے براہ راست سوال کیا تھا۔ چند لمحے یونہی گزر گئے وہ منتظر تھا۔ غزل کسی نتیجے پر پہنچی پھر سنجیدگی سے مخاطب ہوئی۔

”آئی نو وجدان..... تم بہت اچھے ہو، ہینڈ سم اور ویل کو ایفائیڈ ہو اور کچھ عرصے میں ہی میرے بہت اچھے دوست بن گئے ہو۔ ان فیکٹ وہ سب کو ایڈمیشنز میں ہیں جو میری جیسی لڑکی کو اٹریکٹ کر سکے۔“

وہ بولتے بولتے رکی۔ اس کا مبہم انداز تھا۔ وجدان نہایت سکون سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس کے مزید بولنے کا منتظر تھا۔ غزل نے اس کے گہمیرنا اثرات کو بغور دیکھا اور مزید سنجیدہ نہ رہ سکی۔ اس کے کھل کر مسکرانے پر وجدان نے ایک گہمیرنا احساس لیا۔ وہ سب سمجھ گیا۔ ”تو میں تمہارا پروپوزل ایکسپٹ کر لوں گی۔“ اس کے شوخ انداز پر وجدان کے تنے

اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ چہرے پر آئی بٹاشت کو دیکھ کر وہ پھر ٹھکھلائی۔

”لی آئین وجدان..... تمہاری حالت تو کسی تونے دار پر لٹکے ہوئے شخص کے جیسی ہو رہی تھی۔ آئی واژ جسٹ جو کنگ ہو۔“ وہ مسلسل اپنے جاری تھی اور یہ کوئی وجدان مصطفیٰ سے پوچھتا کہ اتوار کا دن ایک دم سے کتنا روشن اور خوب صورت ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن سائر نے خوب اس کے لیے اور حیرت انگیز بات یہ کہ وجدان مصطفیٰ بغیر برآمدانے مسکرائے جا رہا تھا۔ صلواتیں سناتا سائر اچانک خاموش ہو کر اسے گھورنے لگا۔

”ایسا کون سا زعفران کا کھیت دریافت کر لیا ہے تم نے جو اس سٹرپل منہ پر بہا رہی اتری ہوئی ہیں۔“

”تمہیں کوئی تکلیف ہے؟“

”تکلیف میں تو تم کل مجھے ڈال گئے تھے۔ تمہارے جانے کے بعد ہر کوئی مجھے مٹھوک نظروں سے گھورتا پوچھ رہا تھا کہ وجدان مصطفیٰ جو آج کل بد اخلاقی کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہیں۔ کہاں، کس کے ساتھ ڈیٹ مارا نے جا رہے ہیں۔ دل تو چاہتا تھا کہ آنسو غزل کا نام لے ہی دوں مگر پھر نقص امن کا سوچ کر، ٹال گیا۔“

”تو لے دیتے ناں.....“

اس کے سڑے ہوئے انداز کے جواب میں یہ خلقت لہجہ اب واقعی سائر کو کرنٹ لگایا پٹاپ کو جھٹکے سے بند کر دیا۔

”خیریت بڑی..... ایسا کیا ہوا ہے جو رخ روشن پراتنی تابناکیاں ہیں۔“

وجدان نے پیچھے ہو کے کرسی سے پشت لگائی مٹھی کو ہونٹوں پر رکھے وہ محفوظ ہوئی نظروں سے اس کے انداز کو دیکھتا کلچ میں ہونے والی ساری گفتگو بتانے لگا۔ اسے خاموشی سے سنتا سائر بات کے اختتام پر قدرے متشکر لہجے میں اسے ٹوک گیا۔

”تمہیں پہلے تانی ای کو منانا چاہیے تھا پھر اسے

پر پوز کرتے۔“

”امی جان مان جائیں گی۔“ وہ پر یقین تھا۔

”اور فرض کرو، اگر وہ نہ مانیں.....؟“

وجدان چند لمحوں کے لیے کچھ بول نہ سکا۔

”انہیں ہر حال میں ماننا پڑے گا ورنہ اپنی زندگی

کا یہ اہم فیصلہ میں ان کی مرضی کے بغیر کر لوں گا۔“

اس کا اتنا خشک اور دو ٹوک انداز سائر کو برا لگا اور

افسوس بھی ہوا۔

”تم نے ریحان بھائی سے بات کی۔“ وہ دل

سے چاہتا تھا کہ تائی امی ہرٹ نہ ہوں اور وجدان بھی

خوش رہے۔

”نہیں..... میں خود ایک مرتبہ پھر امی سے بات کرنا

چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے اس وہ مجھے سمجھیں گی اور انکار

نہیں کریں گی۔“ وہ بہت پر امید تھا۔ سائر زیر لب بڑبڑایا۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ جو بھی تھا وجدان اس کا

جگری دوست تھا۔

☆☆☆

سائر کی بات بیا سے پٹے تھی اور اسی سال کے

آخر میں ان کی شادی متوقع تھی، بیا بڑی بے نیاز اور

سنجیدہ سی لڑکی تھی سائر بھی اس سے بڑے عام سے

انداز میں ہی بات چیت کرتا تھا کہ گھر کی عزت اور

اپنے بڑوں کا اعتبار و اعتماد دونوں کو ہی عزیز تھا۔ اس

رہتے پر اسے کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا البتہ یہ

ضرور تھا کہ بیا اسے اچھی لگتی تھی۔ ہانیہ اور مونا بھی اسی

وجہ سے اسے خاص پر دلوں کو دل دیتی تھیں۔

شام کو غیر متوقع طور پر سونیا آنٹی چلی آئیں۔

وہ اس عمر میں بھی بہت شوخ رنگ پہنتی تھیں۔

ڈارک میرون سوٹ گولڈن ڈاکی کے بالوں کے ساتھ،

جیولری سے آراستہ خوشبوؤں میں تھی سونیا آنٹی جس

استحقاق سے بیٹھی تھیں اسے دیکھ کر عجیب سا لگ رہا تھا۔

رفعت تائی کو ان کے انداز بہت کھلتے تھے۔ ابھی بھی ٹراؤزر

سے جھانکتی ان کی شفاف پنڈلیاں ہانکی ہیل میں مقید پاؤں

پر لگی میرون نیل پالش دیکھ کر ان کا دل برا ہوا۔

”اسے تو اپنی عمر کا بھی کوئی لحاظ نہیں۔ ایسے بن

ٹھن کر تو ادا کارائیں بھی نہیں رہتیں جیسی یہ اس عمر میں

بھی چھمک چھلونی کھومتی ہے۔“

چائے کے لوازمات کا جائزہ لیتی وہ ناگواری

سے بڑبڑاتی تھیں، چچی ان کی بات سن کر ہنسنے لگیں

، مونا بھی مسکرا دی۔

”چھوڑیے نا بھابھی۔ دل جوان ہونا چاہیے۔

آپ نے خود پر ابھی سے بڑھاپا طاری کر رکھا ہے۔

کچھ سیکھیے ان سے۔“ ان کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

”نہ بھئی..... ہمیں نہیں سیکھنا ایسا کچھ بھی۔ ہر چیز

وقت اور عمر کے حساب سے ہوتی ہے۔ اب بہو، داماد والی

ہو کر میں یوں ہونٹ لال کیے بیٹھی، اچھی تھوڑی لکڑی لگی۔“

”امی..... تو کیا کیجیے نا۔ سچ بابا بھی خوش ہو جائیں۔“

مونا کی بات پر انہوں نے غصے سے اسے گھر کا۔

”شرم کرو..... ماں کو ایسے اوندھے مشورے

دے رہی ہو۔ چلو لاؤ یہ ٹرائی۔ اس سولہ کے سن والی

کے لیے۔“ مونا برے منہ بنانے لگی۔

”اگر ان کا آنا اتنا ہی ناگوار گزرتا ہے تو پھر اتنا

اہتمام کیوں کر داتی ہیں۔“ اسے تو ان خواتین کی سمجھ

بھی نہیں آتی تھی۔

”کیونکہ بیٹا جی..... مہمان نوازی اس گھر کی

روایت ہے۔ چلو اب لاؤ چلی رہی ہے۔“

چچی نے نکلتے نکلتے شگفتگی سے سمجھایا تو وہ گہرا

سانس بھر کر رہ گئی۔ آج تو سونیا آنٹی کے تیور ہی

بدلے لگ رہے تھے، ابھی گھر کی سیٹنگ کو تنقیدی

نگاہوں سے دیکھ کر بدلوانے کا مشورہ دیتیں۔ ابھی

اتنے بڑے محن پر اعتراض کبھی ڈرائنگ روم کا فرنیچر

اولڈ فیشن لگ رہا تھا۔ جہاں آرا بڑے صبر و حوصلہ

سے ان کو برداشت کرتی رہیں اور ان کے جانے کے

بعد بی بی کی گولی کھا کر لیٹ گئیں۔ ان کے تیور انہیں

کھٹک رہے تھے۔

”کیا وجدان نے کوئی امید دلائی ہے جو یوں حق

جتا رہی تھیں۔“

سوچ انہیں بے چین کر گئی۔ وہ وجدان سے

اب کھل کر بات کرنا چاہتی تھیں۔ ہانیہ ان کے لیے

اسٹرائٹنگ سی چائے لے آئی پھر نہ نہ کرتے بھی ان کا سرد ہانے لگی۔ انہوں نے محبت و بیعت سے اس کے سادہ پر خلوص چہرے کو دیکھا۔ سیاہ گہور آنکھیں۔ لمبے بالوں کی چٹیا بنائے اس کے چہرے پر ایک نرمی و ملاحظت تھی۔ اس کا دل آئینے جیسا صاف تھا اور اس کے ایثار اور خلوص کے سب ہی معترف تھے۔ وہ جوان کی پسند تھی اور نجانے کب سے انہوں نے وجدان کے لیے اسے ہی سوچ رکھا تھا۔ اس جیسے روکھے مزاج لڑکے کے لیے ہانسی جیسی پر خلوص اور سادہ لڑکی ہی بہترین انتخاب تھا۔ انہی کا منی سی لڑکی کو دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپلائیڈ کمپسٹری میں ماسٹرز کر رہی تھی۔

ہر رنگ میں نمایاں اور منفرد۔ انہیں اب افسوس ہوتا تھا کہ انہیں وجدان کو پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا یا اسے باندھ دینا چاہیے تھا۔ مگر خیر..... ابھی بھی دیر نہیں ہوئی، شاید وہ سمجھ جائے۔ امید کی کرن کو کہ کمزوری بھی مگر دل کو بہلا دے دینا کون سا مشکل ہوتا ہے۔

☆☆☆

وجدان اسے گیٹ پر ہی سی آف کر کے چار ہاتھ مگر سونیا آنٹی چلی آئیں اور اسے زبردستی اندر لے گئیں۔ ”چلو تم مئی کے پاس بیٹھو۔ میں فریش اپ ہو کر آتی ہوں۔“ غزل اندر کی طرف بڑھ گئی، وہ وہیں لان میں بیٹھ گیا۔ سونیا آنٹی اندر جوس کا کہنے چلی گئیں۔

وہ تنقیدی نظروں سے لان کو دیکھنے لگا جو سبز گھاس اور پھولوں سے بھرا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دوپہر کا بیچ اس کا غزل کے ساتھ تھا۔ اس کی گاڑی مسئلہ کر رہی تھی تو ہی اسے ڈراپ کر لے آ گیا۔ سنبھری دھوپ سارے لان میں پھیلی ہوئی تھی۔ پیٹ سے چمکتے کھلے، دھلے ہوئے درخت غرض سارا لان ہی صاف ستھرا تھا۔ کہیں کوئی بے ترتیبی نہ تھی۔ اس کا دھیان اپنے کمر کے لان کی طرف چلا گیا۔ جہاں ہر وقت بیٹ، ہالز لڑھکتے رہتے۔ کہیں گھاس کم کہیں زیادہ۔ کرسیوں کو دن میں سینکڑوں ہار بھی ترتیب سے رکھا جائے مگر پھر بھی چند لمحے بعد ہی وہ بے ترتیب

پڑی ہوتی ہیں۔ وہ کبری سانس پھرنا حال میں اوسٹ آیا۔ اس کمر میں ایک ترتیب تھی۔ ایک انکم وٹا تھا۔ ایک سکون بھری خاموشی تھی۔ درختوں پر بھیرا ایک پرندوں کے علاوہ کہیں کوئی آواز بھی نہ شور۔ اسٹن میں سونیا آنٹی مازمہ کے ہمراہ چلی آئیں۔ انہوں نے نیکی انشائل گھنٹوں تک آنا بلیک وائٹ اور ٹرائڈر پہن کر ایک کندھے پر انشائلش ریڈ انشائلر لالے وہ کمر میں بھی تک سک سی تیار تھیں۔

”اور سناؤ بیگ مین۔ لیس ہو۔“ وہ اس کے مقابل ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھ گئیں وہ سنبھلا۔

”فائن“

”ہوں۔“ لگ بھی رہے ہو۔“ ان کا منی خیز اشارہ کس طرف تھا وہ سمجھ گیا۔

”کیا تمہاری ٹیلی کو پتا ہے کہ تم غزل میں انٹرنلڈ ہو اور اسے پروپوز کرنا چاہتے ہو۔“ انہوں نے اچانک براہ راست پوچھا۔ ان کے لہجے میں کچھ تھا جس سے وجدان چوڑکا پھر صاف کوئی سے بولا۔

”صرف امی کو علم ہے۔“

”اچھا..... مگر ان کو دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ وہ اس بارے میں کچھ جانتی بھی ہیں کہ تم نے غزل کو پروپوزل رنگ دی ہے۔“ ان کا انداز بڑا چبھتا ہوا سا تھا۔ وجدان اب کے الجھ گیا۔

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں آنٹی۔ کھل کر کہیں۔“

اس نے گلاس ہاتھ سے رکھ دیا تھا۔ انداز بہت سنجیدہ سادہ تھا۔ سونیا آنٹی نے اطمینان سے سامنے پڑا جوس کا گلاس اٹھایا اور نزاکت سے پینے لگیں۔

”وجدان اغزل میرا کل سر رہا ہے۔ تم ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہو مگر صرف تم ہی نہیں کئی پروپوزل اب بھی صرف میری ایک ہاں کے منتظر ہیں وہ تم سے کہیں زیادہ ویل کو الیغابنڈ ویل آف ہیں۔ لیکن خیر غزل کا تم میں انٹرسٹ دیکھتے ہوئے میں خاموش ہوں کچھ۔“

وہ بات کرتے کرتے رک گئیں۔ وجدان کھل سے ان کی ساری گفتگو سن رہا تھا۔ جوس کا گلاس اس کے سامنے ان چھوڑ رکھا تھا۔ خاموشی کا یہ ان وقت ذرا

طویل ہو گیا۔ تو وجدان کو ابھرن سی ہونے لگی۔ سونیا آنٹی نے گلاس رکھا پھر قدرے آگے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سر دلچے میں بولیں۔
 ”تمہاری ماں..... تمہیں کبھی بھی۔“ میری بیٹی سے شادی کی اجازت نہیں دے گی۔“ ان کا انداز چبھتا ہوا تھا۔ وجدان ٹھٹکا۔

”اس نے پہلے بھی میرا حق مارا تھا اور آج بھی وہ میری بیٹی کو اس کی خوشی کبھی حاصل نہیں ہونے دے گی۔“ ان کا انداز ان کی سرد مہری۔ ان کا الزام اسے سخت ناگوار لگے۔

”آپ کس حق کے بارے میں بات کر رہی ہیں؟“
 ”مصطفیٰ زیدی..... میرا سابقہ منجیتر میری پہلی محبت۔“ انہوں نے دھماکہ کیا تھا اور اسے لگا کہ وہ پاتال میں جاگرا ہو۔ اس کی حالت سے لطف اندوز ہوتی وہ اب اطمینان سے دل میں مسکرا دیتی ہوئی دوبارہ جوس پینے لگیں۔

☆☆☆

ہانی نے بکس بند کیں۔ پڑھ پڑھ کر سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ کسمندی سے ذرا دیر کمر ٹیکنے کے بعد وہ بادل خواستہ آٹھی..... بیا اور مونا، رفعت تائی اور بھابھی کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھیں۔ بچوں کو بھابھی نے میکے چھوڑنا تھا پہلے پھر وہاں سے چاروں نے بازار جانا تھا۔ چچی یقیناً سو رہی ہوں گی۔ وہ آٹھی۔ کپ چائے بنا کر اس نے ٹرے میں رکھی۔ اپنا کپ کمرے میں رکھ کر وہ دوسرا کپ لیے تائی جان کے کمرے کی طرف آئی تھی۔ وہ دوپہر کو کم سوئی تھیں اور چائے کی شوقین بھی تھیں۔ کوریڈور میں کھلتے ان کے کمرے سے آئی وجدان کی سچ آواز سن کر وہ رک گئی۔

وہ نجانے کب آیا تھا اور اب اندرتائی سے شاید بحث کر رہا تھا۔

”میں نے آپ سے بات اس لیے کی تھی کہ مجھے آپ پر مان تھا۔ مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ آپ کے لیے میرے جذبات، میری پسند اہم ہوگی مگر آپ! آپ

اس معاملے میں اتنی بے لچک ہوں گی.....؟ کیوں چاہتی ہیں کہ میں اپنی خواہش کو قربان کر دوں.....“
 وجدان سونیا آنٹی کی باتیں سننے کے بعد بہت ٹینس تھا۔ ان کے الزامات پر اسے یقین نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہ آفس سے اٹھ آیا اس کا ارادہ جہاں آرا سے ایک بار پھر بات کرنے کا تھا۔ وہ انہیں منوانا چاہتا تھا مگر انہوں نے اس کی بات سن کر وہی کہا جس کا خدشہ تھا۔

”تم نہیں جانتے وجدان۔! یہ سب تمہاری بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔ کون ماں چاہتی ہے کہ اس کی اولاد کی خواہش پوری نہ ہو۔ کون اسے ناراض یا ناخوش دیکھنا چاہتا ہے.....؟“

میں بھی تمہیں ہمیشہ خوش و مطمئن دیکھنا چاہتی ہوں..... اگر تمہارا انتخاب غزل کے بجائے کوئی اور ہوتا تو میں دل سے ہنسی خوشی مان لیتی۔“ وہ کھل کر کیسے کہہ دیتیں کہ سونیا کے ارادے انہیں ٹھیک نہیں لگ رہے تھے جو کام وہ ماضی میں نہ کر سکیں۔ اب کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے گھرانے، ان کے خاندان میں دراڑیں ڈالنا ہمیشہ ان کی کوشش رہی تھی۔

”کیوں امی.....؟ غزل میں کیا خرابی ہے؟“
 ”خرابی اس میں نہیں..... بلکہ۔“ وہ بروقت چپ ہو گئیں۔ پھر آہستگی سے کہنے لگیں۔
 ”وہ اگر سونیا کی بیٹی نہ ہوتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ تم نہیں جانتے کچھ بھی.....“

وجدان کو جھٹکا لگا۔ اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تو کیا سونیا آنٹی ٹھیک کہہ رہی تھیں؟ ان کے الزام درست تھے۔ جہاں آرا نجانے مزید کیا کہہ رہی تھیں مگر اسے سنا ہی نہیں دے رہا تھا۔

”سونیا آنٹی سے آپ کو کیا ایثو ہے.....؟“ ان کی بات کاٹ کر اس نے سنجیدگی سے ان کو دیکھا۔
 ”وہ اک آزاد خیال عورت ہے جسے گھر گرہستی.....“

”میں جانتا جاہ رہا ہوں کہ آپ اور سونیا آنٹی کے درمیان ایسا کیا ہوا تھا جو آپ انکار کر رہی

ہیں.....“

وہ ایک بار پھر ان کی بات کاٹ گیا۔ اس کا چہرہ انداز اور جس طرح وہ لفظوں کو زور دے کر بولا۔ کچھ جان لینے کا احساس اس کی آنکھوں سے صاف جھانک رہا تھا ان کے چہرے پر عجیب سی یاسیت چھا گئی۔

”تم ان باتوں کو رہنے دو۔“ وہ ٹال گئیں۔

”میں نے تمہارے لیے ہانیہ کی بات کب سے رفعت کے کانوں میں ڈال رکھی ہے۔ ہانیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس گھر اور اس کے طریقوں کو سمجھنے والی۔ مروت اخلاص سے گندھی۔“

اور باہر کھڑی ہانیہ کو دھوکا لگا۔ یہ کب ہوا تھا.....؟ کس وقت.....؟ چائے کا گمگ توڑے میں رکھے رکھے کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کا وجود بھی سرد پڑنے لگا۔ اندر موجود وجدان کے لیے بھی یہ بات غیر متوقع تھی وہ ایک دم استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

”خوب۔ بہت خوب۔ یعنی وہی روایتی حر۔ روایتی کہانی۔ بچپن سے طے کردہ بات۔ لڑکا لڑکی کو خبر بھی نہیں..... اور سب کچھ آپس میں طے کر لیا گیا..... آپ کس زمانے میں جی رہی ہیں امی.....؟ میں آپ کی اولاد ہوں۔ آپ میری چوائسز، میری ترجیحات سے واقف ہیں۔

کیا آپ کو کبھی محسوس بھی ہوا کہ مجھے یہ گھر بیلا ماسی ٹائپ کی لڑکیاں پسند ہیں۔ جن کی ساری عمر بچن اور گھر بیلا سیاستوں میں ہی گزر جاتی ہے۔ نہ کوئی سیکس نہ ہی زمانے کے چلن سے آشنا۔ گنوار کزن ٹائپ کے پیدہ شے.....“

باہرستی ہانیہ کے گال اہانت کے احساس سے جل اٹھے۔ اگر وہ لاعلم تھا تو بے خبر وہ بھی تھی۔ اسے یہ حق کس نے دیا تھا کہ وہ کسی بھی لڑکی کے لیے ایسے الفاظ، جملے استعمال کرے۔

”مگر امی اب لگتا ہے آپ یہ سب صرف ضد میں کر رہی ہیں۔ سونیا آئی کی ضد میں۔“ اس کا انداز۔ اس کے سکین الفاظ جہاں آرا کو لگا جیسے کوئی

آری لے کر ان کا دل چیر رہا ہو۔ وہ جتنا بے یقین تھا اس سے بڑھ کر بدگمان بھی تھا۔

”غلط سمجھ رہے ہو وجدان..... کیا میں تمہیں ایسی لگتی ہوں۔“ کسی آس، کیسا مان تھا ان کے ڈوبتے لہجے میں۔

”کاش کہ میں سونیا آئی کی الفاظ کو جھٹلا سکتا۔ مجھے کتنی شدید خواہش تھی کہ وہ سب جھوٹ ہو جو انہوں نے کہا۔ مگر اب مجھے یقین ہونے لگا ہے۔“ اس کے لہجے میں چھین چھی جیسے قبول کرنا مشکل ہو۔

”انہوں نے سچ کہا تھا کہ آپ میری شادی بھی بھی غزل سے نہیں ہونے دیں گی۔ آپ غاصب تھیں۔ آپ نے ان کا حق چھین کر ان کی محبت کو ان سے دور کر دیا تھا۔ آپ نے سازشیں کیں۔“ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ ان کا اپنا خون..... ان کی اولاد..... جہاں آرا سفید لٹھے کی مانند چہرہ لیے ساکت نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھیں اور باہر کھڑی ہانیہ کا بس نہیں چل رہا تھا اندر جا کر اس کے ہونٹ سی دے۔ اسے جب کروادے۔

”مگر اس بار نہیں۔ غزل پہلے میری چاہت تھی اب ضد ہے۔ میں وہی کروں گا جس میں میری خوشی ہوگی اور مجھے امید ہے کہ آپ اپنی اولاد کے لیے کم سے کم کوئی پھندا۔ کوئی سازش تیار نہیں کریں گی۔ اس بار تو نہیں.....“

وہ قدرے سرد مہری سے کہتا تیزی سے نکل گیا ہانیہ نے تیر کی طرح اپنے قریب سے گزرتے اس بے حس انسان کو دیکھا۔ جہاں آرا کا سر جیسے پھٹا جا رہا تھا۔ دماغ میں ہوتے شور نے ان کی قوت گویائی جیسے سلب کر لی تھی۔

”وجدان.....“ بے آواز ہونٹ بے مکر وہ شاید ان کی صدا سے بے نیاز جا چکا تھا۔

ہر طرف چھائے اندھیرے میں انہیں وہی طبع دمہریان چہرہ نظر آیا۔ ہانیہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی تھی۔ ان کی خطرناک حد تک سفید بڑی رنگت خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔ پلٹ کر بھاگی۔ چچی کو

جگایا پھر دروازہ کھول کر ٹیکسی لینے نکلی۔ وقت نہیں تھا کہ کسی کا انتظار کیا جاتا جو کرنا تھا خود کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ رات گئے گھر آیا تو غیر معمولی خاموشی تھی۔ نہ ہی حتان کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں نہ ہی لڑکیوں میں کوئی کچن میں تھا۔ ورنہ عام طور پر بارہ ساڑھے بارہ تک بھی آدھے جاگتے اور ٹھکتے ملتے۔ اس نے کمرے میں آ کر تھکے تھکے انداز میں کف کے بن کھولے۔ پھر بیڈ پر گر سا گیا۔ دوپہر سے یہ وقت ہونے کو آیا تھا وہ آوارہ گردی کر رہا تھا۔ امی سے یہ سب کہہ کر وہ بھی خوش نہیں تھا مگر اس بار وہ اپنی خواہش میں کسی کو ٹھل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ موبائل بھی اس نے آف کر رکھا تھا۔ وہ کسی سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ساری دنیا سے خفا۔ سب سے رابطہ منقطع کیے وہ نہ جانے کس کو سزا دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

ریحان بھائی پہلے بچے تھے سو سب کے لاڈلے ٹھہرے۔ جہاں آرا جب بیاہ کر آئیں تو دادی جان دادا جان دونوں زندہ تھے۔ وہ نہ صرف سر تھے بلکہ سکے تیا بھی تھے۔ گھر کی بڑی بہو ہونے کے ناتے ان پر ذمہ داری زیادہ تھی یا انہوں نے خود بخود فرض کر لیا کہ انہیں سارے گھر کا بوجھ اٹھانا ہے مگر جو بھی تھا ہمیشہ انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا حالانکہ بعد میں رفعت تائی بھی بیاہ کر آ گئیں۔ وہ ان کی پھوپھی زاد تھیں۔ دونوں کا آپس میں سلوک اور یگانگت مثالی بن گیا۔

حسنہ آپی اور تانیہ آپی کی پیدائش آگے پیچھے تھوڑے وقت سے ہوئی تھیں۔ تانیہ آپی جہاں آرا کی گود میں ہی ملیں۔ جن دنوں جہاں آرا امید سے تھیں تو دادی شدید بیمار پڑ گئیں۔ وہ ساس کی خدمت میں دن رات جتی رہتیں۔ حسنہ آپی کو رفعت تائی ہی سنبھالتی تھیں دادی جہاں آرا کے علاوہ کسی کے ساتھ بھی مطمئن نہ رہتیں۔ انہی مشقت بھرے دنوں میں وجدان کی پیدائش ہوئی اور ابھی وہ سال بھر کا بھی نہیں

ہوا تھا کہ دادی چل بسیں۔ ریحان بھائی جو چونکہ اس سے پانچ سال اور حسنہ آپی چار سال بڑی تھیں لہذا سب سے زیادہ نظر انداز وہ ہوا۔

ساس کی بیماری۔ ان کی خدمت۔ پھر ان کا انتقال۔ گھر کی ذمہ داریاں۔ لوگوں کی تعزیت کے لیے آنا جانا۔ وہ سال بھر کا بچہ بھی ایک کی گود میں روتا رہتا تو بھی دوسرے کی گود میں..... اور یہ ایک حقیقت تھی کہ وجدان نے بھی امی کو فارغ نہ دیکھا تھا۔ جس توجہ جس چاہت کی اسے خواہش اور طلب ہمیشہ رہی تھی وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔

جہاں آرا چونکہ گھر کی بڑی بہو تھیں پھر بھرا پر گھر تھا لہذا دادی ان پر ایک ایک کر کے ساری ذمہ داریاں ڈالتی چلی گئیں اور جہاں آرا زبان سے اف کہے بغیر بخوشی انہیں اٹھاتی رہیں۔ بعد میں رفعت تائی بھی آ گئیں مگر جتنا بھروسہ واعتماد انہیں جہاں آرا پر تھا کسی اور پر بھی نہ ہو سکا۔ یہی وجہ تھی کہ ننھا وجدان ان کی پوری توجہ حاصل نہ کر سکا۔ سر، کنوارے دیورنڈ سب پر ہی طور پر ان کے ذمے تھے کہ گھر میں کام والیاں آئی تھیں، مگر ان کی نگرانی بھی ان دنوں وہی کرتی تھیں کہ سائر کی پیدائش پر رفعت کو شدید قسم کا یرقان ہو گیا۔ ان کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ کئی ہفتہ اسپتال میں رہیں، اس دوران ننھا سائر وجدان کی جگہ لے گیا۔ جہاں آرا اس کا بھرپور خیال رکھتیں۔

ایسے میں جب، دادا جان نے اس کا یہ حشر دیکھا تو سارا سارا دن اسے اپنے ساتھ رکھنے لگے۔ چار ماہ کی طویل علالت کے بعد، رفعت تائی صحت مند ہونے لگیں مگر سائر جوان سے مانوس ہو گیا تھا اب وہ رفعت کے پاس کم ہی ٹکتا اور جہاں آرا کی گود کے لیے رونے لگتا۔ اسی ماحول میں وہ بڑھتا گیا۔ یہ نہیں تھا کہ جہاں آرا کو اس سے محبت نہیں تھی بس وہ اتنی بھرپور توجہ اسے نہ دے سکیں، نہ کھل کر پیار کا اظہار کیا وہ ذمہ داریوں میں اس قدر پھنسی تھیں کہ ابتدائی چند سال تو وجدان ان کے پاس زیادہ رہا ہی نہیں۔ دادی کے بعد دادا جان کو شہ نشین ہو گئے اور گھر

کی کرتا دھرتا اب جہاں آرائیں۔ مگر کا کوئی فرد حتیٰ کہ ان کے سر بھی ان سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ وہ چار سال کا تھا۔ اب اسکول جاتا تھا اور دادا جان کی شفقت و توجہ نے انہیں مزید بے نیاز کر دیا۔ بیا ان کی گود میں آچکی تھی۔ دادا جان اس کی پڑھائی میں مدد بھی کر دیتے۔ وہ ان ہی کے کمرے میں رہتا مگر ماں کی چاہت توجہ حاصل کرنے کی چاہ اس کے اندر اب بھی تھی، مگر انہیں سارا دن مصروف دیکھ کر وہ دل مسوس کر رہ جاتا اور ایسے ہی کرتے کرتے وہ اپنے خول میں چھپ گیا۔

وہ کسی بہن بھائی سے بھی قریب نہ ہوسکا۔ ایک نامحسوس فاصلہ ان کے درمیان آنے لگا۔ اس کے دل میں گلے شکوے بڑھنے لگے۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں زبردستی اپنے پاس بٹھائے پھر ان کی گود میں سر رکھ کر لاڈ اٹھوائے۔ کوئی ان کے درمیان نہ آ سکے مگر وہ ایسا کچھ نہ کر سکا۔

خوب صورت چہرہ، مہربان دل والی جہاں آرا۔ وجدان مصطفیٰ کی نفسیات سمجھ نہ سکیں۔ جب دادا جان بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے، اس وقت وہ صحیح معنوں میں اکیلا ہو گیا۔ باہر لوگوں کی بھیڑ تھی۔ سارا خاندان جمع تھا۔ ان کی میت کو قبرستان لے جایا جانے لگا۔ ہر طرف شور آ رہا تھا۔ اور وہ ان سے چھپ کر اسٹور روم میں بستر میں گھسا کانوں پر ہاتھ رکھے گھٹے گھٹے انداز میں رو رہا تھا۔

”کاش..... آپ مجھے ڈھونڈتی ہوئی آجائیں۔ مجھے سننے سے لگا نہیں۔ ماں..... کہاں ہو تم آج آج تو مجھے بھی ایک نظر بھر کے دیکھ لو اپنی باہوں میں چھپا لو..... میں بہت ٹوٹ رہا ہوں..... میرا دل..... یہ بہت درد کر رہا ہے، مجھے تمہاری ضرورت ہے..... ماں.....“

وہ شدت سے انہیں پکار رہا تھا۔ ان لمحات میں ان سے سارے گلے شکوے دھول بن کر فضا میں بکھر گئے تھے۔ اسے بس ان کی طلب تھی، وہ چودہ سالہ کمزور سا لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا مگر جہاں آرا

اس دن بھی نہ آ سکیں۔

وہ روتے روتے یونہی غنودگی میں چلا گیا تھا جب ملازمہ زائد بستر لکانے اسٹور روم میں آئی۔ بستر چھینچتے ہوئے وہ لڑھک کر نیچے گر پڑا۔ ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی اس نے نیچے پڑی گھٹری کو دیکھا تو وہ وجدان تھا۔ بخار سے اس کا سارا جسم تپ رہا تھا۔ غنودگی، بھبھوکا چہرہ لیے وہ نجانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ وہ بھاگ کر جہاں آرا کو بلالائی جو نجانے کب سے اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ صدمے سے بت بنی رہ گئیں۔ پھر اس دن رات گئے ریحان، ابو اور حسنہ آپا سب اس کے پاس رہے۔ وہ دادا جان سے کتنا قریب تھا سب ہی جانتے تھے۔

مصطفیٰ صاحب دکھ، تاسف سے نڈھال بیٹھے تھے۔ انہوں نے تھوڑی دیر پہلے ریحان کو کتنا ڈانٹا تھا جسے بھائی کی خبر تک نہ تھی کہ وہ کہاں ہے..... ریحان سر جھکائے سنتا رہا۔ وہ واقعی قصور وار تھا۔ اسے خبر رکھنی چاہیے تھی۔ جہاں آرا دو ہرے صدمے سے بے حال سوچی آنکھیں لیے اس کے سر ہانے بیٹھی رہیں۔ مدہوشی کے عالم میں اسے اپنے قریب سے وہ نرم ممتا کی خوشبو محسوس ہوتی رہی مگر جب اسے مکمل ہوش آیا تو تاریک کمرے میں وہ اکیلا تھا۔ حسنہ آپا کا وچ پر سر کیے سو رہی تھیں۔ اس نے اس پاس نظر دوڑائی وہ میٹھی خوشبو کہیں نہیں تھی..... اس کا دل بے ساختہ شکوہ کناں ہوا۔

”ای! آپ اس حالت میں بھی میرے پاس نہیں۔“

اس بات سے بے خبر کہ جہاں آرا کی ساری رات ہی آنکھوں میں کٹی گئی اور وہ آدھے گھٹے پہلے ہی اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں۔ یہ بے خبری و بدگمانی آنے والے چند سالوں میں عجیب سی بے نیازی میں بدلتی گئی۔ وہ ٹھیک ہو گیا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہو گیا۔ جہاں آرا اس واقعے کے بعد سے اس کا خیال رکھنے کی بھرپور کوشش کرتی، مگر اب اسے ان کی توجہ و محبت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اسٹور

روم میں ہچکچوں سے روتا وہ لڑکا جیسے اس سیاہ رات میں ہی کہیں کھو گیا تھا۔ اب جو تھا وہ کوئی اور تھا۔ اس کے اندر ہلکی ہلکی برف جننے کا عمل شروع ہو چکا تھا اور اسے خبر بھی نہ ہونے پائی کہ کب وہ بدلتا گیا۔

وہ اپنے اکلوتے دوست، حمزہ کے گھر شوق سے جاتا تھا۔ اس کی کیٹرنگ ان کے گھر کا پرسکون ماحول اور اس کی اپنے والدین کے ساتھ مضبوط بوڈنگ۔ اسے بہت اثریٹ کرتی تھی اور وہ حیرت سے سوچتا کہ والدین ایسے بھی ہوتے ہی۔ خصوصاً مائیں اتنی کلوز بھی ہو سکتی ہیں۔ اب وہ اس کے گھر جانے سے بھی احتراز کرنے لگا۔ اسے ایک ان دیکھی جلن سی ہونے لگی تھی۔ اس کی خوش نصیبی اسے چھپتی اسے یہ سب میسر نہ تھا۔ یہ جلن یہ چھپن اسے حمزہ سے دور لے گئی۔ اس کے سر دروپیے کی وجہ حمزہ جان نہ پایا۔ اس کی حد درجہ بڑھی حساسیت کو کوئی سمجھ نہ پایا۔

ریحان بھائی من موچی ٹائپ انسان تھے۔ ایک سائر تھا۔ جو زبردستی اس کے گرد تے حصار میں محسوس آتا اور وہ چاہ کر بھی اس سے زیادہ دیر لا تعلق نہ رہ پاتا۔ اور اب امی ایسے پھر سے ایک ان چاہے ماحول کا حصہ بنانا چاہ رہی تھیں۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔

صبح وہ بھاری ہوتے سر کے ساتھ آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا جب سائر بے دھڑک اندر چلا آیا۔ اس وقت اس کا دل کسی سے بھی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ سائر سامنے کھڑا اسے گھورتا گیا۔ کیبنٹ بند کرنا وہ اسے نظر انداز کیے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”جان سکتا ہوں کہ تم کل کہاں تھے؟“ اس کا چہرہ اتنا انداز وہ اسی خاموشی سے موزے پہننے لگا۔

”موبائل بھی تمہارا آف ہے۔ ایسے کون سے کونے میں تھے تم یا ایسی کون سی انوکھی میٹنگ کر رہے تھے تم کہ سب کچھ بند کیے غائب تھے.....؟“ اس کی سر دروہری، لا تعلق کو نظر انداز کیے وہ اسے لٹا رہا تھا۔

”گھر میں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ کیسی ہی

ایمر جنسی آپڑے۔ تمہیں فرق نہیں پڑتا۔ جانتا ہوں میں کہ تمہیں کسی کی پروا نہیں مگر کیا تائی جان بھی اسی ”غیریت“ کے زمرے میں آتی ہیں؟“ وہ ایک لمحے کو ٹھٹکا تھا۔ ”کل کتنی کالز کیں تمہیں..... مگر ہر بار نمبر بند ملتا تھا۔ جانتے ہو کہ ہانیہ اکیلی اسپتال لے کر گئی تھیں تائی جان کو۔“ اس کا پرفیوم چھڑکتا ہاتھ رکا۔ تیزی سے مڑ کر اس نے پوچھا۔

”کیا مطلب.....؟ کیا ہوا امی کو.....؟“

”بی بی شوٹ کر گیا تھا ان کا۔ گھر پر سوائے چچی اور ہانیہ کے کوئی نہیں تھا۔ وہ ہی انہیں ٹیکسی میں لے کر گئیں۔ ریحان بھائی کام کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی تھے۔ انہوں نے ہی مجھے فون کر کے ہاسپٹل پہنچے کو کہا۔ تایا ابو خود شوگر کے مریض ہیں۔ میں ابا کو بتا کر وہاں پہنچا راستے میں تمہیں کئی بار فون کیے مگر ہر بار فون نمبر پاؤرڈ آف تھا۔“

”امی اب کہاں ہیں.....؟“ اس نے درشتی سے اس کی بات کاٹی۔

”ابھی ہاسپٹل سے لائے ہیں۔ ساری رات انڈر آبزرویشن رکھا تھا۔ بی بی ان کا کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔“ وجدان کی حالت دیکھتے نرم لہجے میں بتانے لگا۔

”ڈاکٹرز نے برین ہیمرج کا خدشہ ظاہر کر دیا تھا۔ شکر ہے کہ وہ ٹل گیا۔ میں امی اور ہانیہ تھے ہاسپٹل میں۔ پھر ریحان بھائی آ گئے۔“ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ دل میں ان سے ہزار گلے شکوے سہی مگر محبت تو وہ آج بھی ان سے کرتا تھا حد سے زیادہ، اسے شاید کھڑے دیکھ کر سائر نے نرمی سے اس کے کندھے کو تپتایا۔

”اب بہتر ہیں تائی جان، اپنے کمرے میں۔“ اس کے اعصاب اب بھی تے ہوئے تھے وہ تیزی سے کمرے سے نکلنے لگا۔

”وجدان.....! تایا ابو تمہاری غیر ذمہ داری کی وجہ سے بہت غصے میں ہیں۔ بہتر ہے تم ابھی نہ جاؤ.....“ مگر وہ ان سنی کرنا چلا گیا۔

ای کے کمرے کے دروازے پر اس کے قدم
ست پڑ گئے۔ سینے تک کھل اوڑھے ان کا وجود
ساکت تھا۔ ایک ہی رات میں ان کا سفید چہرہ کیسے
زرد ہو گیا تھا۔ مطلقاً صاحب رانگ چیر پر گرم چادر
اوڑھے بیٹھے تھے۔ نگاہیں جہاں آرا کے چہرے پر
تھیں۔ آہٹ پر گردن موڑ کر دیکھا۔ وجدان
دروازے میں کھڑا ایک ٹک ماں کے ٹڈ حال وجود کو
دیکھے جا رہا تھا۔

”اب بھی نہ آتے صاحب زادے ابھی تو
سائیس چل رہی ہیں اس کی۔“ ان کا برہم انداز
خاموش فضا میں گونجا۔ وہ سخت ناراض نظر آ رہے
تھے۔

”بہتر ہوگا وہیں چلے جاؤ۔ جہاں کل سے
غائب تھے۔ ادھر ہی رہو۔“ اس نے کچھ کہنے کو لب
کھولے پھر بھیج کر ایک نظر ان پر ڈالتا تیزی سے مڑ
گیا۔ اندر موجود گلٹ کہ ماں اس کی وجہ سے اس
حالت کو پہنچی ہے۔ لحوں میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

ہانیہ، بیا اور بھابھی مل کر سارا سامان سیٹ کر رہی
تھیں۔ رمضان قریب تھا اور حسب روایت عیدی
ابھی سے جانی تھی۔ جہاں آرا اب قدرے بہتر تھیں
پر وہ بہت چپ چپ رہنے لگی تھیں۔ اس دن کیا ہوا
تھا؟ اس بارے میں انہوں نے ایک لفظ بھی ہونٹوں
سے نہیں نکالا تھا۔ ہانیہ بھی لیوں پر قفل لگائے ان کا
بھرم رکھ رہی تھی۔ حسہ اور تانیہ ان کی عیادت کر گئی
تھیں، پھر بھی حسہ آپی کا روزی فون آ جاتا۔ وہ ماں
کے لیے بہت فکر مند تھیں۔

حقیقت کا علم صرف ہانیہ کو تھا۔ وہ اپنی طرف سے
سارا دن ان کا دھیان پٹانے کی کوشش کرتی۔ اسے
زندگی میں کئی بار اسے وجدان سے عجیب سی بے زاری
محسوس ہوئی۔ اس پر غصہ تھا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ تانیا
ابو کو بتادے مگر تانیہ جان کے بھرم میں سوچ میں
پڑ جاتی جو اسے مجبور کر رہی تھی کہ اگر وجدان کی نظر
میں وہ عام سی لڑکی تھی تو اسے اپنے عام ہونے پر فخر

تھا۔ وہ اس جیسی ”خاص“ تھی نہ ہی بننا چاہتی تھی۔ جو
اپنے سے جڑے رشتوں کو بوجھ تصور کرتا تھا۔ جس
کے سخت الفاظ اس کو ہرٹ کر دیتے تھے۔ جس کی
اکٹائی نظریں بے زار رویے دوسروں کو تکلیف دیتے
تھے۔

وجدان اس دوران جتنی بار بھی جہاں آرا کے
باس آیا وہ اسے نظر انداز کر لیں۔ انہیں یہ علم کھین کی
طرح کھا رہا تھا کہ ان کی اپنی اولاد انہیں غائب سمجھتی
ہے۔ انہوں نے ساری زندگی اپنی خواہشوں کو نظر
انداز کر کے فرائض نبھانے میں گزار دی کہ ان کی
ذات سے کسی کو دکھ نہ پہنچے۔ لمحہ بھر میں ان کی ساری
ریاضتیں خاک ہو گئیں۔ انہوں نے وجدان سے کہہ
دیا۔

”جو تمہاری خوشی ہے تم وہی کرو۔ مجھے بتاؤ کب
رشتہ لے کر جانا ہے۔“ اور وہ ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔
نیچے اترتا تو ہال کمرے میں رونق لگی ہوئی تھی۔ سائرس
تھاے بھانت بھانت کی ہدایات سمجھنے کی کوشش کر رہا
تھا۔

”پلیز معزز خواتین..... آپ سے التماس ہے
کہ سب ایک ہی وقت میں نہ بولیں میری سماعتوں
تک یہ جملے پہنچنے تک کچھ سے کچھ بنتے جا رہے ہیں۔
جیسے ابھی مجھے لگا کہ فرمایا گیا ہے کہ آپی کو ریحان کے
پیلے دانت پسند ہیں۔ کالا چہرہ کر کے آنا.....“ اس
بات پر سب چیخ اٹھیں۔

”میں نے کہا تھا کہ آپی کو پیلا شاہ پر میری طرف
سے دینا۔“ مونا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”اور میں نے کہا تھا کہ ریحان کے دانت
میں درد ہے۔ میڈیسن لا دو.....“ بھابھی نے بھی جواباً
آنکھیں دکھائیں۔ بیا اور ہانیہ مسکرائیں۔

”تو پسند اور کالا منہ کس کے جملے میں تھا۔“ اس
نے دہائی دی۔

”وہ میں تھی بیٹا جی..... یہ ہیزے ہیں تانیہ کو
بہت پسند ہیں۔“ چاچی نے اس نے کان کھینچے۔
”اور کالا سوٹ اور منہ پر لگانے والا کمر کا ایشن

بھی میں نے کہا تھا۔“ زور بڑھا۔

”اف۔ چھوڑ دیں میرا کان۔ چاچو پر آزمانے والے کر آپ مجھے محسوس پر تو مت آزمائیں۔“

”میں بھلا اپنے میاں کے کان کیوں کھینچنے لگی.....؟ وہ کوئی تمہاری طرح تھوڑی ہیں۔“

”اچھا..... تو ہر وقت ان کی شکایتیں کون کرتا ہے۔ یقیناً انہیں مناسمجھ کر کان بھی مروڑتی ہوں گی۔“

وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ چچی ”نیور ماسٹڈ“ کانوں سائن چہرے پر سجائے بے نیازی سے مسکرائیں۔

”بیٹا تم اپنی خیر مناد..... بیا بہت اچھی ٹیچر ہے۔“ بھابھی نے شوخی سے آنکھیں نیچائیں۔ ان کے بچوں کو اکثر وہ پڑھاتی تھی۔

”ہمیں تو حسرت ہی رہی کہ کبھی کوئی ہمیں پڑھ سکے۔“ اس کا انداز اگرچہ حسرت آمیز تھا مگر آنکھوں میں ناچتی شرارت۔ بیا جھینپ گئی۔ سب اب اس کا مذاق اڑانے لگیں۔ مگر وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا

مسکرائے جارہا تھا۔ وہ دوبارہ ہال میں گاڑی کی چابی لینے آیا۔ اس کی گاڑی اشارٹ نہیں ہو رہی تھی۔

”ارے آئیے آئیے جناب وجدان مصطفیٰ صاحب! اس کار خیر میں آپ بھی حصہ لیں۔“ اس کی بات نظر انداز کرتا گاڑی کی چابی مانگنے لگا۔ اسے دیکھ کر ہانیہ کے اندر عجیب سی ناگواری اٹھی تھی وہ سر جھکا کر سارا سامان اکٹھا کرنے لگی۔

”گاڑی تو میں لے کر جا رہا ہوں..... آپوں کی عیدی اور تہوار دینے جانا ہے۔“ سائر نے سامنے رکھے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

”تم ٹیکسی کر لینا۔ مجھے ایک جگہ ضروری پہنچنا ہے۔“ اس کا انداز بہت لیے دیے تھا۔

”تو ٹیکسی تم کر لو نا۔ اتنا زیادہ سامان ہے۔ وہ کیسے ٹیکسی میں بیٹھ ہو سکے گا۔“ بھابی نے تو مناسب بات ہی کی تھی مگر جس طرح وجدان نے جواب دیا وہ

سب ایک لمحے کو چپ رہ گئے۔

”میں آپ سے بات نہیں کر رہا۔ سائر اچابی دے رہے ہو یا نہیں.....؟“

غزل اپنی نئی جاب کی وجہ سے بہت خوش تھی۔ اسی خوشی میں اس نے ڈنر دیا تھا۔ ڈنر کے بعد وجدان نے پوچھ لیا کہ وہ کب گھر والوں کو لائے۔ وہ دلکشی

اور سائر کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہانیہ نے سر اٹھا کر اسے بہت اعتماد سے دیکھا۔

”سوری..... سائر کے ساتھ میں بھی جا رہی ہوں اور پھر ہمیں مارکیٹ بھی جانا ہے۔ آپ کیب کروالیں۔“ اس کا اٹھا ہوا سر اور آنکھوں میں سرد مہری وہ چونکا، سب ہانیہ کو دیکھنے لگے۔ سائر بھی حیران تھا کہ یہ پروگرام کب بنا.....؟

”اوکے..... ویل.....“ ایک سلتی نظر اس پر ڈالتا وہ تیزی سے چلا گیا۔

”کون سی مارکیٹ جانا ہے میرے ساتھ؟“ سائر نے اس کے جانے کے بعد ہانیہ کو گھورا۔

”کسی بھی نہیں..... چلیں آپ کھیلیں۔ سامان سب سیٹ ہو گیا ہے۔“ وہ بڑے نارمل انداز میں بولی۔

”تو پھر اس سے جھوٹ کیوں بولا؟“ سائر متاسف ہوا۔ وجدان کے رویے کے پیچھے پتی سلتی محرومیاں وہ کب کی کھوج چکا تھا۔ اور اس کی خبر وجدان کو بھی نہ ہو سکی تھی۔

”انہوں نے بھابھی سے کتنے برے طریقے سے بات کی.....“

”اس اوکے ہانی.....!“ وہ پھیکے انداز میں مسکرائیں چچی کو بھی اس کا انداز نہیں بھایا تھا۔

”ہر بات میں اوکے نہیں کہتے بھابھی۔ خود کو ویلو دیں گی تو دوسرے بھی آپ کی قدر کریں گے۔ پھر آپ ہمارے گھر کی عزت ہیں سو انہیں بھی سیکھنا چاہیے کہ عزت کو عزت کیسے دیتے ہیں۔“

اس کے تیور سب کو چونکا رہے تھے، سنجیدگی سے بولتی وہ آخر میں قدرے رنجیدہ ہو گئی۔ بیا بھی وجدان کی وجہ سے شرمندہ تھی مگر جس کو احساس ہونا چاہیے تھا وہ ویسا ہی تھا بے حس اور کرخت.....

☆☆☆

غزل اپنی نئی جاب کی وجہ سے بہت خوش تھی۔ اسی خوشی میں اس نے ڈنر دیا تھا۔ ڈنر کے بعد وجدان نے پوچھ لیا کہ وہ کب گھر والوں کو لائے۔ وہ دلکشی

سے مسکرائی۔ اولیو گرین لانگ شرٹ اور میرون کپری کے ساتھ اس نے میرون بیک اور میرون ہیلز پہن رکھی تھیں۔ ہیزل لینس لگائے اس کا ہیز کٹ بھی بدل چکا تھا۔ وہ اس وقت مرکز نگاہ تھی ہمیشہ کی طرح۔

”تم جب چاہے انہیں لاسکتے ہو۔“ ایک من پسند زندگی سامنے تھی مگر وہ اندر سے پوری طرح خوش نہیں تھا۔ جہاں آرا کی گہری جیب اس کے اندر دراڑ ڈال رہی تھی۔ ”ویسے تمہاری ٹیلی کو میرے کیریئر پر اعتراض تو نہیں ہوگا.....؟“ وہ جانتا تھا کہ اپنے کیریئر کو لے کر وہ کتنی سنجیدہ تھی۔

”نہیں..... اگر انہیں ہوا بھی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اور وہ سر جھٹک کر ادا سے بولی۔

”تم کیا ان سے الگ رہو گے۔ یعنی ہم دونوں.....“ اس کا سوال بہت اہم تھا۔ ایک لمحے کو وہ کچھ بول نہ سکا۔ اس سچ پر تو اس نے سوچا نہیں تھا۔ بالوں کی لٹ کو انگلی پر لپیٹے وہ اسے منتظر نظروں سے دیکھنے لگی۔

”اگر مشکلات بڑھیں تو علیحدہ ہو جاؤں گا۔“ وہ ٹھک کر رک گئی۔ وہ آنکھیں سکوڑے جا چکی نظروں سے اسے دیکھنے لگی پھر نجانے کیا ہوا کہ بے ساختہ ہنس دی۔ وہ اس کی یہ بے وجہ ہنسی سمجھ نہ پایا۔

”اوہ گاڈ..... ہاؤ لگی آئی ایم..... یعنی تم میری خاطر انہیں بھی چھوڑ سکتے ہو۔ کانٹ بلیواٹ۔ بٹ الیچو ٹیلی اٹ از ٹرو۔“ وہ ذرا کی پھر اسے دیکھا۔

”اتنی محبت کرتے ہو تم مجھ سے؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھتی اس نے اچانک پوچھا اور ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ فوراً اقرار کر لیتا مگر لفظ محبت پر اس کے اندر اچانک درد آہو سناٹا ایسے بھی چونکا گیا۔ یہ خالی پن کیوں تھا۔ کیا یہ محبت تھی؟ چاہت تھی یا ضد..... یا اس کے اندر کتنی حسرتیں۔ اسے جواب نہ مل سکا۔ غزل اب تک منتظر تھی، ایک گہری سانس اندر دہاتے اس نے پوچھا۔ ”تم نہیں کرتیں کیا؟“ دل کو تصدیق کے لیے سامنے والے کا جواب چاہیے تھا۔

”ہوں..... محبت نہیں۔ یہ پسند ہے۔ ہاں۔ میں تمہیں پسند ضرور کرتی ہوں۔“

اس کا جواب ایمان داری پر مبنی تھا۔ بغیر کسی لاگ لپٹ کے یہ جواب وجدان کو نجانے کیوں پر سکون کر گیا۔

☆☆☆

رمضان کی چونکا۔ آمد آمد تھی تو اس بار رفعت ہی ساری تیاری کروا رہی تھیں۔ ان کے ہاں رمضان میں ہر چیز کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ چاندی اپنی چھوٹی بہنوں کو بھی لے آئی تھی۔ لڑکیاں بھی ان کے ساتھ مل کر سارے کام پنتا رہی تھیں۔ طرح طرح کی گھریلو چٹنیاں۔ مربے۔ رول اور کباب بنا کر رکھے جارہے تھے۔ جہاں آرا نے اس بار کسی چیز میں حصہ نہیں لیا۔ اور ان کی صحت کے پیش نظر کسی نے اتنا محسوس بھی نہیں کیا تھا مگر ہانیہ انہیں زبردستی باہر صیٹ لائی۔ انہیں اکیلا چھوڑ دینے کا مطلب ان کے ڈپریشن میں اضافہ کرنا تھا۔ حالانکہ رفعت نے ڈانٹا بھی کہ انہیں آرام کرنے دے مگر وہ بتانہ سکی کہ بجائے آرام کے وہ اندر ہی اندر زہریلی سوچوں میں الجھی رہتی ہیں۔ اس کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔

وہ ادھر آ کر بہل گئیں۔ پھر ان کے مشوروں سے ساری تیاری ہوئی۔ گھر میں چونکہ بچے بھی تھے تو ان کے لیے بھی علیحدہ سے ضرور اہتمام ہوتا تھا اور گھر کی بنی فریز کرنے والی چیزیں بھی زیادہ مقدار میں بنتی تھیں۔ ہانیہ انہیں بہت اہمیت دے رہی تھی جس عورت نے ساری زندگی ایسا زور بانی کی نذر کی، محبتیں ہانٹیں، اب انہیں بھی یہ احساس دلانا بہت ضروری تھا کہ یہ یکین بھی انہیں اتنا ہی چاہتے ہیں۔ اتنا ہی اہم سمجھتے ہیں، جتنا ان کا حق ہے۔ ان کی قربانیاں ہیں۔

پھر لی سے کام کر لی۔ چہرے پر ازلی مسکراہٹ سجائے ہانیہ کو جہاں آرا ایک ٹک دیکھے جارہی تھیں۔ رمضان کا اعلان ہوا اور وہ نماز کے بعد ذکر میں مصروف تھیں۔ ہانیہ چائے کا کپ سائیڈ پر رکھ کر جانے لگی تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

ہانیہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔

انہوں اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

”تم سب جانتی ہونا.....“ نہ ہی تمہید نہ کوئی استفسار۔ انہوں نے جس یقین سے کہا تھا وہ انکار چاہ کر بھی نہ کر سکی۔ آہستگی سے سر ہلا دیا۔

”آپ فکر مت کریں تانی جان۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔“

اس کے یقین دلانے پر وہ ہسکا سا مسکرائیں۔

”جانتی ہوں۔ مگر اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے اس حقیقت کو مان لیا ہے کہ وجدان کی محبت میں میرا حصہ اتنا نہیں کہ اس کے فیصلوں کے دائرے تک جانا ہو جب بے یقینی ختم ہو جائے۔ خوش گمانی کا پرندہ اڑ جائے تو حقیقت سے سمجھوتا کرنا آسان ہو جاتا ہے، مشکل سے ہی سہی مگر میں نے اپنی حیثیت کا تعین کر لیا ہے۔ سو احساس بھی کم ہو رہا ہے۔“

الفاظ کے برعکس ان کی آنکھوں میں نمی سارا بول کھول رہی تھی۔ اس نے بے ساختہ جھک کر ان کے ہاتھوں کو چوما۔

”آپ کی حقیقت اور اہمیت کیا ہے اور کتنی ہے یہ کوئی ہمدانی دلا کے کمینوں سے پوچھے۔“

آپ نے ساری زندگی سب کے حقوق کا خیال رکھا سبھی کسی کا برا نہ چاہا، نہ کسی کے ساتھ برا کیا۔ آپ جیسے لوگ تو نایاب ہوتے ہیں تانی امی۔ آپ کے صاف دل کا عکس تو آپ کے چہرے پر نور کے ہالے کی طرح جگمگاتا ہے پھر آپ کیوں ایسا سوچ رہی ہیں۔“

”وجدان..... وہ تو مجھے غاصب سمجھتا ہے۔“

تکلیف سے جملہ ادا کرتے ایک آنسو آخر کار ضبط کی حد بندی توڑ کر لڑھک آیا۔

”انہیں بھی حقیقت کا جلد ادراک ہو جائے گا۔ وہ لوٹ آئیں گے معافی کے طلب گار بن کر۔“ اس کا حوصلہ ان کی ڈھارس بن گیا۔ اس کے سادا پروقار چہرے کو بغور دیکھتے، انہوں نے نجانے کیسا سوال

پوچھ لیا۔

”کیا تم اسے قبول کر لو گی؟ میرے کہنے پر.....“

سوال تھا یا ایک پہاڑ جسے سر کرنا آسان نہ تھا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں۔ کیا مانگنا چاہ رہی تھیں۔ کیسی خواہش کر رہی تھیں؟ ان آنکھوں میں ڈولتی امید کی ڈور اس کی طویل خاموشی سے ڈگمگانے لگی۔ کسی کا مان رکھنا کیسی آزمائش میں دھکیل دیتا ہے اس کا مثبت جواب ان کو زندہ کر سکتا ہے۔ فیصلہ صحن تھا۔

”آپ کی خوشی کی خاطر تانی جان..... صرف آپ کی خاطر.....“ گہری یاسیت زدہ سانس کو سینے میں دپاتے اس نے ان کے ہاتھوں کو دبایا۔ ان کی نیم مردہ آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

”جیتی رہو..... خوش رہو۔ تم نے مجھے جیسے پھر سے زندہ کر دیا ہو۔ ہانیہ..... میں اب روز رب سے اس کے لوٹ آنے کی دعا کروں گی۔ اس کا دل بدل جانے کی دعا کروں گی۔ تم نے میرا مان رکھ لیا۔“

اس کی روشن پیشانی کو چومتے ہوئے وہ کتنے دنوں بعد دل سے مسکرائی تھیں اور ہانیہ..... اس کے دل کا کیا.....؟

☆☆☆

اور رات پہلی ترویج کے بعد وہ سب کچن میں تھیں جب پراٹھے بناتی وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی نکالتی تھی۔

”لوگ نجانے کیوں سمجھتے ہیں کہ ان کی ایک نظر التفات کے لیے کوئی ہر وقت پلکیں بچھائے ان کا منتظر رہے گا۔“ اندر آئے وجدان کو یوں لگا جیسے اس پر طنز کیا گیا ہو۔

”ہیں..... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے.....“

بیانے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”لگتا ہے فلسفہ پڑھ رہی ہیں یہ۔“ مونانے اچار

کے ساتھ پراٹھا کھاتے اندازہ لگایا۔ وجدان اندر آچکا تھا۔ بیا فوراً باادب ہو کر اس کی طرف بڑھی شاید اسے کچھ چاہیے۔ وجدان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

☆☆☆

شروع کے چند روزے تو افراتفری میں گزر گئے۔ مصطفیٰ صاحب شوگر کے مریض تھے مگر روزہ قضا نہیں کرتے تھے۔ سب سے برا حال تو علی اور مونا کا ہوتا۔ دونوں کو بھوک بہت لگتی تھی لہذا سارا دن انہیں اپنی جگہ سے ہلانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا۔ بھابھی کی البتہ بری ہوئی ان کے دونوں بچوں کے فائل ٹرمر آنے والے تھے اور اسکول جانا لازمی تو وہ سحری کے بعد سو ہی نہیں پاتیں، بچوں کو ناشتا کرا کے لیج بٹا کر بھیجنے کے بعد وہ گیس ذرا دیر ہی سو پائیں کہ حنا صاحب بیدار ہو جاتے پھر تو لاکھ بہلاؤ بھلتے ہی نہیں۔

سائر ریحان اور چاچو آفس چلے جاتے، مصطفیٰ اور مرتضیٰ صاحب رمضان میں تھوڑی دیر اور ضرورت کے وقت ہی آفس جاتے تھے۔ تانی جان کو کوئی روزہ رکھنے نہیں دے رہا تھا۔ ایک دو روزوں کے بعد انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور روزے رکھنا شروع کر دیے۔ ہال میں اتنا لمبا دسترخوان بچا جس پر طرح طرح کی نعمتیں ہوتیں۔

سائر بڑوں کی موجودگی میں بہت باادب رہتا، جونہی وہ اٹھتے تو اس کی جولاہیاں عروج پر پہنچ جاتیں۔ شروع عشرے، مالٹا اور مارکیٹس کے چکر لگنے لگے۔ وجدان نے جہاں آرا سے کہہ دیا کہ وہ عید کے بعد رشتہ لے جائیں۔ سونیا آنٹی کو بھی اس نے آگاہ کر دیا۔ انہیں تو پہلے یقین ہی نہیں آیا پھر محظوظ انداز میں سر ہلا کر مسکرا دیں۔ ان کے انداز سے بھی ناگوار لگے مگر ضبط کر گیا۔

رات کو کمرے میں مصطفیٰ صاحب آئے تو جہاں آرانے ہات چھیڑ دی۔ انہوں نے حتی الامکان بات کو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا۔ وہ محتاط تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے کسی تاثر سے یہ لگے کہ ان کی مرضی اس میں شامل نہیں مگر یہ سن کر مصطفیٰ صاحب کتنے لمحے تو بے یقینی سے چپ رہے۔

”جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ حیران تھے کہ

”زندگی بھی تو کسی فلسفے سے کم نہیں جو نظر آتا ہے وہ دیکھا نہیں ہوتا۔ اور جو جیسا ہوتا ہے دکھتا نہیں۔ پرت در پرت چہرے، باہر سے اچلے۔ اندر سے میلے۔ فریب سے پر۔“ اسے وجدان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ میڈیسن باکس سے ٹیبلٹ نکال رہا تھا۔ پراٹھا یک چکا تھا۔ اس نے چولہا بند کیا اور ٹیبل پر آکر بیٹھ گئی۔ تانی جان کا مان کر لینے کے چکر میں وہ اپنی نسوانی پندار کا سودا کر بیٹھی تھی۔

”لگتا ہے پھر کسی نے تمہارے خلوص سے غلط فائدہ اٹھا کر اپنا الو سیدھا کیا ہوگا۔“ وہ جتنی پر خلوص اور بامروت تھی اکثر اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہو ہی جاتی بیا کی مدہم سرگوشی پر مونا نے بھی سر ہلا کر تائید کی۔

”دوسروں کو دکھ دے کر لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ خود بھی خوش ہو جائیں گے۔ یہ عمل رد عمل کا کھیل ہے آپ کا کیا پلٹ کر آپ کے پاس ہی آتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے پراٹھا کھاتی بول رہی تھی۔ پانی پیتے وجدان کو ناگوار لگا۔

”جو کرتے ہیں اسے سمجھتے بھی ہیں۔ پھر چاہے لاکھ تاویلیں دیں۔ خود کو جھٹکائی کریں ضمیر کے کوڑے بڑے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اگر ضمیر زندہ ہو تو.....“

اب تو وہ دونوں بھی خشکیں۔ تلخ لہجہ۔ جیتی نظریں اور الفاظ..... وجدان نے جھٹکے سے گلاس رکھا اور پلٹ کر قدرے ترشی سے اسے دیکھا جو پراٹھا کھاتے ہوئے اطمینان سے ان دونوں سے مخاطب تھی۔

”فلسفہ صرف بولنے کی حد تک ہی اچھا لگتا ہے۔ جو جھیل چکے ہوں ان کی تکلیف وہ ہی جانتے ہیں۔ باقی تو صرف لفاظی ہی کر سکتے ہیں۔“ وہ کیا جتنا ناچاہ رہا تھا۔ ہانسے لب پہنچ کر رہ گئی۔ وہ جا چکا تھا۔ بیا اور مونا قدرے ناگہمی سے وجدان کے جملے اور اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری میں ربط ڈھونڈتی رہ گئیں۔

جہاں آرا سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ بات اتنے اطمینان سے کہہ سکتی ہیں۔ ”جی۔ وجدان نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے اس پر سوچا۔ مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آئی۔“

”اوہ۔ تو صاحب زادے کی منشا ہے یہ۔“

”اس میں کوئی حرج تو نہیں مصطفیٰ صاحب!“

”یہ آپ کہہ رہی ہیں جہاں آرا.....؟ کیا۔ ماضی میں جو کچھ ہوا وہ نہیں جانتیں؟ سونیا کی فطرت کا آپ سے بڑھ کر گواہ کون ہوگا۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ کوئی حرج نہیں۔“ ان کا انداز برہمی لیے ہوئے تھا۔

”اس بات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ اب تو ہر شے پر وقت کی دھول پڑ چکی ہے۔ پھر غزل اچھی لڑکی ہے۔“

”مگر اس کی ماں کیسی ہے۔؟ اس کا واپس آنا۔ بے وجہ نہیں تھا۔ وہ پھر سے ہماری زندگیوں میں کوئی نیا طوفان لانا چاہتی ہے۔ تم وجدان کو صاف صاف جواب دے دو۔ اس گھر کو جوڑنے میں، میں نے تم نے ایک عمر گزاری ہے اور سونیا کی بیٹی اسے ایک لمحے میں بکھیر دے گی۔“

ان کا غصیلانہ انداز اٹل تھا۔ اسی کا انہیں خدشہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وجدان باپ کے مقابل آئے۔ وہ بستر پر دراز ہوئے اور ہاتھ بڑھا کر لیب جلا لیا۔

”اور ہاں..... اگر یہ خناس صاحب زادے کے دماغ سے آسانی سے نہ نکلا تو پھر اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لے۔“ اور وہ ان کو دیکھتی رہ گئیں۔ وہ جو سمجھانا چاہ رہے تھے وہ ان کی پریشانی بڑھا گیا۔

وجدان سے فی الحال مصطفیٰ صاحب کی بات کا ذکر نہیں کیا۔ وہ سارے معاملے کو کسی طرح تنازعے کے بغیر حل کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی دعائیں طویل تر ہوتی گئیں۔

☆☆☆

موسم سرد تھا اور وجدان کی طبیعت بھی قدرے خراب تھی۔ مین بچے کا وقت تھا۔ جب دونوں بھائی

ماں کو سو یاد دیکھ کر اپنے ساتھ حنان کو بھی کھینچ کر صحن میں لے آئے۔ سب روزے۔ تھے اور اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ دونوں بیٹے بھائی حنان کو اپنی سائیکل پر بٹھا کر گول گول گھمار رہے تھے۔ حنان تو پہلے خوش ہوتا رہا پھر بڑھتی رفتار سے ڈر کر رونے لگا۔ دونوں باز آنے کے بجائے گھمار رہے تھے۔ حنان کے رونے اور ان کے کھلکھلانے کی آوازیں صحن میں گونج رہی تھیں۔ اسی چکر میں سائیکل الٹی اور حنان لڑھکتا ہوا سائیکل سے گرا۔

دونوں بھائی بجائے اسے اٹھانے کے لیے آپس میں متحمس کھتا ہو گئے۔ صحن لمحوں میں میدان جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ حنان کی چیخیں اور ان کی بلند آوازوں سے ڈسٹرب ہو کر وجدان سرخ آنکھیں لیے بالکلونی میں آیا تھا۔

”یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم تینوں نے۔“ وہ دھاڑا تھا۔ سر کا درد اوپر سے ان کی آوازیں۔ اس کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ بگڑے تیور لیے مزید گر جا۔ وہ دونوں ہم کر رک گئے۔

”ذرا تمیز نہیں تم لوگوں میں۔ سارے گھر کو سر پر اٹھا رکھا ہے۔ نہ دن کا سکون نہ رات کا آرام ہے۔ گھر بچے کہ چڑیا گھر۔“ شور کی آوازیں کر رفت چچی اور چھوٹی چچی سمیت سب باہر نکل آئے۔ ”کیا ہوا..... کیوں اتنے غصہ میں ہو؟“

سب بچے ہانیہ کو دیکھ کر اس کے پاس آ گئے۔ ہانیہ نے انہیں ساتھ لگایا۔ بیانے رونے حنان کو دیکھا تو اس کی طرف بڑھی۔

”اس گھر میں بندہ دو گھڑی سکون سے سو سکتا ہے کیا؟ ہر وقت شور شرابا۔ آئے دن ہنگامہ۔ اوپر سے ہماری بھابی صاحبہ کو سوائے اپنے آرام و سکون کے علاوہ کسی اور چیز سے سروکار نہیں۔ بچوں کو صرف پیدا کرنا کمال نہیں ہوتا۔ ان کی تربیت بھی کرنی ہوتی ہے۔“ اس کے جومند میں آیا بولتا گیا۔

روزہ افطاری پر بھی ان کی جج جج وہ بڑی مشکلوں سے برداشت کرتا تھا، یہاں کھڑا اپنی بھڑاس

کال رہا تھا۔ صبحی بھابی جو نیند سے اٹھ کر ابھی آئی تھیں ہکا بکا اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ بیا کے چیخنے پر اس کی طرف لپکیں۔

حنان کے سر سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا اور رو رو کر اس کا گلا بھی بیٹھ گیا تھا۔ بھابی نے بے ساختہ اس کا منہ ہاتھ سے صاف کیا۔ سب ہی ادھر دوڑے۔

”حنان..... حنان.....“ ماں کو دیکھ کر وہ سسکنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر وجدان خاموش ہو گیا تھا۔

”جلدی سے پاپو ڈین اور بینڈیج لاؤ۔“..... چچی دوپٹہ سے اس کے زخم کو دبائے خون روک رہی تھیں۔ بھائی کو اس حال میں دیکھ کر دونوں بڑے بھائی بھی ڈر کر رونے لگے۔ ہانیہ نے احمد کو انہیں لے جانے کا اشارہ کیا۔ وجدان نیچے اترا۔ بھابی رو رہی تھیں۔

رفت انہیں تسلی دے رہی تھیں۔ ”ہیں آپ۔ اب رونے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ذمہ داری سے ان کا خیال رکھیں تو یہ حال نہ ہوتا اس کا۔“ ناچاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں کڑوا سا طنز در آیا۔ سب ہی کو برا لگا۔

”آپ اپنی خدمات اپنے پاس ہی رکھیں۔“ پیچھے سے آئی مصطفیٰ صاحب کی۔ ”سی آواز پر سب نے مڑ کر دیکھا۔ وہ شاید نیند سے اٹھ کر آئے تھے۔

”یہ گھر یہاں کا ماحول اگر آپ کے معیار کا نہیں تو پوریا بستر سمیٹ کر ادھر چلے جائیں جو آپ کے نمایاں شان ہو۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”جاؤ بیا..... میری گاڑی کی چابی لاؤ۔“ انہوں نے بیا کو حکم دیا پھر مونا سے پٹی لے کر کس کر حنان کا زخم باندھا۔

”اور آئندہ اگر تم نے صبحی سے بدتمیزی کی کوشش کی یا میرے گھر کی رونقوں کو برا بھلا کہا تو پھر اپنا ٹھکانہ کسی دیرانے میں کر لینا۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔“ وہ اس کے تیور کنی دنوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے روتی ہوئی صبحی کو اشارہ

کیا۔ وہ چلے گئے اور سب تاسف سے اسے دیکھ رہے تھے جو غصہ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ سب کچھ سنتی جہاں آرائی حال سی بیٹھی سوچ رہی تھیں اس کے اندر اتنا زہر کس نے بھرا تھا۔ کب وہ اتنا کڑوا ہو گیا؟ انہیں خبر ہی نہ ہو سکی۔ حنان کے تین ٹانگے آئے تھے۔ سائیکل کالیور اس کی کپٹی سے ذرا اوپر بالوں میں لگا تھا۔

☆☆☆

ڈھائی سالہ حنان واپسی پر سوچا تھا۔ بھابی بہت چپ تھیں۔ سب نے ان کے آنے پر سکھ کا سانس لیا۔ حنان کو سو یاد دیکھ کر کوئی ان کے کمرے میں نہیں گیا کہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔ وجدان کے رویے کی وجہ سے مصطفیٰ صاحب کو سخت غصہ بھی تھا اور افسوس بھی۔

وہ جس طرح تمیز و تہذیب بھلائے گرج رہا تھا۔ اسے سن کر انہیں یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہ ان ہی کا بیٹا ہے۔ ان کے خاندان میں آج تک کسی مرد کو یوں گھر کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ رویہ اپنانے کی جرات ہوئی نہ یہ ان کی روایت تھی۔ وہ نجانے کس ڈگر پر چل نکلا تھا۔ اور ان کا فیصلہ مزید اٹل ہو گیا۔ سونیا کی بیٹی اس گھر میں کسی صورت نہیں آئے گی۔ ریحان اور سائر معمول کے مطابق گھر آئے تو ماحول میں تناؤ محسوس کیا۔ روز والی رونقیں مفقود تھیں۔ ریحان اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور پھر جب بھابی اور بچے افطار پر دسترخوان پر نہیں آئے تو مصطفیٰ صاحب کے استفسار پر وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔

”میرے بچوں کو تمیز و تہذیب نہیں ہے۔ نا ہی وہ یہاں بیٹھنے کے قابل ہیں ابو۔ بہتر ہے کہ وہ اندر ہی رہیں۔ لوگوں کو ان کی موجودگی سے کوفت ہوتی ہے۔ بہتر ہے ان کو مزید بے سکون نہ کروں۔“

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ ریحان نے کبھی کسی بات کو یوں مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ مگر آج ٹوی کارونا اور بیٹے کی حالت دیکھ کر اسے بہت

دکھ ہوا۔ مگر تو وجدان سے تھا جو ان معصوموں کو مصیبت تصور کرتا تھا۔ پھر وہ بھی جلد ہی دسترخوان سے اٹھ گیا۔ سب ہی نے بے دلی سے افطاری کی۔

سائر کو جب سارے واقعہ کا علم ہوا تو اسے وجدان پر سخت ناؤ آیا۔ لگتا ہے کہ موصوف نے عقل بھی عشق میں گروی رکھوالی تھی۔ وجدان تو صرف مجبور سے ہی افطار کر کے اٹھ گیا۔ پھر نماز کے بعد وہ گھر ہی نہیں آیا۔ ہانیہ اس واقعے کے بعد سوچ رہی تھی کہ اس نے تائی جان کی خوشی کی خاطر کیسے کھانے کا سودا کر لیا ہے۔ دل الگ مضطرب تھا اور اصل بد مزگی اگلے دن ہوئی جب بھابھی اپنا اور بچوں کا سامان پیک کر کے مکے چلی گئیں۔ جہاں آراء ان کے اجازت مانگنے پر کیا کہتیں۔ وہ حق بجانب تھیں۔

وجدان کے رویے کو وہ کیوں اور برداشت کرتیں۔ کتنے عرصے سے وہ اس کی باتوں کو نظر انداز کر رہی تھیں، مگر کل جس طرح اس نے سب کے سامنے ان کی بے عزتی کی پھر بعد میں بھی وہ جتان کو پوچھنے تک نہ آیا۔ نہ کوئی معذرت نہ شرمندگی۔ وہ خود کو حق بجانب سمجھ رہا تھا اور اس مقام پر وہ اپنا ظرف بڑا نہ رکھ سکیں۔ ریحان کی رضامندی سے وہ مکے گئی تھیں۔ گھر اچانک سے سونا سونا ہو گیا۔ کہاں عید کی تیاری کے پروگرام بن رہے تھے۔ کہاں سب ہی کم مہم بے دلی سے افطاری کی تیاری کر رہے تھے۔ اوپر سے موسم بھی عجیب ہی ہو رہا تھا۔ بادل اور دھند بھرا، مصطفیٰ صاحب گھر آ کر جب حتان کی طبیعت کا پوچھنے ان کے کمرے میں گئے تو خالی کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ انہوں نے سامنے سے آئی عاترہ سے پوچھا۔

”بھابھی تو چلی گئیں۔“ اس نے سادگی سے بتایا۔ وہ چونکے۔

”کب.....؟“
”صبح ہی چلی گئی تھیں۔“ اور ان کا دماغ گھوم گیا۔ افطاری کے وقت وہ ریحان پر برس پڑے۔ وہ سر جھکا کے ان کی لعن طعن سنتا رہا۔ کیسا روزہ، کیسی

افطاری۔ سب کا جی مکدر ہونے لگا۔

”ابو! اسے کچھ وقت چاہیے۔ پھر بچوں کی موجودگی یہاں لوگوں کو چھپتی ہے۔“ ریحان نے وجدان کو دیکھ کر صاف کہا اسے غصہ آنے لگا۔ کل سے ایک ہی بات سن سن کر وہ پک چکا تھا۔ ایسا کون سا گناہ کر دیا تھا یا سانحہ ہو گیا تھا۔ جو سب ہی اسے ملا متی نظروں سے گھورتے ہیں۔

”آپ بات کو بلاوجہ بڑھا رہے ہیں۔“
”تم کئی بار طنز نہیں کر چکے کہ انہیں تمیز کی اشد ضرورت ہے۔“

”تو غلط تو نہیں کہتا میں۔“
”تمہارا مطلب ہے کہ ہم اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کر رہے۔“ ریحان تیز ہوا۔

”میری رائے نہ ہی مانیں تو بہتر ہوگا۔ بھابھی کی آرام طلبی اور بچوں کی تمیز سب پر واضح ہے۔“ اس کی برداشت بس یہی تک تھی۔ ریحان سے یوں بحث کرنے کا نہ ہی ارادہ تھا نہ ہی یہ وقت۔ سب افطاری چھوڑ چھاڑ کر ان دونوں کو استعجاب سے دیکھ رہے تھے۔ جنہیں نہ وقت کا احساس تھا نہ ہی بڑوں کی موجودگی کا۔

”اپنے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟ تم خود کیا ہو۔ ایک اکھر، بد مزاج بد لحاظ انسان۔“ ریحان کا کڑوا طنز اسے سلگا گیا۔ جہاں آرا کو بے چینی ہوئی۔ خود مصطفیٰ صاحب دم بخود تھے۔

”ریحان چپ کر جاؤ۔“ جہاں آرا نے انہیں چپ کروانا چاہا۔

”جو بھی ہوں۔ کم سے کم منافق نہیں ہوں سب کی طرح۔“

”یعنی ایک آپ ہی بہترین صاف گو انسان اور ہم سب منافق ہیں اب.....“

”ریحان وجدان خاموش ہو جاؤ۔“ مصطفیٰ صاحب دھاڑے۔ ان کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ دونوں غصہ سے لال، بھجھو کا پہلی بار یوں اچھے تھے۔ ایسا اس گھر میں پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔

”شرم و حیا تیز سب بھلا چکے ہو تم دونوں۔
بڑے بیٹھے ہیں اور تم دونوں کی آنکھوں سے لحاظ ختم
ہو گیا ہے۔“ وہ گرج رہے تھے۔

”اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک ناکام
باپ ہوں۔ جو تم دونوں کو آپس میں محبت، چھین،
سکون کا سبق نہیں پڑھا سکا۔“ وہ رنجیدگی سے
بولے۔

”اور تم ریحان۔ تم نے میرے پوچھے بغیر مجھ
سے مشورہ کیے بغیر ٹوٹی اور بچوں کو بھجوا دیا۔ غلط کیا تم
نے، گھر کی بات کو گھر میں ہی سلجھاتے ہیں۔ بات
کھلے تو مسائل بڑھ جاتے ہیں۔“ ریحان سر جھکائے
ستار رہا۔

”اور وجدان تم..... تمہیں اس گھر میں رہنے
والوں سے اتنا ہی مسئلہ ہے تو نکل جاؤ تم بھی۔“ ان
کے الفاظ تلخ تھے یا سرد۔ وجدان کی آنکھوں کی لالی
بڑھ گئی۔ دماغ کی رکیں کھینچنے لگیں۔ جہاں آرا اس
کے تاثرات کو دیکھ کر ہونے لگیں۔ ان کے سر میں درد
کی تیز لہریں اٹھی۔

”یہ گھر اور یہاں کے مکین آپ ہی کو مبارک
ہوں۔ میں ہمیشہ سے ہی ایک فالتو برزہ تھا ایک
اضافی بوجھ۔ جس کی نہ ضرورت تھی کسی کو نہ ہی جگہ
تھی۔ بہت شکر یہ میرے گمان کو یقین میں بدلنے
کا۔“

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا۔ سائرنے بے اختیار اس
کا ہاتھ پکڑا۔ یہ جذباتی لڑکا غصہ میں آ کر کچھ غلط نہ کر
لے۔ وہ فکر مند ہوا۔ جہاں آرا کے سر میں دھماکے
ہونے لگے۔

”تم ہمیشہ ان خود ساختہ دھموں کے قیدی رہے
ہو۔ کوشش کرنا کہ حقیقت کو کھلی آنکھوں سے دیکھو اور
پرکھ سکو۔ اگر جان جاؤ تو اعتراف کرنے میں پہل
کرنا۔ مردوں کی طرح۔ بزدلوں کی طرح منہ مست
چھپا لینا۔“ مصطفیٰ ہمدانی کا لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔ ریحان
نے بے چینی سے اسے روکنا چاہا۔ بات اس حد تک
بڑھ جائے گی یہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

وجدان نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور وہ لکڑی
گیا۔ چچا جان اور چاچو بے ساختہ اس کے پیچھے
لپکے۔ جہاں آرا کا سپید چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ
کپکپا رہی تھیں۔ لرزتے ہونٹوں پر الفاظ دم توڑ گئے۔
ان کے انداز دیکھتے سب گھبرائے۔ قریب بیٹھی بیا
نے ان کے گرتے وجود کو تھاما۔ سب اندھیرے میں
ڈوب رہا تھا۔ ان کی دنیا۔ ان کی ریاضتیں۔ ان کا
گھر۔

☆☆☆

تیسرے عشرے میں بہار کا آغاز ہو چکا تھا اور
یہ موسم کے سرد پین کو بڑھا گیا، اس بار رمضان بہت
روکھا پھکا اور خاموش گزر رہا تھا۔ سب کام ہو تو رہے
تھے مگر خوشی و جوش مفقود تھا۔ اب تو نہ صحن میں بچوں کی
سائیکلیں کھڑی نظر آتیں۔ نہ ہی احمد علی کے بیڈ بال
پڑے ملتے۔ عازرہ کی شوخی بھی غائب تھی۔

جہاں آرا طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں
آئی تھیں۔ رفعت اور چچی نے اسپتال کی ڈیوٹی دی
تھی۔ سائر اور ریحان صحن چکر بنے ہوئے تھے۔
ریحان شرمندہ تھا تو ٹوٹی بھابھی رنجیدہ۔ کاش کہ وہ
اس دن الجھ کے سامنے وجدان سے یوں بحث نہ کرتا
تو یہ سب نہ ہوتا۔ یہ پچھتاوا ان کی خاموشی میں تبدیل
ہو گیا تھا۔ خالہ جان نے بیٹی کے خوب ہی لے لے
جوان کی بہن کو ایسی حالت میں چھوڑ کر میکے بیٹھی ہوئی
ہے۔ وہ واپس آئیں۔ رورو کر جہاں آرا سے معافی
مانگی حالانکہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جہاں آرا نے
انہیں گلے لگایا۔ بیا ماں کی پٹی سے لگی رہتی۔ مصطفیٰ
صاحب ان کی یہ حالت دیکھ کر رنجیدہ تھے۔

ان کی شریک حیات نے ساری عمر ان کا مان
رکھا۔ ان کا ساتھ دیا۔ بھی ان کے حکم کو نہیں ٹالا اور وہ
اس عمر میں انہیں سکھائیں دے پار ہے تھے۔ ماں باپ
تو اولاد کو بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اگر غصے میں انہوں
نے کہہ بھی دیا تو کیا ہوا۔؟ وجدان کو یوں گھر چھوڑ کر
نہیں جانا چاہیے تھا۔ غصہ انہیں کسی اور بات کا بھی
تھا۔ جہاں آرا نے تو حتی الامکان بات کو چھپا دیا تھا

صرف آدھا بج بتایا مگر انہوں نے جب اپنے طور پر تحقیق کی تو پچھلے مہینے وجدان کے اکاؤنٹ سے کئی بار لمبی لمبی رئیس نگلوائی گئی تھیں۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ سارا پیسہ کہاں گیا؟ انہیں وجدان کی عقل پر افسوس ہوا اور وہ۔ وہ تو جاتے وقت کچھ بھی نہیں لے کر گیا تھا۔ موہائل کمرے میں پڑا رہ گیا اور گاڑی پورچ میں۔ سائر نے ہر جگہ اس کا پتا لگوانے کی کوشش کی مگر اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ کئی بار وہ سونیا آنٹی کی طرف بھی گیا مگر اسے وہاں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے یقین تھا کہ وہ وہیں ہے مگر کیا کر سکتا تھا۔ رشتے داروں کی آمد و رفت اور فون کالز آرہی تھیں۔ جہاں آ رہا ہر دل عزیز شخصیت تھیں۔ دینی سے پھوپھو کا فون آیا۔

حسنہ اور تانیہ آپنی کتنی بار آچکی تھیں اور روزانہ فون الگ کرتیں۔ جہاں آرام بہت کمزور ہوگئی تھیں۔ انہیں پہلی بار وجدان کے لہجے میں دکھ نظر آئے تھے۔ اس کی حسرتیں۔ اس کے شکوے۔ اپنی کوتاہی سب کا اندازہ ہوا اور کس وقت ہوا۔ جب وہ نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ مصطفیٰ صاحب ان کے خاموش شکوے کو بخوبی سمجھتے تھے مگر انہیں ایک یقین بھرا انتظار تھا کہ وہ اپنے اصل کی طرف جلد لوٹ آئے گا۔ سرائٹا کر فخر و بہادری سے۔

☆☆☆

ستائیسویں پر نور شب تھی۔ وجدان کمرے میں بیٹھا فضاؤں میں باہر کو بجتی تلاوت کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ اسے کمر چھوڑے گیارہ دن ہو چکے تھے۔ کمر سے نکل کر وہ سیدھا سونیا آنٹی کی طرف آیا تھا۔ اس دوران ایک بار بھی کوئی اسے ڈھونڈتا اور نہیں آیا تھا۔ اس کے اندر مزید غمی بھرنے لگی۔

”میرے ہونے نہ ہونے سے کسی کو فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ سب اپنی دنیا میں مگن و خوش ہیں۔ مجھے یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ نجانے کس خوش گمانی میں، میں نے اتنے سال وہاں گزار دیئے۔“

مگر سچ تو یہ تھا کہ جہاں آرا کا خیال اسے بے

چہن کرنے لگا۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ ان کی محبت اب اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی غلط تھا۔ ماتہ کی نرم و گرم آغوش اسے آج بھی اتنی ہی درکار تھی۔ سونیا آنٹی اس کے یوں کمر چھوڑ آنے پر بہت خوش تھیں۔ البتہ غزل نے اسے ایک دوبار سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کا اہل انداز اور سخت رد عمل دیکھ کر چپ کر گئی۔ اس جگہ ویسی ہی خاموشی تھی جس کے وہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ صاف ستھرا بنگلہ، ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی مگر نجانے وہ پرسکون کیوں نہیں تھا۔

غزل اپنی جاب میں بہت مصروف تھی، وہ صبح کی نکلی اکثر شام ڈھلے آتی۔ سونیا آنٹی یوں تو بالکل ٹھیک تھیں مگر روزہ نہیں رکھتی تھیں کہ انہیں پھر کمزوری ہو جاتی تھی بقول ان کے۔ غزل کا موڈ ہوتا بھی کبھار روزہ رکھ سکتی۔ سو سحری و افطار کو وہ اکیلا ہی ہوتا۔ ماہ رمضان کی مخصوص روتق یہاں پر مائد تھی۔ ویسے ہی روٹین کے عام سے روکے پھیکے دن لگتے۔ وہ ادھر بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ یہ ساکن و جامد زندگی اس کی چوٹیں نہیں تھی۔

”سائر نے بھی میری خبر لینے کی کوشش نہیں کی؟“

سائر نے ہمیشہ جانے انجانے میں اس کا ہر ممکن خیال رکھا تھا۔ وہ واحد شخص تھا جو اس کے موڈ کی پروا کیے بغیر اسے لٹاڑتا بھی اور نصیحت بھی کر جاتا۔ مگر ان دنوں اسے احساس ہوا وہ تو خالی ہاتھ ہے۔ کوئی بھی اس پاس نہیں۔ اس کی خود ساختہ خود تری ابھر آتی۔ سونیا آنٹی نے جب، گلاس وال کے سامنے بچھے دیوان پر وجدان کو یوں سوچوں میں گم دیکھا تو سر جھٹک کر استہزاء سے مسکرائیں۔

وجدان کو ڈھونڈتا ہوا سائر کئی بار آیا تھا مگر انہوں نے ہر بار اسے لوٹا دیا۔ غزل کو بھی کسی کو بتانے سے منع کر دیا تھا۔ یہ فرحت بخش احساس ان کے چلتے دل کو ٹھنڈک دیتا کہ جہاں آرا بھی تکلیف میں ہوگی۔ جل رہی ہوگی۔ جیسے وہ بھی راکھ ہوئی تھیں مصطفیٰ ہمدانی ان کے منگیتر تھے۔ ان کی والدہ کے کزن کے

بیٹے۔ سونیا ایک اربنل کلاس گھرانے کی لڑکی تھی۔ طرح دار اور ترقی کی خواہش مند۔ براہِ اعتمادی۔ مصطفیٰ کو وہ اچھی لگتی تھی۔ خود مصطفیٰ کا تعلق ایک مضبوط اور معاشی لحاظ سے مستحکم گھرانے سے تھا مگر روپے پیسے کی ریل ٹیل کے باوجود ان کا گھرانہ قدرے روایت پسند اور قدامت پرست تھا۔ جنہیں اپنی قدریں بہت عزیز تھیں۔ سونیا کو بظاہر اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ وہ آزاد ماحول میں رہنا چاہتی تھیں۔

ان روایتوں اور گھٹے ہوئے ماحول سے فرار چاہیے تھی اور ان رسموں رواجوں سے دم گھٹتا۔ خود مصطفیٰ کا پورا گھرانہ پڑھا لکھا اور سلجھا ہوا تھا۔ مصطفیٰ بہت ہنڈسم اور ڈیسنٹ تھے۔ منگنی کے بعد سونیا نے لڑجھکڑ کر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا مگر وہاں جا کر اسے احساس ہوا کہ اصل زندگی تو یہ تھی۔ وہیں عادل شیراز سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک کروڑ پتی ماں باپ کا اکھوتا بیٹا تھا۔ عادل سے بڑھتی قربتیں اس حد تک آ گئیں کہ اپنی والدہ کے سامنے بیاہک دہل کہہ دیا کہ وہ مصطفیٰ سے شادی نہیں کرے گی۔ یہ انکار ایک بھونچال لے آیا۔

مصطفیٰ کی والدہ شادی کی تاریخ لینے آنے والی تھیں اور سونیا کا یہ بے باک انکار انہیں پورے خاندان میں شرمندہ کر کے رکھ دیتا۔ اور لاکھ سمجھانے کے باوجود ہوا بھی یہی۔ مصطفیٰ کی والدہ جب آئیں تو سونیا نے بے دھڑک انگوٹھی اتار کر ان کے سامنے دھر دی۔ سونیا کے والدین مارے صدمے و شرم کے زمین میں گڑ گئے۔ وہیں مصطفیٰ کی والدہ بھی ششدر رہ گئیں۔ ان کے والدین عزت دار اور بہت وضع دار لوگ تھے۔ سونیا کے اس عمل نے انہیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا مگر سونیا کو پروا نہیں تھی۔ دھچکا تو مصطفیٰ کو بھی لگا۔ پسند اپنی مگریوں بے ہاکی سے ان کی والدہ کے سامنے انگوٹھی اتار دینا انہیں سخت بدول کر گیا۔

عادل شہزاد سونیا کے ساتھ شادی پر رضامند نہیں

تھا۔ دوسری جانب سونیا کے والد نے الٹی میٹم ڈے دیا کہ وہ اس لڑکے سے کہے کہ جلد اپنے والدین کو لائے تاکہ وہ جلد از جلد اسے رخصت کر سکیں۔ ساری صورت حال کو دیکھتے ہوئے سونیا کے ایما پر وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ نکاح کرنے آ گیا۔ اس کے والد بھی یوں راضی نہ ہوتے مگر سونیا کی ہٹ دھرمی اور بغاوت کو دیکھتے ہوئے رخصت تو کر دیا مگر گھر کے دروازے سونیا کے لیے ہمیشہ بند ہو گئے۔ دوسری جانب رابعہ ہمدانی نے جہاں آرا سے ان کی حث منگنی کر کے پٹ بیاہ کر دیا۔ جہاں آرا دیکھی بھالی گھر کی لڑکی تھی۔ اگر بات مصطفیٰ کی پسند کی نہ ہوتی تو رابعہ کی اولین ترجیح جہاں آرا ہی تھی۔

سونیا کی وہی روایتی کہانی تھی۔ دو سال کے بعد ہی وہ لوٹ آئی۔ عادل کی اصلیت اس پر کھل کر سامنے آ چکی تھی۔ اس کا جب دل بھرا تو اس نے سونیا کو کسی استعمال شدہ برتن کی طرح ٹھوکر ماردی۔ یہ عرصہ سونیا کے لیے بھی آسان نہ تھا۔ ماں باپ نے مجبوراً دل سے لگایا۔ وہ جلد ہی مارل ہونے لگی اور پھر دوبارہ سے مصطفیٰ سے تجدیدِ تعلق کرنا چاہا مگر وہ اس کے اثر سے نکل چکے تھے۔ جہاں آرا کو ساری حقیقت معلوم تھی لہذا ان کا ہر وار جہاں آرا نے ناکام لوٹا دیا۔ مگر سونیا نے ہمت نہ ہاری، مرتضیٰ کمال اب ان کے نشانے پر تھے وہ ان کے جال میں پھنسنے لگے تھے مگر جہاں آرا نے رفعت کا حق انہیں غصب نہ کرنے دیا۔ وہ ساس کے ساتھ مشورہ کر کے رفعت کو جلد رخصت کرالا میں۔

سونیا کے دل میں، تب سے جہاں آرا کے لیے عداوت تھی۔ مرتضیٰ کمال ضرور ان کو اپنا لیتے اگر جہاں آرا نہ ہوتیں۔ یہ خیال ان کے دل میں جڑ پکڑتا گیا۔ رفعت کمزور تھیں۔ یتیم تھیں مگر جہاں آرا کی حکمت عملی اور ان کی سپورٹ کی وجہ سے انہیں بہت ڈھارس رہتی۔ سونیا کا یوں آنا اور دھڑلے سے استحقاق جمانا انہیں خوف زدہ کر دیتا مگر جہاں آرا نے بڑی خوب صورتی و عقل مندی سے ان کا گھر ٹوٹنے سے بچایا۔

دوران سونیا کو مشتاق رضا ملے۔ وہ رنڈوا تھے۔ اسلام آباد میں اپنا گھر تھا۔ صاحب حیثیت تھے۔ سونیا نے ناکام ہو کر ان سے عقد ثانی کر لیا اور ان کی زندگی ان کے شہر سے چلی گئی اور اب وہ پھر سے انہیں یوں خوش دیکھ کر جل اٹھی، سارے زخم ہرے ہو گئے۔ وجدان کی صورت انہیں ایک ٹرمپ کارڈ ہاتھ لگا تھا اور اب کھیل ان کی مرضی کا ہونا تھا۔ اب کہ بازی بھی ان کی تھی اور مہرے بھی۔

☆☆☆

آخری عشرہ بھی اختتام کی جانب تیزی سے گامزن تھا۔ یہ رمضان نہایت افسردہ و اداس گزرا تھا۔ تیسرا عشرہ عید کی تیاریوں اور عبارتوں میں گزر رہا تھا۔ تیاریاں تو خیر کیا ہونی تھیں۔ لڑکیاں چاچی کے ساتھ جا کر تیار جوڑے، جوتیاں اٹھا لائیں۔

تائی اور رفعت تو یوں بھی رمضان سے پہلے ہی کپڑے سلنے کو دے دیتیں باقی رہی عید۔ تو نہ ہی اس کامیو منتخب ہوا نہ ہی کوئی خصوصی خریداری کی گئی۔ جہاں آرا پر مردہ تھیں مگر ستائیسویں روزے کو وہ ہمت کر گئے انھیں۔ رفعت اور سبین سے لسٹ بنا کر ان دونوں کو خریداری کے لیے بھیجا۔ جس جس گھر میں عید کا راشن ڈلوانا تھا اس کی لسٹ تیار کروا کر سائر کے حوالے کی۔

چاندی اور دوسری ماسی سے گھر کی تفصیلی صفائی شروع کروائی۔ پردے اترے صوفہ کورز۔ بیڈ پیس، غرض سب کو پیسے لگ گئے۔ کپڑوں والی ماسی سے مشین لگوائی۔ ہانیہ اس کے ساتھ لگ گئی۔ چاندی نے اپنی بہن کو بھی بلوالیا۔ بیان کے ساتھ لگ گئی۔ چمن کی صفائی۔ لاؤنج، ڈرائنگ روم، ہال غرض سارا گھر الٹا پڑا ہوا تھا۔ مونانے گو کہ بہت بچنے کی کوشش کی مگر رفعت جب خریداری کر کے آئیں تو اسے کمرے میں لیٹا پایا تو ان کا بارہ چڑھ گیا۔

”تم کوئی الٹوھی روزہ دار ہو؟ وہ دونوں کام کر رہی ہیں کیا ان کا روزہ نہیں۔“

”امی پلیز مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔“ اس کے بودے بہانے پر رفعت کو آگ لگی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا ہر وقت طنز کرتی رہتی ہیں۔“ آخری جملہ زیر لب بڑبڑایا۔

”تو یوں کرتی ہوں کہ کھانا ٹرے میں لا کر پروتی ہوں تمہیں۔“ ان کے طنز پر وہ روہانسی ہو گئی۔

”تو پھر کیا مطلب تھا۔ حد ہے۔ اٹھو اور جا کر بیا کا ہاتھ بناؤ۔“ بلکہ رہنے دو۔ تم پھر ڈنڈی مار جاؤ گی۔

آؤ اور میرے ساتھ چمن کا سامان ٹھکانے لگاؤ۔“ ان کے حکم پر وہ چارونا چار اٹھی۔ دھلائی بس اب اختتام پذیر ہو رہی تھی۔ بھابھی پہلے سے چمن میں موجود تھیں۔

”تم جا کر صفی، کے ساتھ کام ختم کرواؤ میں اور چچی افطاری بنالیں گے۔“

اور اس نے شکر ادا کیا۔ اگلا دن بھی بہت مصروف گزرا اور چونکہ آخری طاق رات تھی لہذا وہ تینوں جاگ کر، شدید تھکاوٹ کے باوجود عبادت کر رہی تھیں۔ سارا گھر چمچا رہا تھا۔ دونوں میں سارا کام سمیٹ لیا گیا تھا۔ چکن اپنی جگہ مگر اصل خوشی

جہاں آرا کی تھی جو اتنے دنوں بعد اپنے کمرے سے نکلی تھیں اور اس وقت کمرے میں مصلے پر بیٹھی آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ بارگاہ الہی میں

ہاتھ اٹھائے اس رحیم ذات سے وجدان کے لوٹ آنے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ بارہ دن گزر چکے تھے مگر اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ ریحان سائر چاچو سب اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ مصطفیٰ صاحب خاموش تھے۔

مگر جہاں آرا کو یقین تھا کہ وہ جہاں بھی ہوگا خیریت سے ہوگا اور لوٹ آئے گا۔

”اے بار بار رحم کرنے والے۔ تو وہ ذات ہے جس کی محبت و رحمت لا محدود ہے۔ تو جو اپنے بندوں کو

ستر ماؤں سے زیادہ چاہتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تو اس لاچار، بے کس ماں کی فریاد نہیں سنے گا۔ اے

میرے رب! تو اس بابرکت رات کے توسط سے میرا بیٹا مجھے واپس لٹا دے۔ اے ارحم الراحمین تو اس کے

91

2026

ہارچ

ماہنامہ شعل

دل میں موجود بدگمانیاں دور فرمادے۔
اے بصیر! تو اس کی آنکھوں کے آگے پڑے
پردے ہٹا دے۔ اس کا دل بدل دے۔ نرم کر دے۔
اسے مجھے واپس لوٹا دے۔ پہلے بھی تو نے ہی دیا تھا۔
اب بھی تجھ ہی سے اس کی واپسی کا سوال کر رہی ہوں
تو میری فریاد سن لے مجھے خالی ہاتھ اپنی بارگاہ سے
مت لوٹانا۔“

ان کی ہچکیاں مصطفیٰ صاحب سن رہے تھے۔
مسجد سے آکر وہ بظاہر سونے لیٹے تھے مگر درحقیقت
جاگ رہے تھے۔ کاش کہ وجدان سمجھ سکتا۔ جان
پاتا۔ دل میں خیال ابھرا۔

☆☆☆

کل انیسواں روزہ تھا اور توقع تھی کہ عید کا
اعلان ہو جائے۔ وجدان اب اس قید میں اکتانے لگا
تھا۔ غزل بہت مصروف رہنے لگی تھی۔ ابھی کچھ دیر
پہلے اس کی گاڑی کی آواز آئی تھی۔ وہ لوٹا پڑھ رہا
تھا۔ فارغ ہو کر وہ غزل سے ملنے باہر نکلا تھا۔ اس کا
کمرہ خالی تھا وہ سونیا آنٹی کے بیڈ روم کی جانب
بڑھا۔ اندر وہ ان سے بحث کر رہی تھی۔

”آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں می! وجدان کو
اپنے پیڈرٹس کے پاس واپس جانا چاہیے۔ یہ اچھا نہیں
ہوتا۔“

”ڈیزیز پالیسی تم نہیں سمجھتیں یہ سب تم دونوں
بھلائی کے لیے کر رہی ہوں۔“

”واٹ ڈو یو مین می۔ کیسی بھلائی؟ آج پھر
سائز کافون آیا تھا۔ وہ روز مجھے کال کرتا ہے اور سچ تو
یہ ہے کہ اس سے ایک ہی جھوٹ بول بول کر میں
بہت ایمبریسڈ فیل کرتی ہوں۔“ وہ اس سب سے نا
خوش لگ رہی تھی۔ وجدان بری طرح چونکا۔ سائز
اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا اور یہ لوگ اس سے چھپا رہے
تھے۔

”بس تھوڑے دن اور پھر میں خود اس سے کہہ
دوں گی۔“

”می! میں اس پالیٹکس میں نہیں پڑنا چاہتی۔“

اگر آپ کو جہاں آرا آنٹی سے پاسٹ میں کوئی ایٹو
رہا تھا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ انہیں یوں
ہرٹ کریں۔ جو ہوا فاریکٹ اٹ می۔ آپ بہت
اچھی ہیں ایک اچھی لکڑی لائف گزاری ہے آپ
نے۔ پھر مصطفیٰ انکل کو چھوڑنا آپ کی اپنی چوائس تھی
اس میں ری وینج کہاں سے آگیا.....؟“

اس نے نرمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر بے
سود باہر کھڑا وجدان ایک ایک لفظ سننا شاکڈ تھا۔ غزل
یقیناً سچائی جانتی تھی جسے سونیا آنٹی نے توڑ مروڑ کر
پیش کیا تھا۔

”آئی ایڈمٹ مائی ڈارلنگ! مگر جہاں آرا اور
رفت ابھی تک اس بات کو نہیں بھولیں۔ ہم کتنے
عرصے بعد ملے بھی مگر مجھے دیکھ کر وہ جس طرح
ناخوش ہوئیں اس نے مجھے بہت ہرٹ کیا۔“

ان کی ناگواری مجھے چیخ کرنے لگی کہ میں انہیں
اچھی طرح سمجھا دوں کہ سونیا سعید اب بھی کسی سے کم
نہیں۔ اسے ان جیسی عام عورتوں کی پرواہ نہیں.....“
”اور اس سب میں میرا اور وجدان کا کیا بے
مگا؟“ اس کے سنجیدہ لہجے میں کیا تھا سونیا سمجھ کر مسکرا
دیں۔

”ڈونٹ یو ریڈ ڈیز! تم دونوں کے ریلیشن کو
کچھ نہیں ہوگا بلکہ اچھا ہے نا کہ تم اس جنجال پورے
سے دور رہو گی۔ یو کین سی وجدان خود اس سسٹم سے
بری طرح فیڈ اپ ہے۔“

وجدان ان ہی قدموں واپس مڑ گیا۔ اس کے
تھے اعصاب شکن کا شکار ہو رہے تھے۔ ساری رات
وہ جاگتا رہا۔ سوچتا رہا۔ لگا ہوں کہ سامنے کئی مناظر
آئے اور گزیر گئے۔ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ غزل اس
کی چاہت تھی یا ضرورت یا کوئی پرانی خواہش، وہ
پہلے سمجھنا چاہتا تھا۔ سحری کے وقت چمن میں آکر اس
نے تیسری مرتبہ چائے بنانے رکھی۔

”ایک کپ میرے لیے بھی۔“ پیچھے سے غزل
کی آواز آئی تھی۔ وہ مڑا نہیں۔ پانی بڑھادیا۔
”کل میں بھی روزہ رکھ رہی ہوں۔ تم چائے

بناؤ میں آلیٹ بنا لیتی ہوں۔“ وہ فریج سے سامان نکالنے لگی۔ وہ خاموش ہی رہا۔

اسے غزل سے گلہ تھا۔ وہ ناراض بھی تھا اور بدگمان بھی۔ سائر کے بارے میں وہ اسے بتا سکتی تھی مگر اس نے یہاں اس کا ساتھ دیا نہ ہی بان رکھا۔ جائے دوپ میں ڈال کر وہ ٹیبل پر آ بیٹھا۔ آلیٹ بنا کر اس نے بریڈ ٹوسٹر سے نکالے اور آ بیٹھی۔

”لو.....“

”نہیں شکریہ۔“ اس کا خشک انداز غزل نے صرف ایک لمحے کو اس کے پریشان ماتھے کو دیکھا پھر کھانے لگی۔

”تم نے سائر کے بارے میں مجھے کیوں نہیں بتایا۔“ وہ زیادہ دیر ضبط کرتا تو یقیناً بلاسٹ ہو جاتا۔
”صرف سائر نہیں۔ مصطفیٰ انکل بھی، انہوں نے بھی مجھ سے کوئی چٹ کیا ہے مگر سوری میں می کو ناراض نہیں کر سکتی تھی۔“ اطمینان سے بریڈ ٹوسٹ کے ساتھ آلیٹ کھاتی وہ بتا رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا۔

”ابو نے؟ کب فون کیا تھا۔“

”انہوں نے دوبار رابطہ کیا تھا بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے بھی ان کی کال آئی تھی۔ وہ شیور ہیں کہ میں جانتی ہوں تم کہاں ہو۔ سوری میں بہت کٹمی میل کرتی ہوں مگر.....“

”مگر کیا.....؟“ وہ تلخ ہوا۔

”وجدان۔ یوں مگر چھوڑ آنا اور منہ چھپا کر ساری دنیا سے ناراض ہو کر بیٹھ جانا تو کم اہمیتی ہے۔ تم نے مجھے بہت ڈس اپائنٹ کیا ہے۔“

”اگر تمہیں سونیا آنٹی یہاں سے نکل جانے کو کہیں تو تم کیا کرو گی؟“

”میں ایٹ لیسٹ وہ نہیں کروں گی جو تم نے کیا ہے۔ میں ان سے وجہ پوچھوں گی۔ ان سے بات کروں گی۔ کنوینس کرنے کی کوشش کروں گی مگر یوں بھی نہیں اپنا گھر نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ صاف کوئی اور کمرے لہجے میں بولی۔

”سونیا آنٹی نے جان بوجھ کر مجھے میری ماں کے خلاف بھڑکایا۔ غلط بیانی کی۔“ اب کی بار وہ چوکی۔ وہ سخت براہم تھا۔

”میں نے رات کو تم لوگوں کی گفتگو سن لی تھی۔“ غزل نے اب سلاکس رکھ لیا۔

”انہوں نے مجھے مس گائیڈ کیا۔ میں۔“

”غلط..... انہوں نے کچھ نہیں کیا۔“

وہ پرسکون انداز میں اس کی بات کاٹ گئی۔ بلیک ٹراؤز اور شرٹ میں ملبوس اس نے بالوں کو پونی میں باندھ رکھا تھا۔ اس عام سے حلے میں بھی وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

”بلکہ تمہاری اپنی کمزوری ہے۔ کوئی کچھ بھی تمہارے پیرنٹس کے متعلق بول دے گا اور تم اس پر یقین کر لو گے؟ ہاؤ اس پاسیبل۔ تم کیسے کسی کے کہنے پر اپنے والدین کو جھٹیلنا کر سکتے ہو۔ غلطی دوسرے کی نہیں ہوتی وجدان مصطفیٰ! بلکہ خود ہماری ہوتی ہے جو خود سے منسلک رشتوں کو ٹھنڈ نہیں کر پاتے اور جلد ہی بدگمان ہو جاتے ہیں۔“

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ غلطی اس کی نہیں تھی۔ وہ کیا اپنی ماں کو نہیں جانتا تھا؟ جو سربا محبت و ایثار تھیں۔ پھر سونیا آنٹی کے کہنے پر وہ کیسے انہیں غلط قرار دے گیا۔ غزل اب پھر سے آلیٹ کھانے لگی تھی۔

”تمہیں سونیا آنٹی کے بارے میں جان کر برا نہیں لگا۔“ اس نے بغور اسے دیکھتے سنجیدگی سے سوال کیا۔ غزل گہری سانس لے کر مسکرائی۔

”وجدان وہ میری ماں ہونے سے پہلے ایک لڑکی بھی تھیں۔ ان کا ایک ماضی بھی ہوگا۔ اس وقت ان کے کچھ خواب ہوں گے۔ ٹھیکو ہوں گی اور یہ تو بچپن کی بات ہے۔ ہر انسان کا کوئی آئیڈیل ہوتا ہے۔“

جب ہم خود اس عمر میں ایسے مرحلے سے گزر رہے ہیں تو پھر اگر ہمارے پیرنٹس بھی گزرے ہوں تو ہمیں اتنا جھنجھل نہیں ہونا چاہیے۔ آفر آل

ایموشنز تو سب کے پاس ہوتے ہیں۔“
وہ بہت پر یکیشگی تھی اور شاید ٹھیک کہہ رہی تھی۔

وجدان نے ٹھنڈی بخ چائے ایک سانس میں اپنے اندر اٹھ لی۔ غزل بھی سحری کر چکی تھی۔ اس نے گہری سوچ میں کم وجدان کو دیکھا۔ اس کی ہیزل براؤن آنکھیں سرخ تھیں جیسے کئی راتوں سے سویا نہ ہو۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ادھر مطمئن نہیں تھا۔

یہی سچ وقت تھا جب وہ اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر رہی تھی جو اس نے مصطفیٰ ہمدانی کی کال کے بعد کیا تھا اور اس پر مہر سونیا سے ہونے والی بحث کے بعد لگی تھی۔

”وجدان تم اپنے گھر چلے جاؤ اور ہو سکے تو ہمارے رشتے کو بھی بھول جاؤ۔“ چونک کر غزل کو دیکھا جو بڑے نارمل انداز میں کہہ رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں یہ تعلق آگے جا کر ہماری مشکلات بڑھائے گا۔ تمہاری فیملی مجھے کبھی ایکسیپٹ نہیں کرے گی اور نہ ہی میں ان میں شاید ایڈجسٹ کر پاؤں۔ پھر میں نہیں چاہتی کہ ماضی کے ایٹوز کو لے کر پائیلکس کی جائے۔ میں اپنی زندگی بہت فوکسڈ ہو کر پرسکون گزارنا چاہتی ہوں۔ یہ خاندانی جھگڑے، پرانے قسے، طنز یہ باتیں میں یہ سب انورڈ نہیں کر سکتی۔“

”یہ اچانک سے فیصلہ کیوں بدل رہی ہو تم میں اب بھی وہی ہوں۔ میری فیملی بھی پھر یوں یہ سب اب تمہیں کیوں محسوس ہونے لگا ہے۔“ اس کا یوں فیصلہ کر لینا اسے سمجھ نہ آیا۔

”پہلے شاید میں نے ان باتوں پر زیادہ غور نہیں کیا مگر اب جب سے تم آئے ہو میں نے دیکھ لیا ہے تمہاری فیملی کے ساتھ تمہاری بوڈنگ کتنی اسٹرابنگ ہے۔ فرض کرو اگر ہم لوگ رہ بھی لیں تب بھی تم کبھی ان سے الگ نہیں ہو پاؤ گے۔ پھر می سے وہاں سب ان سیکور رہیں۔ کوئی انہیں پسند نہیں کرتا اور شاید می بھی“

”مگر ہم دونوں تو ایک ساتھ خوش ہیں ناں۔“

”ہم اب ہیں مگر سوچو جب ہم ایک فیملی بن جائیں گے تب یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہمارے تعلق میں بہت بڑی دراڑ پیدا کر دیں گی۔ یہ سفر آسان نہیں ہوگا اور نہ ہی خوش گوار۔“ وہ شاید فیصلہ کر چکی تھی۔ وجدان کے اندر دھواں بھرنے لگا۔ شاید غزل کا اتنا مضبوط انداز اس کی انا کو ہرٹ کر گیا تھا۔

”یہ سب تم سونیا آنٹی کو ڈیفنڈ کرنے کی وجہ سے کر رہی ہونا۔“

”ہاں۔“ اس نے بغیر کسی پس و پیش کے مان لیا۔

”مٹی تم سے بہت دفعہ بڑے بڑے اماؤٹس لے چکی ہیں۔ وہ جھپتی ہیں کہ میں یہ بات نہیں جانتی (یہ بات بھی اسے مصطفیٰ ہمدانی نے بتائی تھی) وہ مستقبل میں بھی ہمارے تعلق کو شاید مزید کیش کریں مگر میں ایسا نہیں چاہتی کہ تم انہیں کبھی کسی بھی موقع پر ہلکا سمجھو۔“

ان کی عزت تمہاری نظروں میں نہ ہو۔ یہ فیصلہ ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے وجدان۔ اگر ماضی میں اتنا سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو میں کبھی یوں پیچھے نہ ہتی۔ تم مجھے پسند ہو اور رہو گے مگر آگے چلنا شاید ہمارے نصیب میں نہیں۔“

اس کا انداز بہت کمپوزڈ تھا۔ وہ اپنی ماں کی عزت کی خاطر اسے چھوڑ رہی تھی وہ چند لمحوں میں جیسے سمجھ گیا۔ اسے وہ بہت عزیز تھیں۔

”تم صرف ان کی وجہ سے، صرف ان کی عزت کی خاطر یہ سب کر رہی ہو۔“

”ہاں وجدان۔ سب سمجھتے ہیں کہ وہ ایک سیلفش عورت ہیں۔ جنہوں نے ہمیشہ صرف اپنے لیے سوچا۔ خود کو خوش رکھا مگر ایک چیز انہوں نے خالص کی۔ مجھ سے محبت۔ ڈو یو نو وجدان، کہ میں ان کی سگی بیٹی نہیں بلکہ اسٹیپ ہوں۔“ یہ انکشاف اسے دم بخود کر گیا۔ وہ قدرے افسردگی سے مسکرائی۔

”ڈیڈ سے ان کی دوسری شادی تھی۔ مام کے مرنے کے بعد ڈیڈ نے مجھے بورڈنگ ڈلوادیا۔ مگر سونیا

می نے کبھی مجھے سوتیلے پن کا احساس نہیں دلایا۔ ان میں ہزاروں عجب سہی مگر میرے لیے وہ کیا ہیں میں ڈیٹا بند نہیں کر سکتی۔“

وہ کیا کہہ رہی تھی؟ وجدان مصطفیٰ کے وجود پر اس کے الفاظ چابک بن کر برس رہے تھے اور وہ کیا کر رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں مام مجھے تمہارے ذریعے کیش کروانا چاہتی ہیں مگر میں پھر بھی ان سے محبت کرتی ہوں ان سے بدگمان نہیں ہو سکتی۔ ڈیڈ کے بعد ہم نے بہت ٹفٹ ٹائم گزارا ہے۔ ساری برابری سیل ہو چکی تھی صرف تھوڑا بہت بچا تھا اگر وہ چاہتی تو مجھے چھوڑ کر جا سکتی تھیں کہ میں ان کی ذمہ داری نہ بھی نہ ہی سکی اولاد مگر انہوں نے ہی میری تعلیم مکمل کروائی۔

میرا ساتھ دیا پھر ان کے انسٹ کرنے پر ہم یہاں آ گئے۔ یہ بنگلہ بھی ریٹ کا ہے۔ انہیں ایسی ہی زندگی پسند ہے لکڑی والی۔ اور ان کی خاطر میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ مجھے کمپنی کی جانب سے دی بھیجا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم کچھ عرصہ میں موو کر جائیں۔ عارف۔ میرے پاس نے مجھے پروپوز کیا تھا مگر میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن اب میں نے ریٹائر کیا ہے کہ وہ ساتھ اتنا خوش گوار شاید نہ ہو جیسا ہم نے سوچا ہے۔ اب میں شاید ان کا پروپوزل ایکسپٹ کر لوں۔

اور یہاں سے ہمارا چلے جانا ہی بہتر ہے۔ می کے لیے بھی اور تمہاری فیملی کے لیے بھی۔“ سائر نے کب سے بچ رہے تھے۔ غزل اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر وجدان کو ایک نظر دیکھا وہ سنائے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ محبت کا کون سا روپ ہے.....؟

☆☆☆

اسے ابو کے الفاظ یاد تھے۔ گیٹ سامنے تھا۔ وہی گیٹ جس سے وہ بڑے طعنا و زعم سے نکلا تھا۔ اسے دائمیقین تھا کہ وہ وہاں دوبارہ نہیں آئے گا۔ جب تک وہ لوگ خود اسے منا کر نہیں لے جاتے۔ اس

وقت اس کی انا شاید ہی کبھی جھکنے دیتی مگر آج اسے احساس ہوا کہ محبت صرف لینے کا نام نہیں۔ یہ تو تھوڑی سی عنایت کے بدلے سب کچھ دان دے دیتی ہے۔ بغیر کسی طمع کے بغیر کسی واپسی کے تقاضے کے۔ رشتے نبھانا بھی ایک فن ہے اور وہ آج تک اس فن سے نا آشنا ہی رہا۔ اور غزل وہ اسے کہیں اوپر بلندی پر کھڑی نظر آئی۔

اس کے ارد گرد کئی رشتے تھے جبکہ اس کے پاس صرف ایک اکلوتا سوتیلے رشتہ۔ وہ جو ایک ماڈرن جدید دور کی لڑکی تھی۔ محبت نبھانے اور قدر کرنے میں اس سے کہیں بڑھ کر نکلی۔ جسے اس کے گھر کی خواتین پسند نہیں کرتی تھیں، جن کے خیال میں وہ ایک فیشن زدہ لڑکی ہے جو قدر دان نہیں ہوگی اسے واپسی کے راستے پر لے آئی تھی۔ ضروری تو نہیں کہ بظاہر ایڈوائس نظر آنے والی لڑکی ہمیشہ ہی غلط ہو۔ روایات سے باغی ہو۔ غزل کے فیصلے نے اس کا دل خالی ضرور کیا تھا مگر وجدان کو اب اس کے فیصلے کا نہ صرف احترام کرنا تھا بلکہ مان بھی رکھنا تھا۔

”جہاں آراء آئی بہت بیمار ہیں۔ سائر نے بتایا تھا کہ وہ ہاسپٹالز ڈر ہی ہیں۔ ان کا حق تم پر سب سے زیادہ ہے وجدان۔ تم چلے جاؤ اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے اور پچھتاوے باقی رہ جائیں۔“

اور شام کو وہ اسی گیٹ پر کھڑا تھا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اسے ابو کے الفاظ ابھی طرح یاد تھے۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ بہادر ہے۔ غلطی کر کے سدھارنا بھی جانتا ہے اور نبھانا بھی۔ ہال میں وسیع دسترخوان بچھا ہوگا اور سب افطاری کے لیے موجود ہوں گے۔ ذہن میں تصور ابھرا تھا۔ ہلکی سرگوشیوں اور بچوں کی آوازوں کے علاوہ کوئی صدا نہ تھی۔ اگلے ہاتھ پر راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔

جہاں آرا جائے نماز پر بیٹھی بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ سفید دوپٹے کے ہانے میں ان کا پر نور چہرہ کیسا کمزور لگ رہا تھا۔ کوئی جانی پہچانی خوشبو محسوس ہوئی۔ ان کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ یہ مانوس خوشبو

کس کے وجود کی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے بتا سکتی تھیں۔ وہ پیچھے سے آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور دونوں ہاتھ ان کے گلے میں ڈال کر سر کا ندھے پر ٹکا دیا۔

”وجدان۔“ ان کے لب بے آواز ہلے۔ وہ آ گیا تھا۔ یقین تھا کہ آئی نہیں رہا تھا۔ دل اپنی لے بدل رہا تھا۔

”مجھے معاف کر دیں امی.....“ اس کے گھنے نرم بالوں والا سر ان کے شانوں پر تھا۔ گرم آنسو انہیں اپنی گردن پر رینگتے محسوس ہوئے۔ وہ مل بھی نہیں رہی تھیں کہ اگر یہ کوئی خواب ہے تو ٹوٹ نہ جائے۔ لیکن وہ گرم سیال حقیقت تھی۔ ان کا گوہر مراد جو وہ رب سے اتنے دنوں سے مانگ رہی تھیں لوٹ آیا تھا۔ آہستگی سے مڑ کر انہوں نے دیکھا۔ ان کا ناراض بیٹا۔ ان کا وجدان۔ ایک تڑپ سے انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ دونوں رو رہے تھے۔ ہچکیوں سے۔ ان گیارہ دنوں نے انہیں سب سمجھا دیا۔ ان کی کوتاہیاں، اس کی محرومیاں، سائر نے بھی انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اپنی غلطیوں کا احساس دو چند ہوا۔ اس کے گلے، اس کی حسرتیں سب بجا تھیں۔ وہ اسے چومتے پالے جا رہی تھیں۔

”کوئی یوں بھی ناراض ہوتا ہے؟“ وجدان اتم نے یہ کیسے سوچ لیا مجھے تمہاری پروا نہیں تھی۔ تم سے محبت نہیں تھی۔ مانا کہ یہ میری کمزوری تھی۔ میری غلطی تھی کہ اپنی استطاعت سے زیادہ بوجھ اٹھا لیا۔ کہیں وہ وقت نہ دے سکی جو تمہارا حق بنتا تھا مگر۔“

بدر ہل چلے بولتی وہ روئے جا رہی تھیں۔ اسے پیار بھی کر رہی تھیں۔ اذان کی آواز فضا میں گونجی۔ وجدان نے ان کے ہاتھ تمام کر لیوں سے لگائے۔ ”مجھے میری بدگمانی پر معاف کر دیں۔ میں جان گیا ہوں کہ اس روئے زمین پر مجھ سے اگر کوئی سب سے زیادہ محبت کرتا ہے تو وہ آپ ہیں۔“ ان کا بے جلا دل شانت ہو گیا۔ مسکرایا۔ ان کے

آنسوؤں سے تر چہرے پر بکھری۔

”تمہارا روزہ ہے؟“ اس نے سر ہلایا۔

”دیکھو ذرا مجھے۔ اذانیں کب سے ہو رہی ہیں تم یہ پانی سے افطار کرو۔“ وہ اٹھ کر جگ سے پانی اٹھیلنے لگا اسی لمحے کھلے دروازے سے بیٹا ٹرے پکڑے اندر آئی۔

”امی دیر ہو گئی یہ.....“ مگر وجدان کو دیکھ کر ایک لمحے کو حیران ہوئی پھر بے ساختہ پیچ پڑی۔ ”بھائی“ ٹرے رکھ کر وہ بھاگ کر اس کے سینے سے آگئی اور رونا شروع کر دیا۔ وجدان نے نرمی سے اس کے گرد بازو لپیٹے۔

جہاں آرا کی نظر ایک لمحہ بھی۔ اس پر سے نہ ہٹ رہی تھی۔ لمحوں میں ہی سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ریحان بھائی۔ بھابھی۔ سائر۔ ابو سب کے چہروں پر حقیقی خوشی تھی۔ وہ خود اپنے گزشتہ خیالات پر پشیمان تھا۔ وہیں غزل کا شکر گزار بھی ریحان بھائی اسے کئی بار گلے لگا چکے تھے۔ بھابھی جھٹ پٹ اس کے لیے ٹرے سجا کر لے آئیں۔

سونا نے خوشی خوشی آپوں کو بھی فون کمر کا دیا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ سویا کمر آوازوں سے گونجنے لگا۔ سب کے درمیان بیٹھے وجدان کو یہ افراتفری بری نہیں لگ رہی تھی۔ ہانیہ نے تالی جان کے کھلے چہرے کو دیکھا پھر وجدان متعلقہ کو۔ اسے اپنا وعدہ یاد تھا۔ وہ مان رکھنا جانتی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس سفر میں گو کہ مشکلات ضرور آئیں گی مگر اپنے صبر و ایثار سے وہ سب منزلیں پار کر لے گی۔

وہ رات بہت خوب صورت رات تھی۔

عید کے جائید کا اعلان ہو گیا تھا۔ گھر میں ایک خوش گواری پہنچ گئی۔ دونوں لڑکیاں بھی اپنے بچوں سمیت آچکی تھیں۔ اور وجدان کے افسردہ دل نے بھی اعتراف کر لیا کہ غزل کو کہ اس کی محبت نہ سہی مگر بہت خاص جگہ اس کے دل میں بنا چکی تھی۔ آگے کا سفر شاید دشمن نہ ہو مگر وہ اسے یاد ضرور رہے گی۔

☆☆

عید کی سحر و شیاں

”ارے اماں! یہ شیر خورما تو بہت مزے کا بنایا ہے آپ نے۔“ شاکرہ نے تیسری بار شیر خورما پیالے میں نکالتے ہوئے تعریف کی۔

”ارے تو جی بھر کر کھاؤ نا۔ جب سے میرا شیر امریکہ گیا ہے میں تو ہاتھ کھول کر خرچ کرنے لگی ہوں در نہ تیرے اماں کے دور میں تو ہمیشہ ترستے ہی رہے۔ ہر ڈھانچہ تو پیر ننگے، پیر ڈھانچہ تو سر ننگا۔ اسی کھینچا تالی میں گزر رہی تھی زندگی، وہ تو شکر ہوا میرا ہر نکل گیا اور ہمارے دن پھر گئے۔“

”تو بیگم صاحبہ آخر بیٹا کس کا ہے؟ میرے جیسا“

مختی ہے۔“ اماں نے شاکرہ کے مقابلے پر شیر خورما کھا رہے تھے۔

”اب رہنے دو منہ نہ کھلواؤ میرا، تمہارے دور میں تو بس موٹی امی سوتیوں — پر چینی چمڑک کر کھا لو۔ بھی چمچ بھر دودھ بھی نصیب نہ ہوا ان پر ڈالنے کے لیے۔“ اماں کے طعنوں کی پٹاری کھل جاتی تو اسے بند کروانا مشکل ہو جاتا ہے۔

”اماں! بس کر دیں بھائی سے پہلے ابا ہی گھر چلا رہے تھے۔ آپ تو لٹھ لے کر پیچھے بڑ جاتی ہیں۔“

شاکرہ کو ماں کا یوں طعنہ زنی کرنا بڑا اگلتا تھا۔



”اچھا چل، اب باپ کی چمچی نہ بن، جلدی ختم کر شیر خور ما اور بانی ڈونگوں میں ڈال کر محلے میں سب کے گھر دے کر آ۔ اسی لیے میں نے بڑا پتلا بھر کر بنایا ہے۔ محلے والوں کو پتا چلے کہ گھر میں امریکی ڈالر آرہے ہیں۔“ اماں نے فخر سے اپنے دس ہزار کے عید کے جوڑے کا دو پتاسر پر دست کیا۔

”تمہیں میں پہلے بھی بڑی دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ اپنی اس شو شا کی عادت پر قابو پاؤ اور بیٹے کی کمائی کو سنبھالو، ہمسایوں میں شیر خور ما ضرور بھیجے مگر یوں ڈونگے بھر بھر کر بھیجنے کا مقصد صرف اپنی واہ واہ کروانا ہے تو بہت غلط ہے۔“ ابا نے ہمیشہ کی طرح اماں کو ٹوکا۔

”تم تو بس موقع کی تلاش میں رہا کرو۔“ اماں نے ہاتھ ہلا کر ابا کو چپ کروایا۔

”چل تو اٹھ کر آ میرے ساتھ نکال کر دوں تھے شیر خور ما۔“ اماں شاکرہ کو حکم دے کر خود کچن میں چلی گئیں۔

”ابا آپ اماں کی بات میں دخل اندازی نہ کیا کریں۔“ شاکرہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”بیٹی، ایک میں اور ایک تم ہی ہو جسے فرحان کی محنت اور کمائی کی قدر اور فکر ہے۔ باقی تو تم دیکھ رہی ہو تمہاری اماں تمہاری بڑی دو بہنوں کے ساتھ مل کر کیسے دونوں ہاتھوں سے پیسے اڑاتی ہیں۔“ شاکرہ نے ٹھنڈہ آہ بھری کہ وہ دونوں باپ بیٹی چاہ کر بھی کسی کو کچھ نہیں سمجھا سکتے تھے۔ اس عید پر اماں اور دونوں بہنوں نے دس دس ہزار کے تین تین جوڑے بنائے تھے اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود اسے بھی زبردستی لے کر دیے تھے اور دس باتیں بھی سنائیں جو ناشکری کر رہی تھی۔ وہ انہیں بتا ہی نہ سکی کہ وہ ناشکری نہیں کر رہی صرف اسراف سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے۔

☆☆☆

”چل شاکرہ، میرے پتر کو کال ملا، اسے عید کی مبارک باد تو دے دوں۔ ابھی ہی بات کر لیتی ہوں

شام تک تمہاری بہنوں نے آ جانا ہے تو پھر کے فرصت ملتی ہے۔“ سارے محلے میں شیر خور ما بھجوانے کے بعد اماں نے شاکرہ کو نیا حکم دیا۔

شاکرہ نے فرحان کو ویڈیو کال ملائی۔ شاکرہ نے بھائی سے سلام دعا کے بعد اسے عید کی مبارک باد دی اور فون اماں ابا کے حوالے کر دیا۔ خود کچن سمیٹنے چلی گئی۔ رات کا کھانا اماں نے اک مشہور ریستورانٹ سے آرڈر کرنا تھا۔ کچن سمیٹ کر آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آئی تو اماں کال کے بعد فون میز پر رکھ رہی تھیں۔ شاکرہ بھی ان کے پاس بیٹھ گئی۔ معا کرے میں فرحان کے روم میٹ کی آواز گونجی۔

”یار فرحان، تم نے آج عید کے دن بھی ڈبل شفٹ کی ہے۔ ہمارے ساتھ عید کا ذکر کرنے بھی نہیں گئے۔“ تینوں نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اماں ابا فون کر کے بھی خود سے کال بند نہیں کرتے تھے۔ شاکرہ ہی فون لے کر کال بند کر لی تھی۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔ انہوں نے کال ڈس کنیکٹ نہیں کی تھی اور شاید ادھر سے فرحان کی کال بھی آن رہ گئی تھی۔

”یار، تمہیں پتا تو ہے سب کچھ پھر بھی۔“

”پتا ہے مجھے، ہم سب کے حالات کم و بیش ایک جیسے ہیں مگر تم تو بالکل ہی اپنی ذات کو فراموش کر بیٹھے ہو۔ عید پر ایک نیا جوڑا تک نہیں بناتے۔ اب بھی مجھے پتا ہے دو پہر کو ایک سستے والا برگر ہی کھایا ہو گا تم نے ایک کپ کافی کے ساتھ۔“ اماں ابا اور شاکرہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شاکرہ نے اٹھ کر کال بند کرنے کی کوشش کی تو ابا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ فرحان کا موبائل شاید الٹا رکھا ہوا تھا کہ آواز تو آرہی تھی مگر اسکرین سیاہ تھی۔

”یہ لے میرے کنجوس یار! عید کی خوشی میں میری طرف سے کھانا۔“ فرحان کے دوست نے شاید کھانے کا لفافہ باہرے اس کی طرف بڑھالی تھی۔

”کنجوس نہیں ہوں یار، تمہیں پتا تو ہے بیرون ملک آنا، یہاں نوکری کرنا میری مجبوری تھی، میں نے

دن رات محنت کی تاکہ میں اچھی سی ملازمت حاصل کر سکوں۔ میں نے اپنے ملک میں بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا اس لیے کوشش کر کے یہاں آ گیا میرے ابا نے ہمارے لیے بہت محنت کی تھی۔ یہاں آنے کی بنیادی وجہ زیادہ پیسے کمانا تھا۔ میں اماں کے ہاتھ میں زیادہ پیسے رکھنا چاہتا تھا تاکہ وہ اپنے ارمان جو اب تک ہماری ضروریات پوری کرنے کی وجہ ماری رہی ہیں نہ ماریں۔ ابا نے بہت محنت کرنی۔ ہمارے لیے جدوجہد کرتے رہے اپنی ذات کو پس پشت ڈالتے رہے، میں دیار غیر اس لیے آ گیا تھا کہ میرے اپنوں کے صبح و شام برسکون گزریں۔ میں عید کے دن ڈبل شفٹ اس لیے کرتا ہوں کہ مجھے گھر والے یاد نہ آئیں اور میں چار پیسے زیادہ کمالوں تو کیا خرچ ہے۔ اس میں۔ ویسے بھی اپنوں کے بغیر کیسی عید۔ ”فرخان کا لہجہ ان تینوں کو نرم سا محسوس ہوا۔

”مگر تم تو عید پر گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے نا؟“ فرحان کے روم میٹ نے پوچھا۔

”ہاں یار، چوتھا سال ہے گھر والوں سے دور ہوئے، سوچا تھا اس سال روزوں میں گھر چلا جاؤں گا اور عید گھر والوں کے ساتھ مناؤں گا مگر روزوں سے پہلے اماں کی کال آ گئی کہ عید کے بعد خالہ کے بیٹے کی شادی ہے اور انہوں نے کھلے ہاتھ سے دینا دلانا کرنا ہے اس لیے زیادہ پیسے بھیجوں تو میں نے ٹکٹ کے لیے رکھے پیسے سائیڈ پر کر دیے کہ عید کے بعد انہیں بھیج دوں گا۔“

اماں نے پانی بھری آنکھوں سے جیسے اماں کو دیکھا ان کے کلیجے پر ہاتھ پڑا۔

”یار! ایک بات کہوں برا نہ ماننا ویسے اتنا بڑا کنبہ نہیں ہے تمہارا، جتنا تمہارے گھر والے خرچ کرتے ہیں۔“

”نہیں یار، اماں بتاتی رہتی ہیں پاکستان میں بہت مہنگائی ہو گئی ہے۔ تم میری اماں کو جانتے نہیں، وہ تو ایک ایک پیسہ گن گن کر خرچ کرتی ہیں۔ بس جو فضول خرچی کی ہوا انہوں نے یا ہمیں کرنے دی ہو تو اب بھلا وہ کیوں زیادہ خرچہ کریں گی۔“ فرحان نے

فورا اپنی ماں کا دفاع کیا۔

”اچھا یار، جا تو کپڑے بدل کر اپڑی ہو کر آ میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتا ہوں، پھر کافی پیئیں گے۔“ وہ دونوں وہاں سے چلے گئے تو آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔ شاکرہ نے اٹھ کر کال بند کی۔ اماں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ ابا کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

”اماں! میں اور ابا آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔“ شاکرہ صرف اتنا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”ہم لوگ باہر جانے والے بیٹے کی کمائی کو یوں بے دردی سے خرچ کرتے ہیں جیسے وہاں پیسے درختوں پر اگتے ہوں۔“ ابا یہ کہہ کر اٹھے تو اماں نے ان کا ہاتھ تھام کر دوبارہ بٹھالیا۔

”میں نے اپنے بیٹے کو پیسے کمانے کی مشین اور سونے کی کان سمجھ لیا تھا۔ عید پر تو ہمیں غیروں کو بھی خوشیوں میں شامل کرنے کا حکم ہے میں کیسی ماں ہوں کہ اپنی خواہشات کی اندھی تکمیل میں اپنے بیٹے کو عید کے دن دکھ دے بیٹھی ہوں۔ اتنے سالوں سے میرا بیٹا اپنوں کو ملنے کے لیے ترس رہا ہے اور ہمیں صرف اس کے بھیجے گئے پیسوں اور چیزوں کا انتظار رہتا ہے۔“ اماں کا ملال انہیں زار و قطار رلا رہا تھا۔

”اب تو جو ہونا تھا ہو گیا، اب رونے کا کیا فائدہ ہے۔“ ابا کا دل پسینا تو نرم لہجے میں کہا۔

”میں آج سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اپنے بیٹے کی کمائی کو امانت سمجھ کر خرچ کروں گی۔ میں آپا کے بیٹے کی شادی کے لیے مانگے گئے پیسے اس سے نہیں لوں گی۔ میں کہوں گی میری کیٹی کل گئی ہے اور اس سے کہوں گی کہ ہم اس کے بغیر اداس ہو رہے ہیں۔ وہ بڑی عید ہمارے ساتھ پاکستان میں منائے تاکہ میرا بیٹا بھی عید کی خوشیاں منا سکے۔“ اماں نے اپنے آنسو صاف کیے۔

”چلو ہمیں کسی بہانے تو عقل آئی۔“ ابا نے اماں کو چھیڑا اور پہلی بار وہ ناراض ہونے کے بجائے مسکرا دیں۔

☆☆

سکھ کر عیادت

ناولٹ

کرن کی طرف دیکھا۔
”کلاسز جو ان کرنے کی کیا ضرورت ہے
ہماری ساس تو بہترین کھانے پکاتی ہیں ان کے
پکائے ہوئے کھانوں کی تو ہر کوئی بہت تعریف
کرتا ہے۔ انہوں نے مجھے بھی کوکنگ سکھائی ہے اب
وہ کرن کو بھی سکھادیں گی۔“

کرن کی ساس قریب ہی بیٹھی تھیں اس لیے
جیٹھانی کی آواز بھی خاصی اونچی ہو گئی تھی۔ بہو کی
تعریف سے ساس کا سر بھی فخر سے بلند ہو گیا۔
”بہت ہی اچھی ساس ہیں جو بہو کو خود کام
سکھاتی ہیں۔“ ان عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی کسی
دل جلی بہو نے اپنی ساس کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہ
بھرتے ہوئے کہا۔

”بھئی ہم تو اپنی بہوؤں کو بیٹیوں سے بڑھ کر
چاہتے ہیں۔ ہم نے تو آج تک بھئی اپنی بہو سے تیز
لہجے میں بات نہیں کی۔“

کرن کی ساس کے اس جملے پر کرن کی ماں کا
دل ڈوب سا گیا تھا۔ ان کی ساس بھی سب سے پہلی
کہتی تھیں لیکن یہ تو وہی جانتی تھیں کہ ان کے ترکش
میں بہو کے لیے کیسے کیسے زہریلے تیر چھپے ہوتے ہیں
جو نرم لہجے کی کمان سے چھوڑتے جاتے ہیں اور
سیدھے دل پر جا کر لگتے ہیں۔

”ہماری کرن بہت خوش قسمت ہے جسے ایسی
ساس ملی ہیں۔“ بڑی بھابھی ماریہ کی تعریف نے کرن
کی ساس کے چہرے کو مزید روشن کر دیا۔ جو ویسے ہی
بیٹے کی ماں ہونے کی وجہ سے دمک رہا تھا۔

☆☆☆

”شود کھانے پینے کا بہت شوقین ہے۔“ وہ جو
مایوں کے زرد اور سبز گوٹے کے کام کے جوڑے میں
ملبوس آنے والے خوش گو اور لمحوں کے تصور میں کم تھی۔
جیٹھانی کے اس انکشاف پر جو اس کی بھابھی کی
بہن بھی تھیں، ایک لمحے کو چونک گئی۔

”تو ہماری کرن کون سی کم شوقین ہے۔ آئے
دن آرڈر پر نئے نئے کھانے منگوائے جاتے
ہیں۔“ سارہ، کرن کی چھوٹی بھابھی کم دوست زیادہ
تھیں، فوراً جواب دیا۔

”ویسے شود دیکھنے میں تو نہیں لگتا کہ کھانے کا
شوقین ہوگا اس قدر تو اسماٹ اور سلم ہے۔“

کرن کی بڑی بھابھی ماریہ جن کی کوششوں سے
یہ رشتہ ہوا تھا، کرن کو دیکھ کر دھیمے سے بولیں۔ دھیمے
دھیمے لہجے میں بات کرنا ان کی عادت تھی اور ان کی یہ
عادت بھی تھی کہ ہر کسی میں کوئی نہ کوئی تعریف کا پہلو
نکال لیتیں اور بڑھا چڑھا کر اس کی تعریف کرتیں۔
ان کی اس عادت نے پورے خاندان کو ان کا گرویدہ
بنادیا تھا۔

”اس کی اسماٹنس کا راز یہ ہے کہ وہ باہر کا کھانا
نہیں کھاتا۔ اسے ہر وقت گھر کا بنا ہوا تازہ کھانا
چاہیے ہوتا ہے۔“ کرن کی جیٹھانی ماریہ نے ایک اور
انکشاف کیا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ ابھی مایوں کی
تقریب تھی اس کے لیے دونوں پارٹیوں کو ایک
دوسرے کی ہر بات اچھی لگ رہی تھی۔

”اس کا مطلب ہے کرن کو کوکنگ کی کلاسز
جوائن کرنی پڑیں گی۔“ چھوٹی بھابھی نے مسکرا کر

اب اتنی بے تحاشا محبتیں۔ پا کر اس کا نازک مزاج ہونا تو بنتا تھا۔ گھر میں سوائے دادی کے سب اس کی ناز برداری کرتے، اس کی ہر ضد پوری کی جاتی۔ دادی مزاجاً بھی سخت تھیں اور بچوں کی تربیت کے معاملے میں خاص طور پر لڑکیوں کے معاملے میں تو بہت ہی سخت تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ ان کی چاروں بیٹیاں اور دونوں بیٹے بے حد لائق فائق اور مہذب تھے۔ بچوں کے جوان ہونے کے بعد بھی کسی اولاد کی یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ ماں کے سامنے ہر اٹھا کر بات کر سکتا۔ وہ اپنے بیٹے اور بہو کو بیٹی کے ناز و نخرے اٹھاتے دیکھتیں تو ہمیشہ سمجھاتیں۔

”بیٹا لڑکی کو پرانے گھر جانا ہوتا ہے۔ اس کی ہر ضد پوری نہ کیا کرو۔ اور نہ ہر بات کی تعریف کیا کرو کہ وہ اس کی عادی ہو جائے اور کسی کو خاطر میں نہ

کرن دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ بے حد خوب صورت اور نازک مزاج، دونوں بھابھیاں خاندان سے تھیں اور دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ کر کرن کو چاہتی تھیں۔ کرن اور اس سے بڑے بھائی میں پورے دس سال کا فرق تھا۔ امی ابا کے دل میں بیٹی کی خواہش تو تھی لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد یہ خواہش دل کے کسی کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی تھی اور پھر دس سال بعد خدا کا کرم ہوا اور کرن کی صورت میں اللہ کی رحمت ان کے گھر آ گئی۔

ماں باپ سے زیادہ دونوں بھائی کرن کے دیوانے تھے۔ لگتا تھا دونوں کی جان کرن میں ہے، امی ابا سے زیادہ وہ اس کے لاڈ اٹھاتے، انہیں تو کرن کی صورت میں جگمگانی آنکھوں والی گڑیا مل گئی تھی۔ جس کے ہنسنے پر وہ دونوں ہنستے اور رونے پر اداس ہو جاتے۔



اٹھائے اور اب تو دادی بھی اچھی خاصی عمر رسیدہ ہو چکی تھیں کہ ان کی بات کو اکثر سب سنی این سنی کر جاتے تھے لیکن اب یہ ان کی عادت بن گئی تھی کہ کوئی ان کی بات سنے یا نہ سنے وہ اپنی بات مسلسل دہرائی رہتی تھیں۔

کرن نے این ای ڈی یونیورسٹی سے الیکٹریکل انجینئرنگ میں سی ایس کر لیا تو بڑی بھابھی ماریہ اپنی بہن آریہ کے دیور کا رشتہ لیے آئیں۔ ان کی بہن اپنی سسرال میں بہت خوش تھی اور سسرال والوں کی بہت تعریف کرتی تھی۔

ان کے دیور شمو نے آئی بی اے سے بی بی اے کیا تھا اور ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی جاب کر رہا تھا۔ خاندان بھی بہت بڑا نہیں تھا ایک بڑا بھائی اور دو بہنیں تھیں۔

دونوں بہنیں شادی شدہ تھیں اور بڑے بھائی اور بھابھی اسلام آباد میں رہتے تھے۔ گھر میں صرف ساس اور سر سرتھے۔ سرفوج میں کرنل تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ملیر کینٹ میں پانچ سو گز پر بہت خوب صورت گھر خریدا تھا۔

جب بڑی بھابھی کی بہن آریہ اپنی ساس، سر اور شمو کو لے کر ان کے گھر آئیں تو ان لوگوں کی خوب صورنی، ان کے رکھ رکھاؤ اور ان کے مہذب انداز سے سب بہت ہی مرعوب ہو گئے اور جب وہ ان کی دعوت پر ان کے گھر گئے تو ان کا گھر، علاقہ اور گھر کا رہن بہن دیکھ کر تو انہیں کرن کی خوش قسمتی کا یقین ہو گیا اور امی کی تو یا چھیں ہی کھل گئیں۔

”میں نہ کہتی تھی کہ میری کرن بہت نصیبوں والی ہے۔ اسے ایسا سسرال ملے گا جہاں وہ راج کرے گی۔“ گھر آ کر امی دادی کے سامنے بلند آواز سے اس بات کو دہرائی تھیں کیونکہ اب دادی، ذرا اونچا سننے لگی تھیں۔ ☆☆☆

جب سے رشتہ طے ہوا تھا۔ دادی کرن کے پیچھے پڑ گئی تھیں ہر وقت یہی پہاڑہ پڑھتی رہتیں۔ ”بیٹا! گھر کے کاموں میں دلچسپی لو، کھانا لگانا سیکھو، تھوڑی بہت سلائی بھی سیکھ لو۔ کم از کم بٹن مانگنا

لائے۔ اسے سسرال جانا ہے اور سسرال کتنی بھی اچھی ہو سسرال ہی ہوتی ہے۔ وہاں رہنے کے لیے دل کو پارنا پڑتا ہے سر کو جھکانا پڑتا ہے۔“ اور دادی کی ان نصیحتوں کو تو اپنا سن کر مال دیتے لیکن امی کا منہ بن جاتا۔ ”میری بیٹی بہت نصیبوں والی ہے۔ ان شاء اللہ اسے ایسا گھر ملے گا، جہاں وہ راج کرے گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن سسرال میں راج کرنے کے لیے اپنے آپ کو مارنا پڑتا ہے۔“

”اللہ نہ کرے، میری بیٹی کو ایسے سسرال سے واسطہ پڑے۔“ امی دہل کر کہتی تھیں۔ دادی اس کی ہر بات پر نظر رکھتی تھیں۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز پر، اس کے بات کرنے پر، اس کے لباس پر، بھائیوں کے ساتھ کھیلنے کے طریقوں پر اور جتنا وہ اس کو سمجھاتیں، امی ساس کی ضد میں اس کا الٹ کرتیں۔ وہ سیلوئس فرائک پہننے کو منع کرتیں تو امی سارے فرائک بغیر آستینوں کے سلوائیٹیں یا خرید لیتیں۔ دادی سر میں تیل کی مالش کرتیں تو امی فوراً اسے نہلا دیتیں۔ وہ کھانے کے وقت موبائل استعمال کرنے کو منع کرتیں تو امی کھانے کے وقت موبائل ہاتھ میں تھما دیتیں، جب اس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تو دادی چاہتی تھیں کہ وہ گھر گریہستی کے کاموں میں دلچسپی لے۔ مگر امی یہ کہہ کر ساس کا منہ بند کرنے کی کوشش کرتیں۔ ”اچھی اس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ گھر گریہستی کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔“

ان دونوں ساس بہنوں نے سوچ لیا تھا کہ دونوں اپنے اپنے محاذوں پر ڈٹی رہیں گی اور دونوں کی جنگ میں گرنے کا کچھ سیکھا اور کچھ نہیں سیکھا۔

دادی نے اسے اٹھنے بیٹھنے کی نیز بات کرنے کا سلیقہ اور بزرگوں کا احترام کرنا سکھا دیا تھا۔ لیکن گھر کے کام کاج میں وہ بالکل ہی نمی اور کوری تھی۔ پھر دونوں بھائیوں کی شادیوں کے بعد جب بھابھیاں گھر میں آئیں تو دونوں نے ساس، سر اور شوہروں کے دل جیتنے کے لیے ان سے زیادہ اس کے ناز

لبوں سے ہنسی کی پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس کو اتنا خوش دیکھ کر امی نہال ہو جاتیں۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتے نہ مھلتیں۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ دودن سے اس کی ساس کی طبیعت خراب تھی۔ ان کو شدید قسم کا ڈائیریا ہو گیا تھا۔ اتنی زیادہ ڈی ہائیڈریشن ہوئی کہ انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا۔

وہ ایک دن اسپتال میں ایڈمٹ رہ کر گھر آ گئی تھیں۔ لیکن شمود نے انہیں سختی سے کام کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اسی لیے ناشتا بنانے کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر آ گئی۔

وہ شمود کے کہنے پر بچن میں آئی تو بہت زیادہ بزدل ہو رہی تھی۔ ابھی اس کی شادی کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شمود ناشتے میں مل دار پرائیوٹ اور تلا ہوا انڈا کھاتا ہے اور انڈا ابھی ایسا تلا ہو کر جس کی سفیدی پوری پکی ہو اور زردی جچی ہو۔ پرائیوٹ گول تہہ دار اور بہت اچھا سنکا ہوا ہونا چاہیے اسی طرح چائے کے حوالے سے بھی ان کے اپنے معیار تھے۔

وہ لوگ دودھ پتی والی چائے نہیں پیتے تھے ابھی بھی ان کے گھر میں چائے کو دم دے کر کھینچتی ہیں نکالا جاتا۔ اسے لی کوڑی سے ڈھکا جاتا۔ دودھ دانی میں دودھ گرم کر کے رکھا جاتا۔ چینی بھی الگ سے شوگر پاٹ میں رکھی جاتی۔ اس کے گھر میں تو دودھ پتی کی چائے بنتی تھی۔ جس میں پانی کے ساتھ ہی چینی چائے کی پتی اور دودھ ڈال کر ابال لیا جاتا۔

اس نے اللہ کا نام لے کر ابتدا کی۔ فریق کھولا۔ آٹا گندھا ہوا رکھا تھا۔ اس نے آٹا نکال کر سلیب پر رکھا اور فوراً پوٹیوب آن کیا۔ پرائیوٹ بنانے کی بے شمار ترکیبیں بتائی جاتی تھیں۔ اس نے سب سے آسان طریقے پر عمل کرنا شروع کیا۔ لیکن اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود نہ پرائیوٹ گول اور خستہ بن سکا اور نہ انڈا شمود کی خواہش کے مطابق تلا جاسکا اور چائے تو

تو سیکھ لو۔ تمہاری ساس بہت سلیقہ مند اور ہنرمند عورت ہیں تمہیں بھی کھر سنبھالنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔

وہ دادی کی ہدایات پر عمل کرنا بھی چاہتی تو امی اور بھابھیاں اسے بچن میں آنے ہی نہ دیتیں۔

”تمہیں بھی جو کرنا ہے اپنے سسرال جا کر کرنا۔ یہاں تو اب تم مہمان ہو۔ دل بھر کے آرام کرو، شادی کے بعد ساری زندگی یہی کام کرنے ہیں۔“

اس نے بھی ماں اور بھابھیوں کے جملوں کو پلو میں باندھ لیا اور بچن کا رخ ہی نہیں کیا۔ اب وہ سارا دن پانیٹ فلکس پر فلمیں دیکھتی یا شاپنگ کرتی اور آرڈر کر کے کھانے منگوانی رہتی۔ اور اب جب مایوں کے دن اسے پتا چلا کہ شمود تو باہر کا کھانا ہی نہیں کھاتا۔ وہ گھر کا پکا ہوا تازہ کھانا کھاتا ہے۔ اور اس کے گھر میں کک بھی نہیں ہے۔ اس کی ساس کھانا خود پکاتی ہیں تو وہ پریشان ہو گئی کھانا پکانا تو دور کی بات اسے تو ڈھنگ سے چائے بنانا بھی نہیں آتی تھی۔ اسے تو دالوں اور سبزیوں کے نام بھی نہیں پتا تھے۔

مایوں کے دوسرے دن اس نے اپنے خدشے کا اظہار بڑی بھابھی سے کیا تو بھابھی نے اسے پیار کرتے ہوئے سمجھایا۔

”گھبراؤ نہیں۔ آریہ کو بھی کچھ نہیں آتا تھا۔ تمہاری ساس نے ہی اسے سب کچھ سکھایا۔ وہ تمہیں بھی سکھا دیں گی۔“

بھابھی کے سمجھانے پر وہ کسی حد تک مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

شادی کے ہنگاموں اور شادی کے بعد شمود کی محبت پا کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ زندگی اتنی بھی خوبصورت ہوتی ہے۔ وہ ویسے کے دوسرے ہی دن ملایشیا چلے گئے پورے دس دن بعد پاکستان واپس آئے تو اس کی جون ہی بدل گئی تھی۔ خوشی اور مسرت اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ آنکھیں ہیرے کی طرح جھلک کر رہی تھیں اور بات بات پر

اس شکل کی بنی کہ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا نام دے۔

جب یہ ناشٹاڈ انگ ٹیبل پر سر و کیا گیا تو پہلے تو امی کے چہرے کے تاثرات بدلے پھر ثمود کا منہ بنا۔ صرف سسر نے اس کی حوصلہ افزائی — کی وہ بھی ان الفاظ میں کہ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

”کوئی بات نہیں شروع شروع میں ایسا ہی لکھنوب سے دیکھ کر سیکھ لیتی یا بھابھی سے پوچھ جیتی۔ ہوتا ہے۔ مشت ستم جاری رکھو۔ ان شاء اللہ کامیابی خواستخواہ اپنی بے عزتی کروائی۔“ اس نے دل ہی دل تمہاری قدم چومے گی۔“

صبح کے ناشتے کے بعد جب اس نے دوپہر کے کھانے کے لیے ثمود اور ساس سے پوچھا تو ثمود نے فوراً ہی بریانی فرمائش کر دی۔

”بر..... یا..... نی۔“ اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

بریانی اس کی پسندیدہ ترین ڈش تھی۔ اس کے میکے میں بڑی بھابھی کے ہاتھ کی پکی ہوئی بریانی کی پورے خاندان میں شہرت تھی اس کا جب بھی بریانی کھانے کو دل چاہتا وہ ان سے فرمائش کر دیتی اور وہ اس کی فرمائش پوری کرنے کے لیے دل و جان سے جت جاتیں۔

”اور بیٹھے میں فروٹ ٹرانگل بنالینا یہ سب سے آسان سوٹ ڈش ہوتی ہے۔ ویسے اگر تم اپنی مرضی سے کچھ بنانا چاہو تو بنالینا۔“ امی نے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر اس کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کی۔

”مجھے کوکنگ کرنی نہیں آتی۔ آپ مجھے ریسیپی بتادیں۔ تو میں بنالوں گی۔“

”ارے بیٹا بریانی اور فروٹ ٹرانگل کی کیا ریسیپی؟ یہ ڈش تو آج کل ہر لڑکی بنالیتی ہے میری نواسی نے تو ابھی میٹرک بھی نہیں کیا اور وہ بے حد لذیذ بریانی بناتی ہے۔ اور میری بیٹیاں بھی اسکول کے زمانے سے کوکنگ کرتی تھیں۔ اور ایسے ایسے کھانے پکاتی ہیں کہ کیا کوئی شیف پکائے گا۔ خیر میری قسمت ہماری تو بڑی بہو بھی گھر بیٹا کاموں میں بالکل کوری

تھیں انہیں بھی میں نے سب کچھ سکھایا۔ اب لگتا ہے تمہیں بھی سکھانا پڑے گا۔“

اس نے ساس کے جملوں پر شرمندہ ہو کر ثمود کی طرف دیکھا وہ اپنے موبائل پر مصروف تھا۔ یا مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیا مصیبت تھی ان کو یہ سب بتانے کی خود ہی دیکھ کر سیکھ لیتی یا بھابھی سے پوچھ جیتی۔ ہوتا ہے۔ مشت ستم جاری رکھو۔ ان شاء اللہ کامیابی خواستخواہ اپنی بے عزتی کروائی۔“ اس نے دل ہی دل تمہاری قدم چومے گی۔“

ساس نے ریسیپی تو بتادی لیکن اس دوران بیٹیوں کے ایسے ایسے قیصدے پڑھے کہ اسے اپنا آپ انتہائی نکما، ناکارہ اور چھوڑترین محسوس ہونے لگا۔

”میری تو بہ میرے باپ کی تو بہ جواب ان سے کبھی کسی کھانے کی ریسیپی پوچھی۔“ اس نے دل ہی دل میں یہ عہد کر لیا تھا۔

اور پھر ساس امی کی خوش قسمتی اور اس کی بد قسمتی کہ دوپہر کے کھانے کے بعد اس کی بڑی نند کا فون آ گیا کہ وہ، ان کے شوہر اور بچے آرہے ہیں اور وہ رات کا کھانا کھا کر جائیں گے۔

”رات کو کیا کئے گا۔؟“ اس دفعہ اس نے اس معرکے میں ساس کی سہولیت ضروری نہیں سمجھی۔

”امی سے پوچھ لو۔“ ثمود نے بے نیازی سے جواب دیا تو وہ بری طرح چڑ گئی۔

”میں امی سے نہیں پوچھوں گی۔“

”کیوں.....؟“ ثمود کے ماتھے پر ایک شکن ابھری۔

”مجھے کوکنگ نہیں آتی۔ وہ جو بھی چیزیں بتائیں گی۔ وہ مجھے پکائی نہیں آتیں۔ اس لیے مجھے شرمندگی ہوگی۔“

”تو تمہیں کوکنگ کیوں نہیں آتی۔ یہ کون سا مشکل کام ہے ہر کھانے کی ترکیب تو یوٹیوب پر مل جاتی ہے۔“

”آج کا کھانا باہر سے آرڈر کر لیتے ہیں پھر پھر میں امی کے گھر جاؤں گی تو دو چار ڈشز سیکھ کر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناڈز

چلمن

دل لاری
گلشن



نادرہ خاتون



رضیہ جمیل

دستِ دگر



نوریزہ حسین



نسیم منجھڑ

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

آجاؤں گی۔“
”سوری ہمارے گھر میں باہر سے کھانا منگوانے کا رواج نہیں ہے۔ اور میں تو بہت ہی ہیلتھ کنشس ہوں۔ مجھے باہر کھانا بالکل پسند نہیں اور مجھے سوٹ بھی نہیں کرتا۔ اب جیسا بھی ہے گھر میں ہی پکانے کی کوشش کرو۔“

شمود نے ایک لمحے میں اس کی تجویز کو سختی سے رد کر دیا۔

”ٹھیک ہے کوشش کرتی ہوں۔ اگر اچھا نہیں بنا تو آپ برائی نہیں کریں گے۔“

”میں کیا برائی کر سکتا ہوں۔ صبح جیسی بریانی بنی تھی میں نے آج تک ایسی بریانی نہیں کھائی۔ لیکن میں نے یا میرے گھر والوں نے کچھ کہا بلکہ پاپانے تو تعریف بھی کی۔“

شمود کی بات پر اس کا دل جل کر کوئلہ ہو گیا۔ لیکن وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اس نے بھی کبھی ایسی بریانی نہیں کھائی تھی۔

☆☆☆

رات کے کھانے پر ساس امی اس کی مدد کرنے کچن میں آگئی تھیں لیکن یہ اس کے لیے اور مصیبت ہو گئی وہ اس کے ہر کام کو ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے اسپکشن کر رہی ہوں۔

”پیاز ایسے نہیں کاٹتے چاول اچھی طرح سے نہیں دھوئے۔ چکن کیسے دھوئی ہے؟ چکن کڑائی میں پیاز کون ڈالتا ہے؟ مسالہ اچھی طرح نہیں بھنا ہے۔ آلو گوشت میں آلو ایسے نہیں ڈالے جاتے۔“

ڈز کے لیے کھانا تو تیار ہو گیا تھا۔ لیکن جھنڈا ہٹ، کوفت اور غصے نے اس کے اندر کی تازگی، شگفتگی کو ختم کر دیا تھا۔

کھانا تیار کر کے وہ کمرے میں آئی تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور کسی سے بات نہ کرے۔ لیکن ایسا کیسے ممکن تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے تیار بھی ہوئی۔ چہرے پر مسکراہٹ بھی سجائی اور سب کے درمیان بیٹھ کر خوش ہونے کی اداکاری

”نہیں نہیں انہیں کیوں اعتراض ہوگا امی خود جاب کرتی تھیں میری دونوں بہنیں جاب کرتی ہیں۔“ لیکن وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”لیکن کیا.....“ وہ پریشان ہو گئی۔

”کیا تم جاب کے ساتھ گھر کے کاموں کو پیچ کر لوں گی۔“

”ہاں..... ہاں..... میں آرام سے کر لوں گی۔“ وہ بہت زیادہ پر جوش تھی۔

”سوچ لو تم پر کاموں کا بہت بوجھ پڑ جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے ہم لوگ تازہ کھانا کھاتے ہیں ہمارے گھر میں نہ پانی کھانے کھائے جاتے ہیں اور نہ باہر سے کھانے منگوانے کا رواج ہے۔“

”جھ مہینوں سے میں اس گھر میں رہ رہی ہوں میں آپ کے گھر کے طور طریقوں کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔“ اس نے جل کر کہا۔

”اس کے باوجود امی کو تم سے شکایت ہے کہ تم کو گھر کے کاموں کا بالکل سلیقہ نہیں ہے۔ اور نہ تم توجہ سے کوئی کام کرتی ہو۔“

”تمہود کی عادت تھی وہ کھل کر دو ٹوک بات کرتا تھا اور اس کی یہ عادت اکثر لوگوں کو اچھی نہیں لگتی تھی۔“

”میں تو اپنی پوری کوشش کرتی ہوں لیکن آپ کی امی کو میرا کام پسند نہیں آتا تو میں کیا کروں.....“

”تمہیں شاید معلوم نہیں ہماری امی کی سلیقہ مندی اور نفاست پسندی پورے خاندان میں مشہور ہے ہم چاروں بہن بھائی چھوٹے تھے تب بھی ہمارا گھر آئینے کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ اور ہماری امی ہماری بہنوں کے زیادہ تر ڈیریز گھر میں ہی تیار کرتی تھیں۔ شاید عید یا تہوار پر ان کے ریڈی میڈ کپڑے بازار سے خریدے جاتے تھے۔“

”تمہود نے اپنی باں کی تعریفیں شروع کر دیں جن کو سن کر اس کے کان پک گئے تھے۔“

”تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں بھی آپ کی امی کی طرح سلائی شروع کر دوں۔“

بھی کی۔ کھانا بہت اچھا نہیں بنا تھا تو بہت برا بھی نہیں بنا تھا۔ لیکن کسی نے نہ تعریف کی اور نہ مذمت کی، بس نڈنے آخر میں ایک جملہ کہہ کر اس کا دل خون کر دیا۔

”شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے ویسے امی کے ساتھ رہ کر جلد ہی سب سیکھ جاؤ گی۔“

☆☆☆

اسی طرح چھ مہینے گزر گئے اسے برا بھلا کھانا پکانا تو آ گیا لیکن گھر گزرتی کاسلیقہ نہیں آیا۔ وہ کھانا پکا کر اتنا تھک جاتی کہ پورا چن بھرا چھوڑ دیتی۔ پیاز کا تلی تو چھلکے سلیب پر پڑے ہوتے جو مشین استعمال کرنی اسے وہیں چھوڑ دیتی۔ دالوں کی برنیاں بھی سلیب پر ہی رہ جاتی۔

کبھی کبھار روٹی پکانے کی کوشش کرتی تو سارے سلیب پر آنا بھڑ جاتا اس کے بعد سینک میں سارے برتن جمع ہو جاتے۔ ساس امی جب چن میں آتیں تو ان کا خون کھول جاتا۔ وہ بے حد نفاست پسند خاتون تھیں۔ ان سے یہ سب برداشت نہیں ہوتا۔

وہ براہ راست اسے کچھ نہیں کہتیں لیکن اپنی بیٹیوں پر رکھ رکھ کر ایسا سناتیں کہ اس کے چودہ طبق روشن ہوتے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ گھر کے کام آسان نہیں ہوتے۔ ان کو سلیقے سے کرنے کے لیے بڑی مہارت اور ہنرمندی چاہیے ہوتی ہے۔

☆☆☆

”اسما کا فون آیا تھا۔ وہ کینیڈا جا رہی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں اس کی جگہ پر اٹلائی کر دوں تو وہ اپنے سی ای او سے میرے لیے بات کر لے گی۔“ وہ اور تمہودرات کے کھانے کے بعد سامنے فٹ پاتھ پر واک کر رہے تھے تو اس نے جاب کے بارے میں بتایا۔ وہ کئی جگہ اٹلائی کر چکی تھی۔ ایک آدھ جگہ انٹرویو بھی ہوا تھا۔ لیکن ابھی تک کہیں فاسٹل نہیں ہوا تھا۔

”ہاں کر دو۔ اچھا ہے۔ سارا دن تو فارغ ہی رہتی ہو۔“

”امی، پاپا کو تو اعتراض نہیں ہوگا۔“

”میں چاہوں تب بھی تم ایسا نہیں کر سکتیں یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہم اگر ڈھنگ سے کھانا پکنا سیکھ لو۔ تو بڑی بات ہے۔“
”یہ تو نہ کہیں اب تو میں اچھا خاصا کھانا پکانے لگی ہوں۔“
شمود کے طعنہ دینے پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اچھا..... خاصا..... ویسے ہائی..... دی..... وے آپ نے چھ مہینوں میں شاید چھ دفعہ ہی کھانا پکایا ہوگا۔ وہ بھی جب امی بیمار ہوں ورنہ تو ہمیشہ امی ہی کھانا پکاتی ہیں۔ تم تو صرف ان کی ہیلپ کرتی ہو۔“
”تو میں کیا کروں۔ وہ کون سا مجھے پکانے دیتی ہیں۔ ہر کام میں تو نقص نکالتی رہتی ہیں۔“ وہ روہا سی ہو کر بولی۔

”تم کو شوق ہی نہیں ہے تو وہ کیا کریں۔“
”ہاں ٹھیک ہے مجھے بالکل شوق نہیں ہے۔ مجھے یہ گھر کے کام زہر لگتے ہیں میں نے اپنے گھر میں کبھی یہ کام نہیں کیے۔“
”تو اس میں قصور تمہاری امی کا ہے۔ انہیں تم سے یہ کام کروانے چاہیے تھے ان کا فرض تھا تمہیں یہ سب کام سکھاتیں۔ میری بہنوں کو دیکھو، میری امی نے دونوں کو شادی سے پہلے سب کچھ سکھا دیا تھا۔ اسی لیے جب وہ شادی ہو کر سسرال گئیں تو انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔“

شمود غلط نہیں کہہ رہا تھا یہ حقیقت تھی شمود کی ایک بہن ڈاکٹر تھی اور دوسری بہن انجینئر دونوں جاب بھی کرتی تھیں اور گھر کو بھی بہت اچھے طریقے سے سنبھالتی تھیں۔

”آپ تو وہی کہتے ہیں جو آپ کی امی کہتی ہیں، آپ کی اپنی تو کوئی سوچ نہیں ہے مجھے تو ایسا لگنے لگا ہے جیسے آپ کی امی اور بہنیں کوئی آسانی مخلوق ہیں جن میں کوئی برائی نہیں ہے ان سے زیادہ لائق کوئی نہیں، ان سے زیادہ سلیقہ مند کوئی نہیں۔ ان سے زیادہ عقل مند نہیں کوئی۔“ وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

”تمہیں آخر میری ماں اور بہنوں سے ایسا کیا بغض ہے کہ تمہیں ان کی تعریفیں سننا بھی گوارہ نہیں۔“ اس کے غصہ کرنے پر شمود کو بھی غصہ آ گیا۔
”اگر آپ کے سامنے میں سارا ان دن اپنے ابا اور بھائیوں کے قصیدے پڑھتی رہوں اور آپ کو مسلسل کمتر ثابت کرنے کی کوشش کروں تو آپ بھی میری طرح ان سے چڑنے لگیں گے۔“

”خدا کے لیے اب مزید کچھ نہ کہنا ورنہ میں کچھ اور کہہ دوں گا تو تمہیں برا لگے گا۔“

”اب اور کیا کہیں گے آپ اور آپ کی امی نے ان چند مہینوں میں جس طرح مجھے نچا دکھانے کی کوشش کی ہے، وہ میں جانتی ہوں یا میرا دل.....“
اس نے خاموشی سے اس جملے کو اپنے اندر اتار لیا اور بھیگی آنکھوں سے اس کے ساتھ چلنے لگی۔

☆☆☆

”شمود نے سچ کہا تھا جاب کرنے کے بعد اس کے کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا وہ صبح اپنا اور شمود کا ناشتا بناتی وہ دونوں ناشتا کرتے پھر شمود اس کے آفس ڈراپ کر کے اپنے آفس چلا جاتا واپسی میں وہ آفس وین سے آتی اسے گھر آتے آتے شام کے چھ بج جاتے وہ تھوڑی دیر آرام کرتی۔ پھر کچن میں آ کر امی کے ساتھ مل کر رات کے کھانے کی تیاری کرتی۔ ساتھ ساتھ امی کی ہدایات بھی سنتی رہتی۔ رات کے کھانے کے بعد برتن دھونا اور کچن صاف کرنا اس کی ذمہ داری تھی جسے وہ بہت توجہ سے انجام دینے کی کوشش کرتی۔ لیکن اکثر اس سے کچھ نہ کچھ کمی رہ جاتی۔ کبھی وہ سلیب صاف کرنا بھول جاتی۔ کبھی صافیاں دھونا بھول جاتی کبھی صافیاں دھو لیتی لیکن پھیلا نا بھول جاتی۔ کبھی چوبیس صاف نہیں کرتی۔ اور امی کا بھی فرض تھا وہ صبح اٹھتے ہی کوئی نہ کوئی جملہ ایسا ضرور کہیں کہ گھر سے نکلتے ہوئے اس کا موڈ آف ہو جاتا۔

اس دن اسے آفس سے آنے میں دیر ہو گئی تھی۔ آفس میں کام بھی زیادہ تھا۔ پھر راستے میں

ٹریفک بہت تھا۔ اسے گھرنے تک پہنچتے پہنچتے مغرب ہو گئی تھی۔ مغرب کی نماز پڑھ کر وہ لٹ گئی تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ ایک گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو وہ گھبرا کر مچن میں آئی۔ محمود آنے والا تھا اور ابھی تک اس نے کھانا تیار نہیں کیا تھا۔

وہ مچن میں آئی تو مچن کا حال بہت اہتر تھا۔ آج ماسی نہیں آئی تھی۔ صبح کے سارے برتن جھوٹے پڑے تھے۔ امی اپنی بہن کی عیادت کے لیے صبح ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھیں۔ محمود نے واپسی میں انہیں لیتے ہوئے آنا تھا۔ پاپا بڑے بیٹے کے پاس اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ اس نے فریزر کھولا تھا وہ بالکل خالی تھا۔ سبزی کی ٹوکری میں سوائے آلوؤں کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے آلو اور اٹھنے کا سالن بنانے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ آٹا گندھا ہوا رکھا تھا۔ اس نے بیڑے بنائے ہی تھے کہ محمود اور امی آ گئے۔

محمود نے آتے ہی کھانے کا شور مچا دیا، امی بھی لباس تبدیل کر کے مچن میں آ گئیں لیکن مچن کا حشر دیکھ کر ان کو اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

”آٹا گندا..... مچن..... ذرا باجی کے گھر کا مچن جا کر دیکھو۔ کتنا صاف ستھرا جگہ کا تار ہوتا ہے۔ ان کی بیوی بھی جاب کرتی ہے لیکن جاب کے ساتھ گھر کو بھی سجا بنا کر رکھتی ہے۔“ وہ برتن دھوتے ہوئے حسب عادت اسے سنار ہی تھیں۔

”تو میں کیا کروں..... مجھے کیوں سنار ہی ہیں۔“ وہ تنک کر بولی۔

”میں تمہیں سنار نہیں رہی ہوں..... اپنی قسمت کو ردی ہوں۔ ساری زندگی جس گھر کو بنانے سنوارنے میں اپنی جان ختم کر دی۔ اب اس گھر کا یہ حال ہے کہ کسی کو گھر میں پلاتے شرم آتی ہے۔“ وہ غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گئی تھیں۔

”فار..... گاڈ..... سیک..... ایسی باتیں نہ کریں مجھ سے یہ باتیں برداشت نہیں ہوتیں۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“

”خوب ہے تم جو بھی چاہے کرو میں ایک حرف

بھی نہ کہوں، میں تو کچھ کہتی ہی نہیں ورنہ تو سائیں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہیں۔“

”آپ جو کچھ کہتی ہیں۔ یہ میرے لیے بہت ہے میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتیں۔“

”تو نہ سنو۔ کان بند کرو۔ میں تو کہوں گی۔ میں نے بڑی محنت سے یہ گھر بنایا ہے۔ میں ایسے دوسروں کے حوالے کر کے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔“

”امی پلیز..... ایسی باتیں نہ کریں۔ میرا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگتا ہے۔“

”ٹھیک ہے کچھ نہیں کہتی۔ جو تمہارا دل چاہے کرو۔ گھر کو کباڑ خانہ بنا دو۔ مچن کو اتنا گندار کھو کہ چوہوں اور کا کروچوں کا مسکن بن جائے۔ اگر تم سے ڈھنگ سے کام نہیں ہوتے تو تم صاف صاف کہہ دو مجھے کسی کی ضرورت نہیں ابھی مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ میں سارے کام کر سکتی ہوں۔“ امی کا بھی بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے آپ کی مرضی ہے۔ میں جارہی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر مچن سے باہر آ گئی۔ سالن تیار تھا۔ امی نے برتن دھو کر روٹی پکائی اور محمود کو آواز دی۔

”محمود لاؤنچ میں بیٹھا تھا۔ اس نے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پیٹھتے ہوئے کرن کے بارے میں پوچھا۔“

”وہ ناراض ہو کر اسے کمرے میں چلی گئی ہیں۔“ امی کے ماتھے پر بل دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ دونوں میں کسی بات پر کھٹ پھٹ ہوئی ہے۔

”کیا ہوا خیریت ہے؟“

”کیا بتاؤں.....؟ تمہیں تو پتا ہے مجھ سے سنک میں جھوٹے برتن برداشت نہیں ہوئے۔ ابھی مچن میں داخل ہوئی تو پورا سنک جھوٹے برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ بس مجھے غصہ آ گیا میں نے ایک دو باتیں سنا دیں۔ وہ چپختی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔“

”چلیں چھوڑیں کھانا کھائیں۔ وہ تھوڑی دیر بعد خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ ویسے وہ کوشش تو کرتی ہے کہ آپ کی مرضی کے مطابق کام کرے لیکن

”میں تمہارے بھائی کو فون کر دیتا ہوں، وہ آکر لے جائیں گے پھر جب تمہارا دل چاہے تم خود ہی آ جانا میں تمہیں لینے نہیں آؤں گا۔“

”اس خوش بھی میں نہ رہنا کہ میں اب دوبارہ اس گھر میں آؤں گی، میں جا رہی ہوں اور تم اپنی امی سے کہہ دو کہ وہ اس گھر کو سجا بنا کر شوکیس میں سجا دیں۔“

”ٹھیک ہے اسے جانے دو۔ چند دن میکے میں رہے گی تو اس کا دماغ درست ہو جائے گا۔“ فمود کی امی نے بھی ساس ہونے کا پورا حق ادا کر دیا۔

☆☆☆

وہ اپنے میکے آگئی امی کے گلے سے لگ خوب روئی۔ بھائی اور بھابیوں نے تسلی دی۔ ڈھارس بندھائی۔ فمود اور اس کی ماں کو ہزاروں باتیں سنائیں اس کی ہر بات کو صحیح اور فمود کو کی ہر بات کو غلط تسلیم کیا۔ وہ میکے آکر بہت خوش تھی۔ سب بہت زیادہ خیال رکھ رہے تھے۔ بس دادی ہی تھیں جن کی باتیں ان پھولوں جیسے لوگوں کے درمیان کانٹے کی طرح چبھ رہی تھیں۔

”یہ بالکل غلط ہے، ذرا ذرا سی بات پر اپنا گھر نہیں چھوڑنا چاہیے، شادی کے بعد عورت کی عزت اس کے شوہر کے گھر میں ہی ہوتی ہے۔“

”دادی آپ نہیں جانتیں وہاں مجھے کتنی ذیت دی جاتی تھی۔ مجھے کیسے کیسے طعنے دیے جاتے تھے کس کس طرح میری ذات کی نفی کی جاتی تھی، کبھی کسی نے میرے کسی کام کو سراہا ہی نہیں۔ کوئی میری کسی بات کی تعریف ہی نہیں کرتا تھا۔“

”پھر بھی..... یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے کہ جس پر تم اپنا گھر چھوڑ دو۔ ابھی تمہیں دن ہی کتنے ہوئے ہیں ابھی تو ایک سال بھی نہیں ہوا۔ ابھی تو تمہارے قدم اس زمین پر جمے ہی نہیں اور تم نے اس زمین کو چھوڑ دیا۔“

”دادی! میں آپ کو کیا بتاؤں اگر میں کچھ عرصے اور ان لوگوں کے ساتھ رہتی تو شاید میں پاگل

اسے کام کرنے کی عادت نہیں۔ اس لیے وہ اس طرح کام نہیں کر پاتی جیسے آپ کرتی ہیں۔“ فمود نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی تو امی کا پارہ اور ہائی ہو گیا۔

”خوآنخواہ بیوی کی طرف داریاں نہ کر۔ وہ کوئی دودھ پیتی بچی ہے کہ اسے برتن دھونے نہیں آتے یا کچن صاف کرنا نہیں آتا۔“

امی کی آواز خاصی تیز ہو گئی تھی اور کرن جو کھانا کھانے کے لیے لاؤنج میں آئی اور امی کے جملے سنے تو اس سے برداشت نہ ہو سکا۔

”فمود! آپ امی سے کہیں کہ وہ ایسی باتیں نہ کریں۔ ورنہ..... ورنہ۔“ شدت جذبات سے اس کی آواز کا پھٹنے لگی۔

”ورنہ..... ورنہ..... کیا.....؟“ امی کے لہجے میں مزید گرمی پیدا ہو گئی۔

”ورنہ..... ورنہ میں یہاں نہیں رہوں گی..... اپنے گھر..... چلی جاؤں گی۔“

”تو چلی جاؤ..... تمہیں روکے گا کون.....؟“ امی نے انتہائی رکھائی سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں آج ابھی اور اسی وقت جاؤں گی۔“ اس پر ہڈ پانی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

”کرن..... کرن..... پلیز..... اپنے آپ کو سنبھالو..... امی نے ایسا کیا کہہ دیا جو تم اس طرح چلا رہی ہو۔“

”امی نے کچھ نہیں کہا۔ آپ بھی کچھ نہیں کہتے۔ بس میں پاگل ہو گئی ہوں۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ آپ مجھے فوراً میری امی کے گھر پہنچا دیں۔“

اس نے گلاس اٹھا کر زمین پر پھینک دیا جو فمود اسے دے رہا تھا۔

”واقعی تم پاگل ہو چکی ہو۔“ فمود کو بھوک بھی بہت لگ رہی تھی اور اس کے اس طرح گلاس پھینکنے پر وہ بھی غصے میں آ گیا۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ ابھی اسی وقت مجھے میرے گھر پہنچا دیں۔“

ہو جاتی۔“ وہ اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرتی۔

”نہیں بیٹا! ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تم ایسا مت سوچو، کچھ دن کے لیے اپنے آپ کو بھول جاؤ۔ چند دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”نہیں دادی! وہ بہت عجیب طرح کے لوگ ہیں، نہ جانے کس زمانے میں رہ رہے ہیں۔ اور ہماری ساس کا مسئلہ ہی بڑا عجیب ہے انہیں ہر کام خود کرنے کا شوق ہے ہر کام خود کرتی ہیں اور چاہتی ہیں بھی ان کی طرح ہر وقت گھر کے کاموں میں مصروف رہوں۔“

”تو اس میں برائی کیا ہے؟ اچھا ہے انسان جتنا مصروف رہے برائیوں سے دور رہتا ہے۔“

”سوری دادو! میں ہر وقت ایسے بورنگ کام نہیں کر سکتی پھر انہوں نے بچوں کو بھی ایسی عادتیں ڈال دیں۔ بھلا بتائیں آج کل کوئی لڑکا ایسا ہوگا جو گھر کا کھانا شوق سے کھائے جسے باہر کے کھانے ہی پسند نہ ہوں۔ میں تو ایک سال سے اس گھر میں آرڈر سے کھانے منگوانے ہی کو ترس گئی ہوں۔“

”تو یہ کون سے فخر کی بات تھی۔ تمہاری یہی عادتیں تھیں جن پر میں ہر وقت ٹوکا کرتی تھی مگر تمہاری ماں نے میری ضد میں تم کو کھلی چھٹی دے دی تھی۔ یہ سب تمہاری ماں کی غلط تربیت کا نتیجہ ہے اب بھی آنکھیں کھول لو۔ ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔“

”نہیں دادو! میں نے فیصلہ کر لیا ہے اب میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ اس نے دادی کی تمام نصیحتوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔

☆☆☆

رمضان کا آغاز ہونے والا تھا۔ اسے میکے آئے ہوئے پورے دو ماہ ہو چکے تھے۔ سب کچھ دیا ہی تھا۔ سب اب بھی اس کی خاطر داریوں میں لگے رہتے۔ بھائی آفس سے آتے ہی اس کے بارے میں پوچھتے۔ امی پاپا کو ہر وقت اس کی فکر رہتی۔ بھابھیاں ہمیشہ کی طرح اس کا خیال رکھتیں لیکن اس کے دل کو

پھر بھی اطمینان نہیں تھا۔

ایک عجیب سے بے قراری اور بے کلی تھی۔ جس نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ وہ بظاہر بہت خوش نظر آتی لیکن اندر سے خوش نہیں تھی۔ ان دو مہینوں میں اس کی مندوں کے کئی بار فون آئے۔ سراسر اس سے ملنے کے لیے آئے لیکن ثمود اور اس کی ساس نے ایک بار بھی اسے فون نہیں کیا۔

وہ شادی کے بعد کافی بدل گئی تھی۔ اب اس کے اندر پہلے جیسی لا پرواہی اور بے نیازی نہیں رہی تھی۔ اب وہ اکثر کچن میں جا کر بھابیوں کی ہیلپ کرنے کی کوشش کرتی ان سے کھانوں کی، ریسیپرز پوچھتی بھی دادی کے پاس بیٹھ جاتی۔

آفس سے آکر وہ بے کلی بے کلی پھرتی رہتی۔ اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ جبکہ ثمود کے گھر آفس سے آتے ہی اس کے سر پر ڈنر کا بوجھ سوار ہوتا کھانے کے بعد برتن دھو کر اور کچن صاف کر کے وہ اپنے اور ثمود کے کپڑوں پر استری کرتی حالانکہ کپڑے دھو بی سے دھل کر آتے تھے۔ مگر وہ پھر بھی ان پر استری کرتی پھر صبح اٹھ کر اپنا اور ثمود کا ناشتا بناتی۔

☆☆☆

رمضان کا چاند نظر آتے ہی گھر میں خوش گواری چہل پہل شروع ہو گئی تھی دونوں بھابیوں نے رمضان سے پہلے ہی تیاریاں شروع کر دی تھیں تاکہ رمضان میں زیادہ سے زیادہ عبادت کا وقت مل سکے۔ بڑی بھابی نے پورے مہینے کے لیے چاٹ مسالہ بنا کر رکھ دیا تھا۔

چھوٹی بھابی نے بے شمار رول اور کباب بنا کر فریز کر دیے تھے۔ بیسن میں نمک، کٹی مرچ، زیرہ، اجوائن، میٹھی دانہ ملا کر رکھ دیا تھا۔ سحری کے لیے پراٹھے بنا کر فریز کر لیے تھے۔ اٹلی، پودینے اور ہرے دھنیے کی چٹنیاں بنا کر رکھ دی تھیں۔

وہ اب یہ سب اہتمام بہت غور سے دیکھ رہی تھی ورنہ شادی سے پہلے اس نے بھی ان چیزوں پر غور ہی

نہیں کیا تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ واقعی گھر گرہستی کتنی بڑی سائنس ہے اور گھر کو منظم طریقے اور قرعے سے چلانا کتنا بڑا آرٹ ہے۔

پچھلا رمضان اس نے سسرال میں گزارا تھا۔ جب اس کی شادی کو صرف چند دن ہی ہوئے تھے وہ سحری میں اس وقت اٹھتی جب اس کی ساس سحری کی ساری چیزیں تیار کر چکی ہوتیں۔ وہ سحری کرتی اور سو جاتی۔

افطاری کے وقت وہ ضرور کچن میں ساس کا ہاتھ بٹاتی لیکن وہ کچھ بناتی نہیں تھی اور اس کی ساس اسے کچھ بنانے بھی نہیں دیتی تھیں۔ وہ اس کی نئی نویلی دلہن ہونے کی وجہ سے اس کی ناز برداریاں کر رہی تھیں لیکن اب جب وہ اپنی بھابیوں کو صبح سے شام تک کچن میں مصروف دیکھتی تو دل ہی دل میں ندامت کا احساس ہوتا لیکن اس ندامت کے احساس کو اس کی انا کا سانپ ڈس کر بے جان کر دیتا۔

رات کے کھانے کے بعد جب سب لاؤنج میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرتے تو وہ نہ جانتے ہوئے بھی خود کو ان سب کے درمیان مس فٹ محسوس کرتی حالانکہ ابھی تک اسے اس گھر میں وی آئی پی پروٹوکول مل رہا تھا۔

☆☆☆

وہ، دادو، چھوٹی بھابی اور بابا لاؤنج میں بیٹھے تھے امی اور بڑی بھابی، بھابی کے بھتیجے کی سالگرہ میں گئی ہوئی تھیں۔ بھابی نے اس سے بڑا اصرار کیا کہ وہ بھی حلقے لیکن وہ یہ سوچ کر نہیں گئی کہ وہاں اس کی ساس اور محمود بھی آئے ہوں گے اور وہ کسی صورت بھی ان کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

اس کی وجہ سے چھوٹی بھابی بھی نہیں گئیں اور بابا تو ویسے بھی ان تقریبات میں نہ جانے کے بہانے ڈھونڈ کر رہے تھے۔

☆☆☆

”تم لوگوں نے کھانا کھالیا۔“ دادی عشاء کی نماز اور وظائف سے فارغ ہو کر ان کے درمیان آ کر

بیٹھ گئیں۔

”آپ کے بغیر کیسے کھا لیتے۔ آپ کا انتظار کر رہے تھے۔“ بابا نے ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کرن کی طرف دیکھا جو اپنے موبائل پر مصروف تھی۔

”آج کرن نے یخنی پلاؤ بنایا ہے۔“ چھوٹی بھابی اٹھتے ہوئے بولیں۔

”تو پھر اللہ ہمارے حال پر رحم کرے۔“ بابا نے مسکرا کر کرن کو چھیڑا۔

کرن نے چھوٹی بھابی کے ساتھ مل کر ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگایا سب سے پہلے دادی نے اپنی پلیٹ میں پلاؤ نکالا۔ پھر بابا نے اور بابا نے نوالہ منہ میں رکھتے ہی تعریف شروع کر دی۔

”واہ بھئی واہ کیا پلاؤ بنایا ہے تم نے تو اپنی ماں کو بھی مات دے دی۔“

بابا کی تعریف کے بعد چھوٹی بھابی اور بھائی نے بھی دل کھول کر تعریف کی لیکن دادی بالکل خاموش رہیں۔ تھوڑی دیر بعد بولیں تو تعریف تو کیا کرتیں دو تین نقائص نکال دیے۔

”گرم سالہ زیادہ تھا میرے تو کلیجے میں آگ لگ گئی۔ چاول بھی تھوڑے سخت تھے اور نمک بھی خاصا کم تھا۔“

دادی کے ریمارکس پر اس کا منہ بن گیا اور وہ تنہائی ہوئی کھانا چھوڑ کر اسے کمرے میں چلی گئی۔

”اماں! آپ کو ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اسے برا لگ گیا۔“ بابا نے دھیمے سے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو لگا کرے برا..... تم ہی لوگوں نے بے جا تعریفیں کر کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے اسے اپنی تعریفیں سننے کی اتنی عادت پڑ گئی ہے کہ اب اس سے کسی کی تنقید برداشت ہی نہیں ہوتی۔“

”اماں آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں ایک تو وہ ویسے ہی پریشان ہے دوسرے آپ ایسی باتیں کر کے اسے اور پریشان کر دیتی ہیں۔“ بابا کا لہجہ خاصا صاف ہو

گیا تھا۔

”تو یہ پریشانی اس کی اپنی پیدا کردہ ہے اور تم لوگوں کے بے حالا ڈپار کا نتیجہ ہے لڑکیوں کی اس طرح تربیت نہیں کی جاتی۔ جیسی تم لوگوں سے کی ہے اور یہ اس کا نتیجہ ہے کہ اس سے کسی کی بات پر داشت نہیں ہوتی۔“ دادی اب عمر کے اس حصے میں تھیں کہ جو جی میں آتا بول دیتیں اور کوئی انہیں روک بھی نہیں سکتا تھا۔

”آخر کرن میں کیا کی ہے۔ خوب صورتی ہے پڑھی لکھی ہے مہذب ہے۔ اس کے سسرال والوں کو تو اسے سر آنکھوں پر بٹھانا چاہیے تاکہ اس کے برکام میں خامیاں نکالیں اور اسے کمتر ثابت کرنے کی کوشش کریں۔“ چھوٹی بھابھی نے ہمیشہ کی طرح کرن کی طرف داری کی۔

”رہنے دو، زیادہ خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کون سے سسرال والے ایسے ہوتے ہیں۔ جوئی آنے والی لڑکی کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، پہلے لڑکی کو سسرال والوں کو سر آنکھوں پر بٹھانا پڑتا ہے۔ پھر اسے یہ مقام ملتا ہے۔ لیکن آج کل تو لڑکیاں یہ چاہتی ہیں کہ وہ سسرال جاتے ہی ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ہی سب کی آنکھوں کا تارا بن جائیں۔ اور سب ان کے آگے پیچھے پھریں۔“

دادی کی تقریر جاری تھی جب امی اور بڑی بھابھی آ گئیں۔ سب کے چہرے تاثرات دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ کوئی معرکہ جاری ہے۔

”تم لوگوں نے بہت دیر کر دی مجھے تو پریشانی ہونے لگی تھی۔“ پاپا نے دادی کی تقریر کو روکنے کے لیے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

”کیا کیا جائے کسی کو احساس ہی نہیں کہ درنگ ڈے میں اتنی رات کو تقریبات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تو سخت سگن ہو رہی ہے میں سونے جا رہا ہوں۔“

بڑے بھائی کا منہ پتا ہوا تھا۔ اور انہوں نے جھنجھلا کر کچھ اس طرح کہا کہ بھابھی خواہ مخواہ ہی

شرمندہ ہو گئیں۔

”کرن کہاں ہے۔“ امی نے کرن کی غیر موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔

”بیکم صاحبہ ناراض ہیں کیونکہ میں نے ان کے پکائے ہوئے کھانے تعریف نہیں کی۔ تمہاری بیٹی بالکل تمہارا عکس ہے، وہی عادتیں ہیں وہی طور طریقے ہیں۔ ذرا سا کچھ کہا فوراً منہ پھلا کر بیٹھ گئیں۔“ دادی کا دل اس عمر میں بھی بہو کی طرف سے صاف نہیں تھا۔

”اچھا ہوا۔ آج کرن نہیں گئی۔ وہاں شمود اور اس کی ماں بھی آئی ہوئی تھیں۔“ امی دادی کی بات کو سنی ان سنی کر کے پاپا سے مخاطب ہوئیں۔

”کچھ کہہ رہی تھیں کیا۔“ پاپا کے اندر کی پریشانی ان کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

”نہیں..... مجھ سے ڈھنگ سے بات ہی نہیں کی۔ بہت زیادہ اکٹری اکٹری لگ رہی تھیں۔“ اور شمود.....؟“

”اولیں بتا رہا تھا کہ اس نے اسے سلام تک نہیں کیا۔ بہت بڑے لوگ ہیں۔“ امی شدید غصے میں تھیں۔

”یہ تو بہت غلط بات ہے۔ شمود کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شمود کی امی ماما کو بتا رہی تھیں کہ شمود کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ اسے مسلسل سر میں درد رہنے لگا ہے۔“ بڑی بھابھی نے یہ رشتہ کرایا تھا اس لیے ہر بات کی ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی تھی وہ مسلسل ان لوگوں کی طرف سے صفائیاں پیش کرتی رہتی تھیں۔

”اونہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ اب میرا منہ نہ کھلاؤ، اب اگر طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو بھادرج کے بھتیجے کی سالگرہ میں کیوں آگئے ایسا قریبی رشتہ تو نہیں تھا۔“

”شمود کی ماں بہت عمدہ اور ملتسار خاتون ہیں۔ وہ بڑے قرینے سے رشتہ داریاں بھاتی ہیں۔“ دادی کی شمود کی ماں کی تعریف کرنے پر امی کو پچھلے لگ گئے لیکن پاپا کی وجہ سے وہ کچھ کہہ نہ سکیں اور خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے شوہر اور بیوی کے رشتے میں شوہر کو ایک درجہ برتری عطا کی ہے تاکہ گھر کا اسٹی ٹیوشن اچھی طرح چل سکے۔

”یہ ضروری تو نہیں۔“

”یہ بہت ضروری ہے تم آفس میں جاب کرتی ہو جو آفس کا سربراہ ہوتا ہے۔ اس کی بات مانی جاتی ہے۔ اسی کا فیصلہ تسلیم کیا جاتا ہے چاہے وہ عورت ہو یا مرد اور پھر یہ بات مانو کہ عورت کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے نرمی اور لچک رکھی ہے کہ اگر میاں بیوی کے رشتے میں تناؤ پیدا ہو تو بیوی اپنی فطرت کی نرمی اور لچک سے اس کو دور کر سکتی ہے۔“

”بھابھی ابھی تو مجھے دیر ہو رہی ہے میں شام میں آ کر بات کروں گی۔“ اس نے پرس اٹھایا اور تیزی سے کمرے سے باہر آ گئی۔

”اسے کیسے سمجھاؤں کہ گھر توڑنا بہت آسان ہے اس کو جوڑ کر رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے عورت ساری زندگی اس گھر کو جوڑے رکھنے کے لیے کیسی قربانیاں دیتی ہے کیسے نشتر سستی ہے کیسے کیسے الفاظوں کے تیر دل پر لگتی ہے تب جا کر ایک چھوٹا سا گھر بنتا ہے۔“

بھابھی نے ٹھنڈی سانس بھری اور کچن میں آ کر کچن کو سینٹھنے میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆

رمضان کے پہلے جمعے کو امی نے افطار پارٹی کا اہتمام کر لیا تھا۔ افطار پارٹی میں دونوں بہوؤں کے گھر والے مدعو تھے وہ بھی کچن میں بھابیوں کے ساتھ مصروف تھی۔

ایک سال پہلے افطار پارٹی میں شمو اور اس کے گھر والے بھی آئے تھے۔ وہ کتنا خوش تھی اس کی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس نے شمو کی پسند کا لائٹ پر پل کلر کا سوٹ پہنا تھا جو اس کی گلابی رنگت پر بہت زیادہ کھل رہا تھا۔ شمو کی محبت نے اس کی جون ہی بدل دی تھی۔

اس سال امی نے انہیں نہیں بلایا تھا۔ جبکہ دادی

☆☆☆

”کرن! شمو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ صبح کے ناشتے کے بعد کرن آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو بڑی بھابھی نے اسے اس کے کمرے میں آ کر بتایا۔

”آپ کو کس نے بتایا۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”کل شمو کی امی نے بتایا تھا۔“

”اسے کیا ہوا ہے؟ وہ تو اپنی صحت کا بہت خیال رکھتا ہے۔“ اس نے بالوں میں برش کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ بتا رہی تھیں کہ کرن کے آنے کے بعد وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ اور اب دو ہفتوں سے اس کے سر میں مسلسل درد رہنے لگا ہے۔“

”اس کی امی آپ کی ماما کو بتا رہی تھیں مجھے فون کر کے نہیں بتا سکتی تھیں۔“

”شاید وہ سمجھ رہی ہوں کہ کسی نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔“

”مجھے کون بتائے گا۔ دو مہینے ہو گئے ہیں۔ شمو کو توفیق نہیں ہوئی کہ ایک دفعہ بھی مجھے فون کر لیتا یا ایک پیج ہی بھیج دیتا۔“ یہ کہتے کہتے کرن کی آواز بھرانے لگی۔

”شوہر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں جھکتے ہمیشہ بیویوں کو ہی جھکنا پڑتا ہے۔“

”بھابھی یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ آج کل کوئی کسی کے آگے نہیں جھکتا، جس طرح مرد کی عزت نفس ہوتی ہے۔ ایسے ہی عورت کی بھی عزت نفس ہے۔“

”اس میں عزت نفس کی کیا بات ہے پھر گھر چھوڑ کر تو تم آئی تھیں شمو نے تو تمہیں جانے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اور پھر تمہارے بھائی تمہیں لے کر آئے تھے۔“

”تو اس نے روکا بھی تو نہیں۔ کیا وہ مجھے روک نہیں سکتا تھا۔“

”کرن! خواہ مخواہ کی ضد میں اپنا گھر برباد نہ کرو۔“

ہو سکتا ہے وہ بھابھی کے بھتیجے کی سالگرہ میں اسی لیے آیا ہو کہ اس کی مجھ سے ملاقات ہو جائے۔“
بھابھی نے اس سے یہی کہا تھا۔

بھابھی سچ کہہ رہی تھیں۔ ورنہ وہ طبیعت کی خرابی کے باوجود وہاں کیوں آتا۔
”اگر میں اسے فون کروں۔“

”پر میں کیسے فون کر سکتی ہوں۔ میں تو اس سے اس کی امی کے سامنے یہ کہہ کر آئی تھی کہ میں اب بھی اس گھر میں واپس نہیں آؤں گی۔ اب اگر میں گئی تو میری نہ اپنے میکے میں کوئی عزت رہے گی اور نہ سسرال میں اس کی امی کو تو موقع مل جائے گا۔ پھر وہ ہر وقت ہی طعنے دیتی رہیں گی۔“

دادی کہتی تھیں۔ ایک پودے کو جب ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں بویا جاتا ہے تو مٹی میں اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں۔ ذرا سی تیز ہوا چلے تو وہ اکھڑنے لگتا ہے لیکن جب اس کی جڑیں مٹی میں مضبوط ہو جائیں تو پھر وہ ہر قسم کی ہواؤں کے جھکڑوں کو برداشت کر لیتا ہے۔ لڑکی بھی جب بیاہ کر سسرال میں جاتی ہے تو سسرال کی زمین میں قدم بھانا مشکل ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ سسرال کی زمین اس کے قدم پکڑ لیتی ہے اور جب اس کے قدم جم جاتے ہیں تو پھر کیسے ہی طوفان آئیں۔ کیسی ہی پریشانیاں ہوں وہ اپنے گھر میں مضبوطی سے اپنے قدم جمائے رہتی ہے اور کوئی اسے وہاں سے ہٹانے کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔

بھابھی یہ بھی تو کہتی تھیں۔ محبت میں اتنا نہیں ہوتی۔ محبت صرف محبت ہوتی ہے۔ اگر تم محبت کی نظر سے رشتوں کو دیکھو گی تو ہر رشتہ بے حد حسین اور خوب صورت نظر آئے گا۔ زندگی میں ہر طرف رنگ اور خوشبوؤں کی پھوار بر سے گی۔

”مجھے کیا کرنا چاہیے.....؟ کیا میں ساری زندگی یہاں رہ سکتی ہوں۔“ یہ سوچ کر ہی اس کا دل خوف سے لرزنے لگا۔

اور بڑی بھابھی چاہ رہی تھیں کہ انہیں بھی بلایا جائے امی بھی ان دونوں کے کہنے پر ان کو بلانے کے لیے نیم رضامند ہو گئی تھیں لیکن کرن نے سختی سے منع کر دیا۔

”ہرگز نہیں اگر آپ نے ان لوگوں کو بلایا تو میں گھر سے چلی جاؤں گی۔“ اور اس کے اس جملے پر دادی کا بارہ ہالی ہو گیا تھا۔

”غضب خدا کا یہ کس قدر خود سر ہوتی جا رہی ہے بھلا ایسے دماغ کے ساتھ کوئی سسرال میں کیسے رہ سکتا ہے میں نے تو اپنی ساری زندگی میں ایسی خود سری نہیں دیکھی۔ ماں گود دیکھو وہ بیٹی کے سامنے مجبور اور بے بس ہیں۔ پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اگر بیٹیاں ناراض ہو کر میکے آ جاتیں تو باپ، بھائی خود سسرال پہنچا کر آتے تھے ایسا کہیں نہیں ہوتا تھا کہ بیٹی گھر آئے تو اسے سمجھانے کے بجائے اس کے آگے پیچھے پھر کر اس کا دماغ خراب کر دیا جائے اور اسے اس کی غلطیوں کا احساس دلانے کے بجائے اس کی غلطیوں پر واہ واہ کی جائے۔“

دادی بولتی تھیں تو بولتی ہی چلی جاتی تھیں اس کا دل چاہ رہا تھا اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لے۔
شام کو جب بڑی بھابھی کے میکے والے آئے اور افطار کے بعد سب مل جل کر باتیں کر رہے تھے تو اسے ایک دم اپنے چاروں طرف سناٹا سا محسوس ہونے لگا۔ اسے عجیب سے بے چینی نے گھیر لیا۔
”تمہود کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تمہود کے بارے میں سوچنے لگی۔

”کیا مجھے تمہود کو فون کرنا چاہیے۔“ وہ اپنے کمرے میں آ کر سوچنے لگی۔

”اس نے فون کیوں نہیں کیا؟“

”بھابھی بتا رہی تھیں وہ بہت خاموش رہنے لگا ہے۔ جبکہ وہ کتنا خوش مزاج تھا۔“

اگر وہ ایک میسج ہی کر دیتا۔ اس کی نظر میں میری اہمیت ہوتی تو وہ مجھ سے ملنے کی کوشش تو کرتا۔

”سب بہت اچھے ہیں پھر بھی سب اچھا کیوں نہیں لگتا۔“ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

☆☆☆

ستائیس رمضان کی رات تھی شب قدر کی رات کہ جس رات فرشتے اللہ کے حکم سے تمام امور لے کر نازل ہوتے ہیں وہ ساری رات اس نے سجدے میں گزار دی ایک لمحے کے لیے بھی اس نے سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔

”میرے مالک، میرے رب، رب کائنات میرے اللہ تو رحمان ہے تو رحیم ہے تو ارحم الراحمین ہے مجھ پر رحم فرما مجھ پر کرم کر۔ میرے گناہ معاف کر دے شہود کو زندگی دے دے شہود کو زندگی دے دے۔“

شہود کے سر میں مستقل درد رہنے لگا تھا ڈاکٹروں نے ٹیسٹ کروائے تو سر کے پچھلے حصے میں ٹیومر کی تشخیص ہوئی۔ فوری طور پر آپریشن کر کے وہ ٹیومر نکالا گیا۔

ٹیومر کی بائیوپسی کی رپورٹ آئی تھی جس سے پتہ چلا کہ ٹیومر مائلیگنٹ ہے یا بینائن۔ اگر بینائن (Benign) ہوتا تو پھر خطرے کی بات نہیں تھی۔ اس پر قابو پانا آسان ہوتا ہے جبکہ malignant کا مطلب تھا کینسر جو انتہائی تیزی سے پھیلتا ہے اور جس کا علاج بے حد تکلیف دہ اور مہنگا تھا۔

اسے جب پتا چلا تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اسے شہود کے سوا کچھ بھی یاد نہ رہا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً ہی گھر آ گئی، شہود کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ امی نے بھی سب بھول کر اسے گلے سے لگا لیا۔ گھر میں ہر طرف خوف اور دہشت کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔

انسان کتنا ناشکرا ہے جب اللہ ہر نعمت عطا کرتا ہے تو وہ بہت معمولی معمولی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر ان نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے اور جب وہ اپنی کوئی نعمت واپس لینے لگتا ہے تب انسان کو ہوش آتا ہے کہ اس کے پاس نعمتوں کا کیسا خزانہ تھا۔ وہ حد سے زیادہ

پیارے بچوں کے لئے

قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

نادم اور شرمندہ تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ دے کر شمود کی زندگی بچالے اسے اب صرف شمود کی محبت یاد رہ گئی تھی اور اس کے دماغ سے ہر چیز محو ہو چکی تھی۔

اس کے وجود کا ذرہ ذرہ شمود کی زندگی کے لیے موجود تھا وہ رات ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں پاتی تھی۔ اسے خوف ہوتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سو جائے اور شمود اسے چھوڑ کر چلا جائے۔

☆☆☆

وہ ڈاکٹر کے کلینک پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں شمود کی بائیو سی کی رپورٹ تھی اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں جاری تھا۔

رپورٹ کلیئر تھی ٹیومر بنیائیں (Benign) تھا وہ رپورٹ لے کر chologist کے کلینک میں دعائیں مانگ رہی تھی۔

”اللہ کا شکر ہے۔ خطرے کی بات نہیں کیفر نہیں ہے لیکن آپ کو ایک دو ٹیسٹ اور کرانے ہوں گے اور میں کچھ میڈیسن بھی لکھ رہا ہوں۔ یہ انہیں بہت پابندی سے استعمال کرنی ہوں گی اور باقاعدگی سے اپنا چیک اپ کراتے رہنا ہوگا۔“

وہ شمود کے ساتھ کلینک سے باہر نکلی اسے لگا جیسے اللہ اس کے آس پاس کہیں موجود ہے اور اسے مسکراتا دیکھ کر مسکرا رہا ہے، دادی کہتی تھیں جب بچوں کی خود سری حد سے بڑھ جائے تو انہیں راہ راست پر لانے کے لیے ان پر سختی کرنا اور سزا دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ تو کہ کیا اللہ بھی انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے بھی ان پر سختی بھی کرتا ہے۔

☆☆☆

عید کا دن جو ہر مسلمان کے لیے خوشیوں کی سوغاتیں لے کر آیا وہاں کرن اور شمود کے گھر میں تو خوشیوں اور مسرتوں کی پھوار بن کر برس رہا تھا۔ عید کے دن اس کی دونوں تندوں نے صبح کے

کھانے پر آنا تھا اور کھانا پکانے کی ساری ذمہ داری کرن نے اپنے کاندھوں پر لے لی تھی۔

وہ دو مہینوں میں بڑی بھابھی سے بہت کچھ سیکھ چکی تھی۔ دادی کی مستقل ہدایات نے لاشعوری طور پر

اس کے اندر کی سلیقہ مند عورت کو جگا دیا تھا اور اب وہ ہر کام بہت سلیقے اور منظم طریقے سے کرنے لگی تھی۔

شیر خورمہ کا سامان اس نے رات کو ہی تیار کر لیا تھا پٹنی پلاؤ کے لیے پٹنی رات میں بتالی تھی۔ کوفتے اور چکن کڑا ہی صبح کی نماز کے بعد بنا لیے سب کے آنے سے پہلے گھر اور ڈانگ ٹیبل کو اتنے خوب صورت انداز میں سجایا تھا کہ امی کی زبان سے بھی بے اختیار تعریف نکل گئی۔

سب نے کھانا کھا کر دل کھول کر تعریفیں کیں۔ شمود کے بھائی اور بھابھی بھی دو دن پہلے اسلام آباد سے آئے تھے۔

”بھتیجی پلاؤ میں گرم مسالہ زیادہ ہو گیا تھا اور کوفتے تھوڑے سخت رہ گئے تھے۔“ امی نے دادی کی طرح آخر میں ایک جملہ داغ دیا۔

”اور میرا خیال ہے چکن کڑا ہی میں ٹماٹر کم تھے۔ شیر خورمہ میں چینی زیادہ تھی اور روٹیاں تندور سے آئی تھیں لیکن سخت تھیں۔“ پاپا نے امی کی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔

”اور میرے پیٹ میں گھٹائش کم تھی لیکن میں نے زیادہ کھالیا کیونکہ ان تمام نقائص کے باوجود کھانا بہت مزیدار تھا۔“ شمود کے بڑے بھائی کے اس جملے پر سب بے ساختہ ہنس پڑے اور ان کی ہنسی میں آج کرن کی خوشی سے بھرپور ہنسی بھی شامل تھی۔

کیونکہ اسے یہ راز سمجھ میں آ گیا تھا کہ سسرال والوں کی باتوں کو درگزر کر کے ہی وہ ان لوگوں کو بھی خوش رکھ سکتی ہے اور اپنے آپ کو بھی۔ اور یہی شکر نعمت کی ایک صورت ہے۔

☆☆

جراخان

چاندی سارا

”ہاتھ کاٹھا ہوا مرغی کا قیرہ نہیں لائے آپ؟
حد کرتے ہیں ہنگی کے ابو آپ بھی نا۔“
آمنہ بیگم نے شاہر میں جھانکتے ہی ناک کھوں
چڑھائی۔

صفدر صاحب نے چشمہ ذرا اوپر سرکایا اور زچ



ہوتے ہوئے بولے۔
 ”ذرا غور سے دیکھو آمنہ بیگم! آنکھیں ہیں یا
 بٹن، تین کلو مرغی کا گوشت لایا تو ہوں۔“
 آمنہ بیگم نے فوراً پلٹ کر جواب دیا،
 ”ہاں، ہاں دیکھ لیا، دیکھ لیا، اندھی نہیں ہوں
 میں، سب نظر آ رہا ہے مجھے، پنگی کے ابو، اس مرغی
 کے گوشت کی تو کل بر پانی اور قورمہ بن جائے گا، کیا
 آپ کو معلوم نہیں کل پہلی افطار ہے، بچے دن بھر کے
 بھوکے ہوں گے، رات کے کھانے میں ابھی چیز تو
 خفی چاہیے نا.....“

”آمنہ بیگم! میں ہاتھ جوڑتا ہوں تمہارے
 سامنے، خدا کا واسطہ خاموش ہو جاؤ، ورنہ میرے
 دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی اور اس کی ذمہ دار
 صرف تم ہوگی، ایسی کی تپسی کر دی تم نے میری ساری
 تنخواہ کی، اب پورا مہینہ کیسے گزرے گا؟ کنگال کر دیا
 مجھے۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”آئے ہائے پنگی کے ابو! میں نے ایسا کیا
 کہہ دیا جو آپ نے سارے گھر کے سامنے اپنی
 غربت کا ڈھول پیٹنا شروع کر دیا، پنگی کے ابو ذرا
 لہجہ دھیما رکھیں آپ کو تو اس بات کا بھی احساس نہیں
 کہ کچھ مہینوں کے بعد آپ بہو والے ہو جائیں گے،
 آپ کی کنجوسی دیکھ کر کیا سوچے گی ہماری بہو کہ کن
 کنگلوں میں اس کی شادی ہو گئی ہے۔“

”اچھا بس، بیگم اب تم خاموش ہو جاؤ، لا کر دے
 رہا ہوں میں تمہیں مرغی کا قیمہ، لیکن یاد رکھنا پھر پورے
 رمضان، پاؤ بھر بھی قیمہ لا کر نہیں دوں گا، تمہیں کفایت
 شعاری سے اسی قیمے کے چھوٹے چھوٹے چمکٹ بنا کر
 فریزر میں رکھنا ہوں گے اور پورا مہینہ حساب کتاب
 سے چلانا ہوگا۔ ضروری تو نہیں کہ ہر بار قیمے کے ہی
 سمو سے بنائے جائیں، آلو کے بھی تو لذیذ سمو سے تیار
 کیے جاسکتے ہیں، اور سحری پر روز روز بھنا قیمہ کھانے کے
 بجائے دال بھری سے بھی شان دار سحری ہو سکتی ہے لیکن
 تم لوگوں کو تو صرف پورا رمضان چنور پن کرنا ہے
 بس۔“ وہ غصے میں بولتے ہوئے اٹھے اور دروازے کی
 طرف قدم بڑھا دیے۔

”ارے ہاں پنگی کے ابو، ذرا ٹھہر تو جائیں، وہ
 آپ کی امی کا من پسند چاٹ سالہ، وہ جو کلو بھائی کی

میں تو ہاتھ کے کٹے قیمے کی بات کر رہی تھی، فی
 الحال پانچ کلو تو لا کر رکھ ہی دیتے فرج میں، آپ کو
 لسٹ میں مرغی کا قیمہ بھی تو لکھ کر دیا تھا.....“
 ”ہاں بھئی دیا تھا تم نے لسٹ میں لکھ کر، سب
 پڑھ لیا تھا میں نے ان پڑھ نہیں ہوں، لیکن بیگم کچھ تو
 سوچو، مرغی کے ریٹ کتنے بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر
 سارے پچیس مرغی کے گوشت پر ہی اڑا دیے تو رمضان
 کا پورا مہینہ کیسے گزرے گا؟ تم تو جانتی ہو، رمضان
 الیادک کا مہینہ شروع ہوتے ہی اشیاء بہ خورد و نوش
 کی قیمتیں آسمان سے ہاتیں کرنے لگتی ہیں۔ بس اسی
 لیے نہیں لایا پانچ کلو مرغی کا قیمہ بنا کر۔“

”یہ کیا کہہ دیا آپ نے پنگی کے ابو، ایسے کیسے
 چھوڑ دیا مرغی کا قیمہ؟ اب مرغی مہنگی چل رہی ہے یا
 سستی، دل بڑا کر کے قیمہ بنوا ہی لاتے..... ہائے
 اب ہم سحری کیسے کریں گے؟“

پنگی کے ابو، جب تک مرغی کے گوشت کا نرم
 نرم بھنا ہوا قیمہ اور روغنی پراٹھے نہ ہوں، سحری کا مزا
 ہی نہیں آتا۔

ہائے اللہ جی، اب کل روزے کی حالت میں
 سارا دن کالنا کتنا مشکل ہو جائے گا، میرا تو خالی پیٹ کلیجہ
 سچ سا جاتا ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کتنا کٹار روزہ
 ہوگا، شام چھ بجے کے بعد کھلے گا۔ بس مجھے نہیں پتا۔ جلدی
 سے جائیں اور مرغی کا قیمہ بنوا کر لے آئیں۔

”ابو، آپ میرے لیے سیب، کیلے، مالٹے اور
امروڈ لے کر کیوں نہیں آئے؟ مجھے کل افطار پر فروٹ
چاٹ کھانی ہے۔“

صفر صاحب جو پہلے ہی غصے میں —

بھرے بیٹھے تھے، ایک دم سے پھٹ پڑے۔

”کیلا، سیب، مالٹے اور امروڈ.....“ وہ تمللا
اٹھے۔ ”بخش دو مجھے، اتنی مہنگائی میں یہ سب فروٹ
لانا اب میرے بس میں نہیں ہے۔ اور تم سب گھر
والوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ قارون کا خزانہ نہیں
ہے میرے پاس، ایک بہت معمولی سا انسان ہوں
میں، کچھ تو رحم کرو میرے حال پر.....“

”بچی نے صرف ایک ہی چیز کی تو فرمائش کی
ہے، تو بہ ہے آپ نے تو بچی کو اپنی غربت کے لیے
چوڑے اضافے سا ڈالے۔ اللہ اللہ دل توڑ دیا میری
چھوٹی سی گڑیا کا۔“
وہ بچی کو چمکارتے ہوئے بولیں۔ ”میری بچی

چکی سے ملتا ہے نا وہ مجھے سامان کے شاپر میں کہیں نظر
نہیں آ رہا، مہربانی کر کے چاٹ سالہ بھی لیتے آئیے
گا اور ہاں پا پڑی کے دو پیکٹ بھی، ورنہ آپ کی امی
..... سمجھ رہے ہیں نا آپ میری بات.....“

کچھ دیر بعد صفر صاحب ہاتھ میں شاپر
لٹکائے بوجھل قدموں سے گھر میں داخل ہوئے،
شاپر بچن کی سلیب پر رکھ کر گہری سانس لیتے ہوئے
بولے۔ ”یہ بوجھ بھی مرغی کا قیمہ، اور امی کا من پسند چاٹ
سالہ، پا پڑی وغیرہ سب ہے اسی شاپر میں۔“
آمنہ بیگم نے خوش ہوئے۔ تے ہوئے قیمے کے
شاپر کو ایسے دیکھا جیسے سونے کا سیٹ ہو۔

”ہائے چکی کے ابو، آپ کتنے اچھے ہیں۔“ وہ
چمکتے ہوئے بولیں۔ ”آج سحری پر آپ کو ادراک اور
ہری مرچوں کا اتنا مزے دار سا قیمہ بھون کر دوں گی
کہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے، اور وہ بھی گر ماگرہ
روغنی پرائیوں کے ساتھ۔ اور کل افطار میں چٹ پٹی
سندھی بریانی، تورنہ اور گولہ کباب بنا کر کھلاؤں گی۔“
جوں جوں آمنہ بیگم ڈشوں کے نام گنوائی
گئیں، صفر صاحب کے ماتھے کی شکنیں گہری ہونی
گئیں، انہیں یوں لگا جیسے پہلے ہی روزے میں
گوشت کا مکمل صفایا ہونے والا ہے، وہ غصے میں
تقریباً دھاڑتے ہوئے بولے،

”بس بہت ہو گیا آمنہ بیگم، یہ ہزاروں روپوں
کا گوشت ہے، اور تم ایک ہی دن میں سب برباد
کرنے پر تلی ہو۔“

”تمہیں کھانا مجھے، سحری پر نمھنا قیمہ اور روغنی
پرائی، مجھے تو تم رات کا بچا ہوا سالن اور دو چپاتیاں
بنا کر دے دینا، بڑا احسان ہو گا تمہارا مجھے غریب پر۔“
اسی دوران صفر صاحب کی دس سال کی بیٹی چکی اپنی
ایک نئی فرمائش لے کر باپ کے پاس آکھڑی ہوئی،
”ابو بات سنیں۔“

”کیا ہے بچی۔“ انہوں نے نہایت عجلت میں
جواب دیا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

لیکھی شال

مختصہ نگار عثمان

مکمل ناول کتابی شکل
میں شائع ہو گیا ہے



مکتبہ الیہ کاہنہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
فون نمبر: 32735021
37 امرو بازار، کراچی

ٹو بالکل پریشان نہیں ہو، میں لا کر دوں گی تجھے بازار سے بہت سارے پھل، پھر تو کھائیو مزے سے فروٹ چاٹ....."

بیوی کی باتیں سن کر صفدر صاحب آپ سے باہر ہو گئے، وہ طیش میں آ کر بولے،
 "آمنہ بیگم، ابھی اٹھو، فوراً مارکیٹ جاؤ اور پھل فروٹ لے آؤ، جیسے پھل تو باہر درختوں پر لگ رہے ہیں، تاہم جیسی بے صبری عورت کو بھی ذرا اندازہ ہونا چاہیے کہ ہنگامی کا بخار اس وقت چالیس ڈگری پر ہے۔
 بچی کو سمجھانے کے بجائے الٹا میرے خلاف بھڑکار رہی ہو۔"

آمنہ بیگم، مجھے تمہارے ناشکرے پن پر حد سے زیادہ افسوس ہو رہا ہے۔۔۔ میں سارا سال تم لوگوں کے لیے پھل لاتا رہا، اب رمضان کی وجہ سے یہی پھل مہنگے ہیں تو کچھ دن صبر شکر سے بیٹھ نہیں سکتے تم لوگ، اگر کچھ دن فروٹ نہ کھایا تو نہ آسمان سر پر گرے گا، نہ قیامت آئے گی، ہاں البتہ میرا بجٹ ضرور سکون کا سانس لے لے گا....."

☆☆☆

"مبارک ہو، مبارک ہو... رمضان کا چاند نظر آ گیا ہے ان شاء اللہ کل پہلا روزہ ہوگا....."

آمنہ بیگم یہ جملہ یوں دہرا رہی تھیں جیسے وہ محلے میں..... لاڈ ڈاڈا سپیکر پر اعلان کر رہی ہوں۔ پورا کمران کی آواز سے گونج رہا تھا۔ سب سے پہلے وہ سیدھی اپنی ساس کے کمرے میں پہنچیں
 "امی جان، رمضان کا چاند ہو گیا ہے....."

ساس نے چونک کر پوچھا،
 "ہیں؟ کس کا بچہ ہو گیا ہے؟"
 آمنہ بیگم کی ساس ذرا اوجھل رہیں۔۔۔

آمنہ بیگم نے پیشانی پر ہاتھ مارا، پھر ساس کے کان کے قریب جا کر تیز آواز میں بولیں،
 "امی! کسی کا بچہ نہیں کھویا، میں کہہ رہی ہوں، رمضان کا چاند نظر آ گیا ہے، آپ کو مبارک ہو... کل پہلا روزہ ہوگا۔"

اب کی بار بہو کی بات کانوں تک پہنچی تو وہ اچھل پڑیں، اور ذرا اچھلی سے بولیں۔

"ارے سن لیا، سن لیا، چلا کس لیے رہی ہے آمنہ، میں بہری نہیں ہوں۔"

تجھے بھی مبارک ہو رمضان کا چاند.....
 "اچھا یہ بتا آمنہ، میرے لیے وہی منگو الیا تھا یا نہیں؟"

"جی امی، منگو الیا ہے آپ کے لیے وہی۔"
 "ہاں بیٹا، سحری کے وقت ایک کٹوری دہی ضرور دے دیو، دہی کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے، روزہ آسانی سے کٹ جائے گا۔"

پھر وہ ذرا آنکھیں سکیڑ کر بولیں،
 "اور وہ میرا چاٹ مسالہ..... وہ تو نے منگو الیا؟"
 آمنہ بیگم کا چہرہ فخر سے چمک اٹھا۔
 "ارے امی، آپ کی پسند کا چاٹ مسالہ اور پاپڑی بھی، سب پٹلی کے ابو سے منگو الیا ہے۔"

ساس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔
 "میری بچی جیتی رہ، یہ تو نے بہت اچھا کام کیا ہے جب تک آلو چھو لے کی چاٹ میں پچی بھر کر چاٹ مسالہ نہ چھڑکا جائے، اور پاپڑی کو ہاتھوں سے مثل مثل کر اس میں نہ ملایا جائے، تب تک چنا چاٹ مزا نہیں دیتی۔"

وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر ایک بھر پور چٹخارا لیتے ہوئے بولیں، جیسے چاٹ مسالے کا ذائقہ زبان پر آ گیا ہو.....

آمنہ بیگم کھانے پینے کی ایک ایک چیز ذہن میں بٹھائے بیٹھی تھیں، سحری سے لے کر افطاری تک سب یاد تھا۔

جو یاد نہیں تھا... وہ تجھے صفدر صاحب کے کپڑے، جو انھیں تراویح پڑھنے کے لیے پہن کر جانا تھے۔

بیوی کو ماں کے ساتھ خوش گہیوں میں مصروف دیکھ کر صفدر صاحب کمرے میں چلے آئے۔۔۔
 "آمنہ.... انہوں نے ذرا توقف سے

پوچھا، ”میرا کرنا شلوار استری کر دیا تھا؟ مجھے تراویح کے لیے جانا ہے۔“

آمنہ بیگم ایک دم چونکیں۔

”ہاں... نہیں... ارے میں تو بھول ہی گئی پنکی کے ابوا

ابھی کر دیتی ہوں، ذرا سا انتظار کر لیجیے۔“

☆ ☆ ☆

صفر صاحب نے حیرت اور جھنجھلاہٹ کے طے جلے انداز میں کہا، ”حد کرتی ہو تم، اب استری کیسے کرو گی؟ لائٹ تو ہے ہی نہیں، تین گھنٹے بعد آئے گی۔“

آمنہ بیگم کی نظریں جھک گئیں۔

صفر صاحب نے گہرا سانس لیا اور تلخی سے بولے، ”افسوس کی بات ہے کہ، چکن سمو سے، بریانی جاٹ، پکڑے سب کچھ یاد ہے تمہیں، بس شوہر کے کپڑے استری کرنا ہی یاد نہیں رہا، آمنہ بیگم عداوت سے سر جھکائے خاموش کھڑی تھیں۔“

☆ ☆ ☆

پہلی سحری بہت اچھی ہو گئی تھی، اذان کی صدا سن کر صفر صاحب مسجد کی طرف روانہ ہو گئے، آمنہ بیگم نے ایک نظر پن پن پر ڈالی سنک برتنوں سے بھرا پڑا تھا اور چوہے کے گرد ہر شے بکھری ہوئی تھی۔

”آف اتنا سارا کام۔“ وہ بڑبڑا میں، ایک آہ بھری اور آستینیں چڑھالیں۔ برتنوں کے شور میں وقت یوں پھسلتا گیا کہ فجر کی نماز کا دھیان ہی نہیں رہا، جب آخری برتن رکھ کر انہوں نے اطمینان سے پن پن کا جائزہ لیا تو کھڑکی سے صبح کی روشنی اندر اتر چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

فجر کا خیال آیا تو دل میں ہلکی سی کسک جاگی، مگر خود کو یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ ظہر میں قضا پڑھ لوں گی۔ اس روز عبادت سے زیادہ گھر پر مصروفیت جیت گئی، اور فجر کی ساعت خاموشی سے گزر گئی۔

تیار یوں میں مصروف تھیں، پکڑوں کے لیے پالک، آلو اور بیٹکن کاٹ کر رکھ چکی تھیں اب وہ بیسن پھینٹ رہی تھیں، دماغ میں یہ خیال بھی گردش کر رہا تھا کہ پنکی کے ابو کو سب کچھ پسند آئے گا بھی یا نہیں۔

”اری او آمنہ، کہاں ہے ٹو؟“ ساس صاحبہ کی آواز کمرے سے آئی، تو وہ تقریباً دوڑتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچ گئیں۔

”جی امی، میں باورچی خانے میں تھی، بیسن پھینٹ رہی تھی۔“

”آئے ہائے کس کو پیٹ رہی تھی۔؟“

”امی میں کسی کو نہیں پیٹ رہی تھی میں کہہ رہی ہوں کہ میں بیسن پھینٹ رہی تھی پکڑوں کے لیے۔“ آمنہ بیگم نے اپنے ہاتھوں پر لگا بیسن ساس کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”اچھا، اچھا زیادہ چیخ مت، میں بہری نہیں ہوں۔“

”آمنہ! میں یہ بول رہی تھی، ہری مرچوں کے پکڑے ضرور بنالو اس میں چاٹ مسالہ اور املی بھر کر۔“

”جی! امی میں ہری مرچ، پالک بیٹکن اور آلو کے بھی پکڑے بنا رہی ہوں، پنکی کے ابو کو تو بیٹکن کے پکڑے بہت ہی زیادہ پسند ہیں۔“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھی کہ صفر صاحب گھر میں داخل ہوئے، آمنہ بیگم کی آنکھیں اسنے سرتاج کے ہاتھوں میں خربوزہ اور تربوز کے شاپردیکھ کر چمک اٹھیں۔

آگئے آپ؟ اور یہ خربوزہ تربوز کیا روپے کلو ملا؟“

صفر صاحب نے فروٹ کا شاپر گھن میں بچھے تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔

”آمنہ بیگم اب فروٹ مہنگا ہے یا سستا۔ تم گھر والوں کی فرمائش تو پوری کر رہا ہوں ناں۔ اللہ رحم کرے ہمارے ملک پر اشیاء خورد و نوش کی قیمتیں تو آسمان سے باتیں کر رہی ہیں لیکن آفرین ہے ہم

عوام پر کہ مجال ہے کسی چیز کا باریکات بھی کریں۔
بازار میں رش دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
سب مفت میں بٹ رہا ہے، نا جانے کب ہمیں غفل
و شعور آئے گا.....“

☆☆☆

کچھ گھنٹوں کے بعد۔
”آمنہ بیگم! تم نے عصر کی نماز پڑھ لی؟“
”ابھی نہیں پڑھی پنگی کے ابو۔“
”وہ ناں میں۔ بس ابھی پڑھنے ہی کھڑی
ہو رہی تھی۔“ آمنہ بیگم پر بوکھلاہٹ طاری تھی،
”کب پڑھو گی تم نماز“ جب مغرب کا ٹائم ہو
جائے گا۔“
”ارے پنگی کے ابو ابھی تو مغرب میں کافی
ٹائم پڑا ہے۔“

پڑھ لوں گی میں نماز۔ دیکھیں تو ذرا، کتنے
کام پڑے ہیں افطار کے، نماز کا تو ٹائم ہی نہیں ملتا
مجھے۔
وہ بریانی کے لیے مرغی دھوتے ہوئے جلدی
جلدی بول رہی تھیں۔

”بہت افسوس کی بات ہے آمنہ بیگم! ان
فضول کاموں کے لیے تمہارے پاس وقت ہی وقت
ہے لیکن نماز پڑھنے کے لیے صرف پانچ منٹ بھی
نہیں، اور میں تو تمہیں قرآن مجید بھی پڑھتے ہوئے
نہیں دیکھتا.....“

”تم نے تو بچوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیا
ہے۔“

”اب ایسا کیا کر دیا میں نے پنگی کے ابو، جو
آپ مجھے باتیں سنائے ہی چلے جا رہے ہیں، صبح
سے میں سب کے لیے افطار کی تیاریوں میں لگی پڑی
ہوں، کتنا خیال رکھتی ہوں سب کا، لیکن آپ کو تو اس
بات کا بالکل بھی احساس نہیں، کتنی تھک جاتی
ہوں۔“ یہ سب کہتے ہوئے وہ روہاسی ہوئی جا رہی
تھیں۔

”دیکھو آمنہ! تم میری بات کو سمجھ نہیں رہیں۔“

اور بے کار کے ٹسوے بہا رہی ہو۔ ارے بھئی، میں
نے کب اس بات سے انکار کیا ہے کہ تم ہم سب کا
خیال نہیں رکھتیں۔

میں تو تمہیں صرف اس مہینے کی اہمیت کو
سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں، رمضان کا یہ بابرکت
مہینہ اللہ کی طرف سے ہم مسلمانوں کے لیے ایک
نایاب تحفہ ہے، اور ہمیں دل و جان سے اس تحفے کی
قدر کرنی چاہیے، ہم خوش نصیب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے
ایک بار پھر مہلت دی، ہمیں اس مہینے میں زیادہ سے
زیادہ عبادت کرنی چاہیے اور اپنے گناہوں کی معافی
مانگنی چاہیے، نہ کہ فضولیات میں وقت ضائع کر کے
ان قیمتی دنوں کو گنوا دیں، کچھ معلوم نہیں، اگلے سال
یہ مہینہ نصیب ہوگا بھی یا نہیں۔

اور تمہیں معلوم ہے آمنہ بیگم یہ وہ رحمت کا
مہینہ ہے جس میں دوزخ کے دروازے بند اور جنت
کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اس لیے ہمیں
چاہیے کہ ہم جتنی بھی نیکیاں سمیٹ سکتے ہیں سمیٹ
لیں۔

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں پنگی کے ابو! مجھے
احساس ہو رہا ہے کہ میں کتنے فضول کاموں میں الجھ
کر وقت ضائع کرتی رہی۔“

اندازہ نہیں تھا میں کتنے اندھیرے میں تھی،
آمنہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”پنگی کے ابو، کیا
اللہ مجھے معاف کر دے گا؟“

”کیوں نہیں آمنہ، اللہ بہت غفور و رحیم ہے، وہ
تو اپنے بندوں کو بار بار معاف کرتا ہے، اس کی
رحمت سے مایوسی کفر ہے۔۔۔ جاؤ اب سب کام
چھوڑو، پہلے عصر کی نماز ادا کرو، یہ دنیاوی کام تو زندگی
کے ساتھ چلتے ہی رہتے ہیں لیکن دائمی سکون صرف
اللہ کے سامنے جھکنے سے ہی ملتا ہے.....“

کچھ کہانیاں صرف پڑھنے کے لیے نہیں ہوتیں
کچھ کہانیاں سوچ بدلنے کے لیے بھی لکھی جاتی
ہیں۔

☆☆



شہر سے دور بنے اوک ہاؤس میں رہنے والی۔ سبیل کو دنیا دیکھنے کا شوق ہوتا ہے کیوں کہ کسی نادیدہ دشمن کی وجہ سے اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں ہوتی، وہ دادی نسیم بانو کے ساتھ رہتی ہے جہاں کچھ ملازمین بھی ان کی حفاظت پر معمور ہیں۔ تیز الدین کی بیٹی صفا بھی اس کی ہم عمر سہیلی ہے جو سبیل کو اس کے لئے سیدھے خیالات پر ٹوکتی ہے۔

کوئی خیابان میں نواب میر قربان علی خان کا خاندان آباد تھا۔ میر عثمان علی خان اور بیگم عنایت جہاں، ان دونوں بہن بھائی کے علاوہ بے شمار نوکروں کی فوج تھی۔

بیگم عنایت جہاں نے عدن کی اپنے چوالیس سالہ بھائی میں دلچسپی دیکھ کر انہیں شادی کے لیے قائل کر لیا تھا۔ گھر میں بیگم عنایت جہاں کا حکم چلتا تھا۔ ان کا ایک بیٹا تھا۔ وہ سسرال چھوڑ چکی تھیں۔

سبیل گھر کا سامان لانے والے ٹیپو میں چھپ کر سوار ہو جاتی ہے اوک ہاؤس میں شور مچ جاتا ہے۔ بیگم عنایت جہاں جن کا یہ اوک ہاؤس ہے کو اطلاع دی جاتی ہے۔

سبیل چل چل کر تھک جاتی ہے بڑک پر آتی جیب والے سے مدد مانگتی ہے۔ اچانک اس کی نظریک دیو مر کے نیچے لٹکتی ننھی سی گڑیا پر پڑتی ہے۔

سبیل کو آدم بحفاظت اپنی جیب میں اوک ہاؤس پہنچا دیتا ہے جہاں اس کی مہربانی کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

عنایت جہاں اپنے خاص ملازم صدیقی کے ذریعے آدم کا ماضی کھنگال کر اسے ایک سیلرٹی کے بیٹے کو زخمی کرنے اور اس کے پولیس سے چھپنے کو اپنے لیے استعمال کرتی ہیں اور اسے اوک ہاؤس کا ڈرائیور بننے پر مجبور کرتی ہیں۔ آدم راضی ہو جاتا ہے کسی گواہ بننے کا خفیہ پیغام دیتا ہے۔

عدن اپنے شوہر میر عثمان کی جاسوسی کرواتی ہیں لیکن انہیں معلوم ہو جاتا ہے عدن کے لیے یہ شرمندگی عذاب ہے اسی پریشان میں وہ اپنے آفس میں اچانک بے ہوش ہو جاتی ہیں۔

آدم اور سبیل غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے میں دلچسپی لے رہے ہیں آدم کے کسی بہت اپنے کی بیماری اور اسپتال میں داخلے کی خبر سبیل کو پریشان کر دیتی ہے۔

عدن ماضی میں ڈاکٹر اسفندیار کی دوستی کی وجہ سے پریشان ہوتی ہیں جو میر عثمان کے جلنے والے ہیں۔

ساتویں قسط

اس کی فہما پھر ایک نئے سفر پر نکل تھی۔ آج وہ درمیان ادھر سے ادھر منتقل ہو رہی تھی۔ ایک آسانی جلد والی کتاب بھی جو دو ہاتھوں کے تب ہی فون بجنے لگا۔ ان دونوں کے پاس

ایک ہی فون تھا جو بے چارہ کسی کو نے میں پڑا رہتا۔
”دادی! اس وقت؟؟ ہیلو۔“

صفا کی آواز پر وہ بھی قلم روک کے اسے دیکھنے لگی۔

”دادی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ فون رکھ کے اس نے سبیل کو دیکھا۔ وہ ڈائری بستر پر اچھال کر زینے کی سمت دوڑی۔ صفا اس سے آگے گئی۔

سکیم بانو گھبراہٹ اور بے چینی سے سینہ مسلتی، پسینے میں شرابور، سانس بھی کھینچ کر لے رہی تھیں۔

”دوائی لی تھی آپ نے؟“ سبیل نے پوچھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ میز سے آلہ اٹھا کر ان کا بلڈ پریشر دیکھنے لگی جب کہ صفا تمیز الدین کو بلانے دوڑی۔

”بی بی بہت بڑھا ہوا ہے دادی!“ اس نے فکر مندی سے کہا۔ تب تک تمیز الدین اور صفا بھی آگئے تھے۔

”فورا ہسپتال چلتے ہیں۔“ سکیم بانو کا چہرہ دیکھ کر تمیز الدین بھی فکر مند ہوئے۔

”دوا دے دو مجھے، اتنی رات کو کہاں جائیں گے۔“ ان کی آواز تھا بہت بھری تھی۔

”دوا آپ لے چکیں دادی، اب کون سی دوا دیں؟“ وہ ان کے پاس بیٹھ کے ان کا ہاتھ سہلانے لگی۔

”ابا، آپ ڈرائیور کو جگائیں۔“ صفا نے کہا۔ ”ہم دادی کو لے کر آتے ہیں۔“ ان کی ایسی حالت اس سے پہلے بھی نہیں ہوئی تھی۔

تمیز الدین نے باہر جا کر آدم کا دروازہ کھٹکھٹایا جو اگلی دستک سے پہلے ہی کھل گیا۔

”آپا کی طبیعت بڑھ رہی ہے، اسپتال جانا پڑے گا۔“

”دومنٹ میں چھینچ کر کے آیا۔“ آدم کی بات سن کر وہ واپس اندر آئے اور نزاکت کو جگایا۔

سبیل نے دادی کو شمال اوڑھا کے ہال میں

صوفے پر بٹھایا۔ صفا اندر ان کی فائل ڈھونڈ رہی تھی۔

”ہم بھی چلیں؟“ سبیل نے پوچھا۔ ”نہیں بیٹا۔ گاڑی میں اتنی جگہ نہیں ہے، نزاکت بھی ہوگا ساتھ۔“

”نزاکت کی کیا ضرورت۔“ اس نے دل میں سوچا۔ اسے کہاں خبر تھی کہ نیچے والے قصبے تک ٹھیک تھا اس کے آگے آدم، نزاکت کے بنا نہیں جاسکتا تھا۔

صفا ان کی فائل لے کر آئی تب ہی باہر سے جیپ کی آواز ابھری۔

”تم دونوں دروازہ بند رکھو۔ نیچے جیرو ہے۔“ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔“ تمیز الدین نے انھیں ہدایت دی۔

”ہم بھی چلیں۔ جگہ ہے تو۔“ دادی کو جیپ میں بٹھاتے ہوئے اس نے پھر تمیز چاچا سے کہا۔

”اسپتال میں اتنی بھیڑ کا کیا کام؟ ہم جلد آجائیں گے۔“ وہ بھی پیچھے بیٹھ گئے۔ نزاکت نے گیٹ کھولا۔

”اندر جاؤ اور دروازہ بند کرلو۔“

”آپ فون کیجیے گا۔“ اس نے ایک نظر دادی کو دیکھا۔ اڑھارہ صورت، ویران آنکھیں، تھکا نڈھال بدن، کوشش سے آتی جاتی سانسیں۔ وہ بار بار پسینہ صاف کر رہی تھیں۔ جیپ کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے مشکل سے خود کو روکنے سے باز رکھا۔

گیٹ سے باہر جا کے آدم نے بریک لگائے۔ نزاکت نے گیٹ بند کیا اور اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جیپ چل پڑی۔

”کیا ہوا ہے دادی کو؟“ اس کی آواز میں خوف تھا۔

”بی بی بڑھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر دوا دے گا اور وہ کنٹرول ہو جائے گا۔“

”یہ میرے جانے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔“ وہ

اب بھی اندھیرے میں جیب کی گم ہو گئی پھولی تپوں کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”دادی کو بی پی کا مسئلہ سالوں سے ہے۔ پرانی دوائیں اثر نہیں کر رہی ہوں گی۔ یاد کرو ڈاکٹر نے کہا تھا نا۔ کچھ وقت بعد بدلنا پڑی ہیں یا ڈوز بڑھانا پڑی ہے۔“ لیکن سبیل کی سوچ وہیں اٹک گئی تھی۔ صفا اسے زبردستی سمجھ کر اندر لے گئی۔

اندر جا کے انہوں نے حسب ہدایت دروازہ بند کیا اور ادھر کمرے میں آ گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رات کے اس پہر وہ دونوں ’اوک ہاؤس‘ میں تنہا تھیں۔ ان کی حفاظت پر مامور سب ہی لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔

☆☆☆

ماضی بعید

وہ اکیلی تھی اور سارا وقت ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ اگر وہ آگیا تو؟ کالج کے گیٹ سے نکلتے ہوئے آج احساسات یکسر مختلف اور نئے تھے۔ بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے وہ ادھر ادھر نہیں دیکھ رہی تھی۔ سر جھکائے ہی اس نے راستہ طے کیا۔ اس کی آواز نہ آنے پر کچھ حیران، اسٹاپ سے دو قدم پہلے اس نے سر اٹھایا اور وہ سامنے اسٹاپ کے ستون سے ٹک کے کھڑا ہے ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک جتنا تبسم اس کے چہرے پر بکھرا اور اس ساحرہ نے اپنی مسکراہٹ چھاتے منہ پھیر لیا۔ وہ بیک دوسرے کاندھے پر پھٹل کرتی اس سے فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ پیچھے دو افراد بیٹھے تھے۔

وہ جیب میں ہاتھ ڈالے، یونہی ایستادہ تھا جب کہ اس کے کان منظر تھے کہ وہ اب کچھ بولے گا تاہم اس کا ارادہ آج آزمائش تھا۔

اس نے پیروں پر وزن منتقل کیا پھر بیک ادھر سے ادھر کیا۔

”آج جیب کیوں ہیں؟“ وہ اس کی سمت دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ چہرے پر اڑی ہے نیازی پھیلی تھی جو اندر بند رہی۔

”اس طرح آپ دو سہیلیوں کو دشمن بنا دیں گے۔“ بالآخر اس کے خاموش تبسم اور مسکراتی جتنائی نگاہوں سے ٹک آ کے اس نے کہا۔

”کیسے؟“ وہ آج گویا تہیہ کر کے آیا تھا اس کے پہل کرنے کے بعد ہی منہ کھولے گا۔

”ہمیں شک ہو رہا ہے آپ اس سے باتیں کرنے آتے ہیں۔“ اس کی خاموشی کا شکوہ اس نے جس انداز میں کیا وہ اش اش کراٹھا۔ ”ہم تو اس لیے لب سے ہیں کہ آپ کے مزاج نازک پر گراں نہ گزرے۔“ وہ تعظیماً اور شرارتاً ختم ہوا۔

”اتنی اردو کیا ہمارے لیے سیکھ رہے ہیں؟ ہم متاثر نہیں ہوتے ویسے۔“ اس نے ادا سے ٹاک چڑھائی۔

”ویسے۔“ وہ اس کے آخری لفظ دہراتے ہوئے ہنسا تھا۔

”ویسے ایک بات جو ہم آپ کے بارے میں جان گئے ہیں جس سے آپ انکار نہیں کر سکتیں۔“ وہ کیا؟

”آپ جھوٹ بڑے اعتماد سے بولتی ہیں۔“ اس نے ذرا جھک کے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”متاثر تو آپ کب کی ہو چکیں؟“

اس کی مسکراہٹ واقعی نظر ہٹانے کے لیے مشقت طلب کرتی تھی۔ وہ چپ سی اس سے نظریں چرا گئی۔

”ہمیں کیوں لگ رہا ہے کہ آج آپ ہماری استدعا قبول کر لیں گی؟“ وہ اس کے دائرہ نگاہ کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اب کے وہ اس اعتماد پر اش اش کر اٹھی۔

”ہو سکتا ہے۔ کوشش کر کے دیکھیں۔“ اس نے شرمانے گھبرانے کے بجائے مقابل کی آنکھوں میں دیکھا۔ اعتماد دونوں طرف کم نہ تھا۔

اس کی نہ شادی بیاہ کی عمر تھی نہ ارادہ تھا، محبت اور محبوب تو بھی اس کی خواہشوں کی کتاب میں درج ہی نہیں ہوئے تھے مگر اس لمحے سب بدل گیا۔ وہ کم عمر

سہی لیکن کمزور قوت ارادی کی مالک نہ تھی بلکہ اسے کیا چاہیے، اس کے لیے کیا اہم ہے، اس ضمن میں وہ بڑی محکم سوچ رکھتی تھی اور اس لمحے اس نے دل کی بھی سن لینے کا سوچا جو اس اجنبی کی جانب جھکا جا رہا تھا۔

وہ پہلا دن تھا جب اس نے کافی کی دعوت قبول کی تھی۔ اس دن پہلی بار ان دونوں نے کچھ وقت ساتھ گزارا۔ چند منٹ کی ملاقات، ان کے مختصر مگر بڑے گہرے تعلق کا پہلا زینہ تھی کہ جذبوں میں دونوں کے شدت تھی اور وہ ایک دوسرے کے لیے مخلص ثابت ہوئے تھے۔

☆☆☆

تقریباً تین گھنٹے بعد تمیز الدین نے فون کیا کہ ڈاکٹر نے دیکھ لیا ہے اور کچھ دیر میں واپسی کے لیے نکلیں گے۔ جب وہ اوک ہاؤس پہنچے تو ذرا دیر بعد صبح ہوا تھی۔ دونوں انتظار کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ خاموشی میں جب کی آواز اور پھر گیٹ کھلنے کے شور پر سبیل کی آنکھ کھلی۔ پہلے اس نے درتپے سے جھانکا پھر نیچے آئی۔

سب نیند سے بے حال تھے سوائے آدم کے۔ نزاکت سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ دادی کو وہ کمرے میں لے آئی۔

”نماز کا وقت ہو گیا ہوگا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کچھ منٹ باقی ہیں۔“

”نماز پڑھ کے سوئی ہوں۔“ وہ وضو کرنے چلی گئیں۔

”کیا کہا ڈاکٹر نے؟ کیا ہوا تھا دادی کو؟“ اس نے تمیز الدین سے پوچھا جو ہال میں بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر نے تو انہیں اسپتال میں داخل کر کے مزید جانچ کا کہا تھا مگر نسیم بالور کئے پر تیار نہ ہوئیں۔

”سب ٹھیک ہے، کچھ نئی دوائیاں دی ہیں۔“ وہ اس کا فکر مند چہرہ دیکھ کر اتنا ہی کہہ سکے۔

”معا سوری ہے؟“

”جی، میں نے جگایا نہیں۔ آپ کو کچھ چاہیے؟“

”نہیں۔ اب سونا ہی ہے۔ نماز پڑھ لوں۔“ وہ اٹھ گئے۔

سوئی وہ بھی ذرا دیر تھی لیکن اب نیند اڑ گئی تھی۔ اوپر جا کے اس نے بھی نماز پڑھی اور پھر دادی کے پاس آئی۔ وہ دعا مانگ رہی تھیں۔

”ابھی کیسا محسوس کر رہی ہیں؟“ وہ کھڑی ہوئیں تو سبیل نے ان کے ہاتھ سے مصلیٰ لے کر یہ کیا۔

”نیند آرہی ہے۔“ وہ ہلکے پر بیٹھ کر تکیہ درست کرنے لگیں۔

”آپ آرام کریں۔ کچھ ضرورت ہو تو مجھے فون سیجیے گا، یہاں سے اٹھیے گا مت۔“ اس نے فون سر ہانے رکھا۔ انہوں نے سر ہلایا اور لیٹ گئیں۔

صفا الارم پر اٹھ جائے گی سوچ کر وہ ڈائری لیے باہر جانے لگی۔ آدم اس وقت تو جاگنگ کو نہیں جائے گا۔ اسے بھی سونا ہوگا۔ وہ پورج کی دیوار پر بیٹھنے کے ارادے سے دروازے کی طرف جارہی تھی کہ باورچی خانے سے آئی آواز پر ٹھٹھک کے رک گئی۔ تمیز چاچا یا نزاکت کی امید میں وہ باہر جانے کے بجائے ادھر آئی۔ دروازے میں ہی اس کا ڈھیلا لاپرواہ اندازا ٹینشن میں آگیا۔

آدم چوہے کے دائیں جانب اوپر والے خانے کا پٹ کھولے کچھ تلاش کر رہا تھا۔

”کچھ چاہیے؟“ سبیل نے پوچھا۔

”چینی اور پتی۔“ اسے چائے کی طلب تھی۔

سبیل نے اندر جا کے ڈائری میز پر رکھی۔ آدم کاؤنٹر سے دو ہو گیا تھا۔ اس نے کاؤنٹر پر ایک طرف دیوار سے لگے دو ڈبے اٹھا کے سامنے رکھے۔

”ٹھیک یو۔“

”جائے میں بنا دیتی ہوں۔“ اس نے اپنی خدمت پیش کرنے میں جلد بازی کی کہ جملہ مکمل ہوتے ہی یاد آگیا تھا، وہ اس کا تختہ مشق رہ چکا ہے۔

اس پتہ آدم کی مسکراہٹ! آپ بیٹھیں۔ آج میں آپ کو چائے پلاتا ہوں۔“ اسے بچل دیکھ کر آدم نے مسکراہٹ ضبط کی اور برتن کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

سبیل نے اپنی شرمندگی چھپاتے ہوئے بچل الماری سے پتلی نکال کر ڈبوں کے سامنے رکھی پھر فرج سے دودھ نکال کے ’جزائے ترکیب‘ مکمل کیے۔

”تھینک یو“ اس نے ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے چولہا جلایا۔
”آپ بیٹھیں۔“

وہ سب سے آخری والی کرسی پر جا کے بیٹھ گئی۔ باورچی خانے میں ڈبے کھینچے بند ہونے، پانی میں چینی جی کرنے کی ہلکی آوازیں تھیں۔ وہ چوٹے کی آٹھ کم کر کے پلٹا۔ سبیل جو عقیب سے بغور اس کی حرکتیں دیکھ رہی تھی، شیشا گئی اور بھی ڈائری پر نگاہ پڑی جو اس نے میز پر رکھ دی تھی جسے آدم ہاتھ بڑھا کے اٹھا سکتا تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ وہ بالکل نہیں چاہتی تھیں، فہما کے کارنامے وہ جانے۔

آدم آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ ڈائری پر رک گیا۔ اسے یقین تھا ڈائری میں فہما کسی بیج پر سورج کی وہ پہلی کرن ہوگی، پانی کی بوتل، یا آسانی جلد والی کتاب یا اوک ہاؤس کا گیٹ یا اس کے ہاتھ میں لہراتا اخبار۔ اس کا کارنامہ، اس کا انوکھا تجربہ پڑھنے کی اس کے اندر شدید خواہش تھی۔

آدم نے اپنی طلب کو پھیل دے کر، ڈائری دھیرے سے اس کی طرف دھکیل دی جو سبیل کے سامنے آ کے رک گئی۔

وہ پھر پیچھے کاؤنٹر سے ٹپ کر کھڑا تھا۔ اسے چائے کے جلد پینے کی جلدی نہیں تھی۔ اچانک سبیل کو یاد آیا۔

”آپ نے سنا تھا ڈاکٹر نے کیا کہا ہے دادی کے لیے؟“

”وہ کچھ ایڈیشنل ٹیسٹ کے لیے کہہ رہے تھے لیکن دادی ریڈی نہیں تھیں۔“
یہ اسے کسی نے نہیں بتایا تھا۔ اس کا چہرہ ایک دم بدل گیا۔

”وہ شاید رات میں رکنا نہیں چاہتی ہوں۔ کسی دن ارلی مارننگ اسپتال جا کے ٹیسٹ وغیرہ ہو سکتے ہیں۔“ آدم کی بات پر اس نے سر ہلایا۔

آدم نے ذرا رخ موڑ کے چائے کو دیکھا۔ ایک نظر، نظر جھکائے پر سورج سی سبیل پر ڈالی اور پلٹ گیا۔ اسے اس سمت پلٹ دیکھ کر سبیل کو بھی یاد آیا۔ وہ دھیرے سے اٹھی اور دو کپ اور چھلنی نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیے پھر واپس اسی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی ایک بار پھر سناٹے میں چینی کے برتن اور اسٹیل کی چھلنی آپس میں ٹکرائے کھٹکتی کھٹکتی کرتے رہے۔

آدم نے چائے چھاننے کے بعد کپ اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ خود وہیں کاؤنٹر سے ٹک کے اپنا کپ اٹھا لیا۔

وہ بہت گرم چائے نہیں پیتی تھی۔ اب بھی وہ بھاپ اڑاتے کپ کو دیکھتی رہی جس میں موجود چائے کی رنگت بڑی خوش نما تھی۔ اسے پہلی ملاقات کی چائے یاد آ گئی تھی۔

”کیا انھیں بھی وہی یاد آیا ہے؟“ اس نے کن اکھیوں سے آدم کو دیکھا جو کپ سے گھونٹ لے رہا تھا۔

”مجھے چائے ختم کر کے جانا چاہیے، کب تک بیٹھی رہوں گی۔“ اس نے کپ اٹھا لیا۔

”یہ اسے کمرے میں بھی تولے کر جا سکتے تھے۔ میں بھی تو کپ لے کے یہاں سے جا سکتی ہوں۔“ خیالوں کے بیچ اس نے پھونک مارنے کے بعد چائے کا گھونٹ لیا اور ایک بار پھر شرمندہ ہو گئی۔ ایسی چائے بنانے والے نے اس کی بنی چائے کا پورا کپ ختم کیا تھا۔ اسے لگا اس مہربانی کے بعد اگر آدم اس کے ہاتھ قلم کرنے کا حکم بھی دے دیتا تو غلط نہ ہوتا۔

اس کی سوچیں بنا کسی روک ٹوک کے ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ سنک میں پانی گرنے کی آواز آئی تب وہ خیال سے باہر آئی۔ وہ چائے کا خالی کپ دھو رہا تھا۔

”آپ رہنے دیں۔“ جلدی سے کہتے ہوئے وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔
”برتن رہنے دیں پلیز۔“ آدم کپ رکھ کے پلٹا۔

اب رکے رہنے کا جواز نہیں تھا۔ وہ باہر جانے لگا تھا کہ سبیل کو یاد آیا۔
”وہ!“ اور کسے پکار کے روکتی، اسے نہیں سوچھا۔ آدم پلٹ کے دیکھنے لگا۔

”وہ۔ وہ جنھیں آپ۔ وہ جو ہاسپٹل میں تھے، اب کیسے ہیں؟“
”کچھ بہتر لیکن انھیں ہوش نہیں آیا ہے۔“ آدم نے دھیرے سے کہا۔

”ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ اس کا دل یہ جان کر اداس ہو گیا۔
”ان شاء اللہ۔“ آدم نے بھی یقین سے سر ہلایا۔

”میں انھیں بابا بلاتا ہوں۔“ کچھ دیر سوچنے کے بعد آخر اس نے کہہ دیا۔

کسی نے اسے اپنی بڑی ذاتی بات بتائی تھی۔ اپنی عزیز ہستی کے بارے میں کچھ بانٹا تھا۔ یہ ہم اجنبیوں کے ساتھ نہیں کرتے دل اس نئے احساس سے لبریز ہوا اور چہرے سے چھلک پڑا۔ آدم کے لیے وہ چھلکا احساس نیا نہیں تھا۔ اس سے وہ جملہ اسی احساس نے بلوایا تھا۔

”آپ چائے ختم کریں ورنہ کچھ دیر بعد جو کپ میں بچے گا، اس ٹھنڈی چیز کو چائے نہیں کہتے۔“ آدم نے مسکرا کے بتایا وہ ایک بار پھر گڑبڑائی وہ سبیل پر نظر غائر ڈال کر چلا گیا۔ وہ دھب سے کرسی پر بیٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھ کے سر جھکایا۔ فوراً ہی اس کی ہدایت یاد آگئی اور اس

نے کپ اٹھالیا۔

چائے پی کر اس نے ڈائری کھول لی۔ جب صفا آئی، وہ مکن سی ڈائری پر جھکی تھی، قلم تیزی سے چل رہا تھا۔

”مجھے جگایا کیوں نہیں؟ کب آئے سب؟“
وہ نماز پڑھ کے نیچے اتری تھی۔
”تھوڑی دیر پہلے۔“ اس نے ڈائری بند کر دی۔

”ابا کہاں ہیں؟“
”وہ نماز پڑھ کے سو گئے ہوں گے۔“
”تم کس لیے چائے پی رہی ہو؟ سو جاؤ جاگتی رہی ہو تم بھی۔“ شکر تھا کہ اس نے دوسرے دھلے کپ پر توجہ نہیں دی تھی۔

”دادی کیسی ہیں؟ ڈاکٹر نے کیا کہا؟“ صفا نے پوچھا۔
”دادی نا۔“ وہ اسے ساری بات سناتے باہر نکلی۔

☆☆☆

”نما! امام!“ رشی باہر سے ہی پکارتا اندر آیا تھا۔

اس کے دروازہ کھولنے سے پہلے ہی عنایت جہاں نے اخبار بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

”آپ اس وقت جاگ کیسے گئے؟“ انہوں نے اندر داخل ہوئے بیٹے کو پیار سے دیکھا۔
”آپ سے فیس ٹوفیس بات کرنا تھی۔“ وہ شب خوالی کے لباس میں ہی ادھر چلا آیا تھا۔
”نچر دن بھر آپ مٹی نہیں ہیں اور رات ہم لیٹ ہو جاتے ہیں۔“

”کچھ خاص؟“ انہوں نے انگریزی میں پوچھا۔

”لیس۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ عنایت جہاں کو لگا، وہ روما کی ہابت کچھ پوچھے گا۔
”ہم نے فرینڈز کے ساتھ کچھ دن کا آؤٹ ڈورائے پلان کیا ہے اس کے لیے ہمیں کوئی گوتھک

ٹائپ پلیس چاہیے۔“ رشی روما کو قطعی بھول چکا تھا۔ ان کے اندر غرور سا بھر گیا کہ ان کا بیٹا، ان کی طرح ترجیحات درست رکھنا جانتا تھا۔ کب اور کہاں کے چھوڑ دینا ضروری ہے، یہ علم اور عادت کام یاب ہونے کے لیے بڑی اہم تھی۔

”روحان نے کچھ پلیس شارٹ لسٹ کی تھیں، اس میں ایک ’اوک ہاؤس‘ بھی ہے اور ہمیں اب پتا چلا کہ وہ بھی دادا ابا کی پراپرٹیز میں شامل ہے۔

عنایت جہاں اپنا تاثر چھپا نہیں پائیں۔ مارے حیرت کے ان کا منہ کھلا تھا اور وہ بالکل ساکت۔

”وہ ریٹڈ ہے یا کوئی کیئر ٹیکر ہے؟ آپ اسے ہمارے لیے کلین اور اوپن کروادیں۔“

عنایت جہاں نے خود کو اس جھٹکے سے سنبھالا۔ ”آپ کے لیے گوٹھک پلیس کا انتظام ہم کر دیتے ہیں۔ جیلیم گڑھ والے رانا صاحب کا محل ہے۔

اوک ہاؤس تو اب صرف نام ہے۔ اس کے روٹن ہی بچے ہیں، وہاں کوئی ’پلیس‘ نہیں ہے۔“ انھیں احساس ہوا صفائی اور وضاحت زیادہ طویل ہو رہی ہے، وہ رک گئیں۔

”سیڈ افسیڈینگ نیم تھا ’اوک ہاؤس‘! رشی نے تاسف سے کہا۔

”آپ ہمیں جیلیم گڑھ کا ایڈریس اور کاٹھیٹ پرسن کا نمبر دے دیجیے گا۔“

”صدیقی سب آرینج کر کے آپ کو انفارم کر دیں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ وہ مسکرائیں۔

”اوکے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ آج ریلیکس ہیں، جانا نہیں ہے؟“

”آج ہم گھر پر ہی ہیں۔“ انہوں نے اخبار اٹھایا۔ آج کا دن مختلف انٹرویو کے لیے مختص تھا۔

”ہم نے پھر نیند خراب کی اپنی۔“ اس نے منہ بنایا اور وہ متاثر ہو کر شفقت سے مسکرائیں۔

”گڈ نائٹ!“ وہ ہاتھ ہلا کے ان سے کہتا ہوا

چلا گیا لیکن ذہن میں اب ’اوک ہاؤس‘ نقش ہو چکا تھا۔

عنایت جہاں کی پیشانی ایک بار پھر شکنوں سے بھری تھی۔ اخبار گود میں رکھے وہ گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔

اچانک، پہلی بار انہوں نے رشی کی ان کی بات مان جانے والی عادت کا موازنہ سبیل کے مزاج سے کیا تھا۔ یہ بالکل بے اختیاری عمل تھا کہ انھیں اس وقت سبیل کا ان سے وعدہ نہ کرنا اور آئندہ اوک ہاؤس سے جانے کی کوشش نہ کرنے کی یقین دہانی نہ

کرانا یاد آیا تھا۔ وہ اس کے بچپن سے ہی اس کا یہ مزاج دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اسے کھلنے کی کوشش میں سب سے پہلے اس کا خود کو ہم کہنا بند کروایا تھا۔

اس کا صیغہ متکلم ’ہم‘ تو بدل گیا تھا مگر مزاج کی ضد زندہ تھی۔ وہ کم عمری سے ہی مضبوط قوت ارادی رکھتی تھی، بالکل ان کی طرح۔

وہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ سب کچھ اپنے اختیار اور ضبط میں رکھنے والی عنایت جہاں اس مقام پر نا کام رہی تھیں۔ وہ سبیل کا مزاج، اس کی فطرت

اپنی مرضی میں ڈھال نہیں سکی تھیں۔ اسے ایک کھلے زنداں میں قید کرنے کے باوجود اس کی نفسیات بے بس اور مجبور قیدی کی نہیں بن سکی تھی۔

”اونہہ خون کارنگ!“ انہوں نے نفرت سے سوچا۔

”ہم غلط ثابت کریں گے خون کارنگ!“

کچھ دیر درتے سے باہر پھیلا خوب صورت منظر دیکھنے کے بعد انہوں نے میز سے فون اٹھا کے

صدیقی کو کال ملائی۔

”رشی کے دوست روحان۔“ صدیقی کے ’جی‘

نواب بیگم کے جواب میں انہوں نے کہنا شروع کیا۔ انھیں اندازہ نہیں تھا ان کا ’اوک ہاؤس‘ کو غیر

اہم ثابت کرنے کی کوشش کرنا رشی کے لیے اسے دلچسپ بنا گیا تھا اور یہ دلچسپی ایک دن انھیں ان کی فکر کا حریف عطا کرنے والی تھی۔

☆☆☆

میر عثمان، عدن کو پرچ کے لیے دی کارز لے جا رہے تھے۔ عدن کی انگلی میں وہی انگوٹھی جھمک کر رہی تھی جو کئی دن سے میر عثمان کے کتب خانے میں پڑی تھی۔ آج صبح وہ انھیں اپنی آرائشی میز پر ملی تھی۔ انہوں نے میر عثمان سے کچھ کہے بنا اسے انگلی کی زینت بنا لیا تھا۔

وہ دونوں دیوان عام عبور کر کے دالان میں پہنچے ہی تھے کہ عنایت جہاں سے ٹکرا گئے، جو میر قربان علی خان کو ان کی وکیل چیئر پر باہر ہلکی سیر کروا کر واپس ہو رہی تھیں۔ ان دونوں کے ان فائل چلے بتا رہے تھے کہ وہ دفتر نہیں جا رہے ہیں۔ تین اچھیل کے باوجود عدن کی زمین کو چھوٹی سرخ میکی کا نچلا حصہ، ننھے ننھے سفید پھولوں سے بھرا تھا جب کہ میر عثمان گہری سبز پولونی شرٹ اور سیاہ ٹراؤزر میں تھے۔

”طبیعت ٹھیک ہے اب آپ کی؟“ عنایت جہاں نے پوچھا۔

”جی۔“ میر عثمان جھک کے، ایک جانب گردن ڈالے، بیکس اور وکیل چیئر کے مخصوص سہاروں کے ذریعے ساکت بیٹھے میر قربان علی خان کا ہاتھ ان کی گود میں رکھ رہے تھے جو ایک طرف لٹک گیا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے ابا کو دھوپ کی زیادہ ضرورت ہے۔“ عنایت جہاں ان کی جانب متوجہ ہوئیں۔

”جی۔ ہمیں بھی کہا تھا۔“ انہوں نے نرمی سے باپ کے دونوں ہاتھ ایک ساتھ رکھنے کے بعد سر اٹھا کے انھیں دیکھا۔

”آج آپ بھی گھر پر ہیں۔“ اس اتفاق پر وہ مسکرا رہے تھے۔

”آج کچھ انٹرویوز ہیں۔ آپ دونوں کیا سلیمریشن کے لیے جا رہے ہیں؟“ ان کے استفسار پر دونوں نے کچھ متوجہ ہو

کے سوال پر نگاہوں سے انھیں دیکھا۔

”سنا ہے نئی دلہن کو چکر و کرا آجائے تو کوئی خوش خبری ہوتی ہے۔“ وہ عدن کو دیکھ کر مسکرائیں۔ عدن کے اندر پھر سانپ کی سرسراہٹ ابھری۔ وہ مسکرا بھی نہیں سکیں۔ میر عثمان کا ہلکا سا ہتھکڑا بے ساختہ تھا۔

”ایسی سلیمریشن تو آپ کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔“ میر عثمان نے ادب سے کہا۔

”چلیں اللہ جلد وہ دن بھی دکھائے ہمیں۔“ انہوں نے عدن کو دیکھا جو اتنی دیر میں آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا چکی تھیں۔ ان کے لب کسی طرح ہنسنے میں ڈھل گئے تھے کہ آنکھوں کی اذیت انہوں نے کامیابی سے چھپالی تھی۔

”خیال رکھیں عدن کا۔“ انہوں نے میر عثمان کے بازو پر ہاتھ رکھ کے کہا اور وکیل چیئر کو دھکا دیتی آگے بڑھ گئیں۔ کچھ فاصلے پر ان کے پیچھے نرس اور ملازم تھے۔

عدن کے لیے اب ذرا دیر والی بے فکری اور میر عثمان کے ساتھ اور قربت کی خوشی ویسی نہیں رہی تھی، جو عنایت جہاں سے ملنے سے پہلے تھی۔ آج تک میر عثمان نے یہ ذکر نہیں چھیڑا تھا اور انھیں صبیحہ بیگم کی بات پر یقین ہونے لگا تھا کہ جب وہ چائیس کے بعد بھی کنوارے ہیں تو اس کا مطلب تھا انھیں بچوں یا اپنے ولی عہد میں کوئی دلچسپی نہیں ورنہ اس طبقے کے لوگ اسی لیے جلد شادی کرتے ہیں، اگر شادی کا جنجال نہ چاہتے ہوں شادی کر کے بچے پیدا کر کے بیویاں چھوڑ بھی دیتے ہیں۔

میر عثمان نے دوبارہ وہ ذکر نہیں چھیڑا۔ وہ انھیں اپنے اسپرنگ وچ والے مکان کی تعمیر کی بابت بتا رہے تھے۔ برج کے بعد وہ انھیں وہیں لے آئے تھے۔

”آپ نے اپنی پسند سے اتنا خوب صورت گھر بنوایا لیکن یہاں مستقل شفٹ کیوں نہیں ہوئے؟“ عدن نے پوچھا۔

”ہم ابا کی وجہ سے خیاباں نہیں چھوڑنا

چاہے۔“ انہوں نے کار سے نکلے ہوئے کہا تھا۔
”انہیں بھی یہاں لے آئیں تو؟“ عدن نے
ان کے ساتھ قدم ملائے۔

”لے تو آئیں لیکن ہم جانتے ہیں عمر کے اس
حصے میں ابا خیاباں چھوڑنا نہیں چاہیں گے۔“
ملازم کی سمت کار کی چابی اچھالنے کے بعد
انہوں نے عدن کو دیکھا۔

”لیکن آپ جب چاہیں ہم کچھ وقت کے
لیے یہاں آ سکتے ہیں۔“ عدن مسکرائیں۔ اس لمحے
میر عثمان کے اتفاقات سے سرور ان کے دل و
دماغ ایک نئی بلکہ درست سمت چل پڑے تھے۔

☆☆☆

صدیقی لیپ ٹاپ کی اسکرین کو بغور دیکھ رہا
تھا۔ کچھ دیر ہاؤس سے اسکرین اوپر نیچے کرنے اور
چند ٹکس کھول کر پڑھنے کے بعد وہ لیپ ٹاپ اٹھا کر
بیم عینیت جہاں کی میز پر آیا۔ انہوں نے اپنا کام
ایک طرف کھسکا دیا۔

”مختلف طرح سے سرچ کرنے پر یہ ہی ایک
آرٹیکل ہے جس میں ’اوک ہاؤس‘ اور میر قربان علی
خان کا تذکرہ ہے۔ وہ بھی دس ایسی عمارتوں کی لسٹ
کے بعد لاسٹ میں ’آنر بیل مینشن‘ میں ہے۔ بہت
ممکن ہے روحان نے گوٹھک پلئس یا اولڈ رائل بلڈنگز
کی سرچ کے دوران یہیں ’اوک ہاؤس‘ دیکھا ہو، اور
کے نام بھی مینشن ہیں۔“

عنایت جہاں کی انگلی ٹچ پیڈ پر متحرک تھی۔
انہوں نے مضمون نہیں دیکھا۔ ان کے مطلب کی چیز
نامہ نگار کا نام تھا۔

”کیا وہ ای میل اسی کا تھا؟“ انہوں نے انگلی
مضمون کے مصنف کے نام پر رکھی۔

”ایک منٹ۔“ صدیقی نے ہاتھ آگے کر کے
لیپ ٹاپ کا رخ اپنی جانب کرنے کی اجازت طلب
کی۔ عنایت جہاں نے لیپ ٹاپ کا اسکرین اس کی
طرف کر دیا۔

کچھ دیر کی بورڈ اور ٹچ پیڈ استعمال کرنے کے

بعد صدیقی سیدھا ہوا اور لیپ ٹاپ کا رخ پھر عنایت
جہاں کی طرف کیا۔

”نہیں۔ ای میل ’نیکس‘، میگزین کے کسی
پراگ کپور کی طرف سے تھا۔“
”پہلے ان سے ملیے۔“ عنایت جہاں نے
اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔
”بار بار اوک ہاؤس کا ذکر ہمیں گڈاؤس نہیں
لگ رہا ہے۔“

صدیقی نے لیپ ٹاپ ان کے آگے سے اٹھا
لیا۔

”اُدھر سب ٹھیک ہے؟“
”کل رات نسیم بانو کو ہاسپٹل لے کر گئے تھے۔
بی بی بڑھا تھا، ڈاکٹر نے مزید انویسٹی گیشن ایڈوائس
کی ہے۔“

عنایت جہاں نئے خیال سے چونکیں۔ اگر نسیم
بانو ہی نہ رہیں۔؟ وہ عمر کے آخری پڑاؤ پر تھیں۔
دادی، سبیل کی واحد کمزوری تھی جن کے بنا اسے قابو
کرنا مشکل ہوتا۔

”اوک ہاؤس بند کرنا کتنی جلدی عمل ممکن
ہوگا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جتنا جلدی آپ کہیں۔“ وہ تو حکم کا غلام تھا۔
”ایک نئے انسان کو شامل کرنا رسکی نہیں؟“
انہیں بھی جیسے صدیقی کا امتحان لینے میں لطف آتا
تھا۔

”چھوٹا منہ بڑی بات۔“ وہ تعظیماً اور معذرتاً
ذرا سا جھکا تھا۔

”رسک تو اتنے سال اوک ہاؤس کو آباد رکھنے
میں بھی تھا۔ اس سے آسان یہ ہے کہ ہم سب کی تسلی
کے لیے بی بی کی شادی کر دیں، وہ ہر بنڈ اور دادی
کے ساتھ چلی جائیں۔ ایسا بندہ آپ تک پہنچانا ہمارا
کام ہے۔ اس کے بعد آپ چاہیں تو اوک ہاؤس بند
کر دیں یا تمیز الدین کو بطور کیئر ٹیکر رہنے دیں۔“
جواب میں یقین دہانی اور اعتماد کا یہ مظاہرہ صدیقی کا
خون بڑھا دیتا تھا۔

”پہلے ایسا قابل اعتماد اور قابل انسان
ڈھونڈ لے۔“ انہوں نے ایک طرف کیے کاغذ اور
لیپ ٹاپ کو سامنے کیا۔

”آدم کے بارے میں مزید کچھ؟“ ان کی
نظریں سامنے پھیلے کاغذات پر تھیں۔
”اس سے زیادہ کچھ ہے ہی نہیں جو پہلے سے
معلوم ہے۔“

”نویس اس کیس میں کیا کر رہی ہے دیکھیں
اور ایف آر آئی درج کروانے والوں پر بھی نظر
رکھیں۔“

”جی۔“

”نزاکت سے کہیں، نسیم بانو کے لیے ڈاکٹر کی
ایڈوائس فالو کریں۔“ جب تک مسیبل کے دوسرے
ٹھکانے کا انتظام نہیں ہوتا ان کا زندہ رہنا ضروری
تھا۔

”جی بہتر۔“ وہ جانے کے بجائے وہیں رکا
رہا۔

عنایت جہاں نے سراٹھایا۔ صدیقی کے یوں
جب رکے رہنے کا مطلب تھا اسے کوئی ایسی بات
کہہ رہی ہے جو انھیں ناگوار لگ سکتی ہے۔
”ہوں؟“

صدیقی نے تھوک نکل کر گلا صاف کیا۔
”دت صاحب۔“ یہ ان کے سچین میجر کا نام
تھا۔

”نے ایک تجویز پیش کی ہے۔ وہ حلقے میں کسی
ٹرسٹ کے قمر و ایک مشاعرہ کروانا چاہتے ہیں۔“
مسلم اکثریتی آبادی والے علاقوں میں مشاعرے
منعقد کرنا بھی برسوں سے انتخابی مہم کا حصہ ہے۔
جہاں مہمان خصوصی کے طور پر نمائندہ مدعو ہوتا ہے۔
وہ مشاعرے میں کسی بڑی امداد کا اعلان کرنا یا اس کی
جانب سے بھجوں یا خواتین میں انعامات یا ان کے
مطلب کی اشیاء نسیم کی جانی ہیں۔ نام ٹرسٹ یا کسی
انجمن کا ہونا مگر سب جانتے ہیں کہ یہ رشوت کس کی
جانب سے اور کیوں دی جا رہی ہے۔

”وہ میاں آفاق جاہ اور نگہت حیا کو خاص طور
پر بلانا چاہتے ہیں اور۔“
”منع کر دیجیے۔“ انہوں نے بارت مکمل نہیں
ہونے دی۔

☆☆☆

چوں کہ دن کی شروعات ہی غیر معمولی تھی، لہذا
کوئی کام وقت پر نہیں ہوا۔ آج دوسروں کے ساتھ
جیرو کا کا کو بھی کھانا دیر سے ملا تھا۔ ظہر کے وقت اٹھنے
کے بعد تمیز الدین نے ناشتے کے لیے منع کر دیا تھا۔
چائے کے بعد انہوں نے سید حادو پہر کا کھانا کھایا۔

جب وہ دونوں باورچی خانہ سمیٹ کر باہر
آئیں تو نسیم بانو تمیز الدین کے ساتھ آم کے پڑ کے
نیچے بیٹھی تھیں۔ سبیل کی نگاہیں جائزہ لے چکی تھیں کہ
آدم کا کمرہ بند ہے۔ وہ یقیناً عقب میں تھا۔ نزاکت
کے بھی ادھر ہی موجود ہونے کا امکان تھا۔

”دادی!“ وہ اس وقت خاص مقصد سے ان
کے پاس آئی تھی۔

”کل آپ ٹیسٹ کے لیے رکیں کیوں نہیں؟“
اس کا سوال مکمل ہونے سے قبل ہی انہوں نے شاکی
نظروں سے تمیز الدین کو دیکھا۔

”میں نے نہیں بتایا آپا۔“ وہ انھیں کہہ کر اس
کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ کس نے بتایا پوچھتے اس
سے پہلے ہی اس نے تیزی سے کہنا شروع کیا۔

”وہ اہم نہیں۔ ابھی ضروری یہ ہے کہ ہم
ہاسپٹل جا کر جو ڈاکٹر نے کہا ہے وہ سب ٹیسٹ
کروائیں۔ آج کا دن تو چلا گیا۔ کل صبح ہی نکل
جائیں تو دن بھر میں سب ٹیسٹ ہو جائیں گے۔“
”یہ ڈاکٹروں کے پیسے کمانے کے دھندے
ہوتے ہیں۔“ نسیم بانو نے اس کی بات کو اہمیت نہیں
دی۔

”ہاں تو کون سے ہماری جیب سے جا رہے
ہیں، ہونے دیں بے چاروں کا بھلا۔ ہمارے لیے
اپنی سلی اور آپ کی صحت اہم ہے۔“
نسیم بانو نے بے بسی اور مدد طلب نظروں سے

تمیزالدین کو دیکھا۔
”ابا! آپ کل انھیں لے کر جائیں۔“ صفانے

کہا۔
”میں ٹھیک ہوں۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔“ نسیم بانو نے حتمی لہجے میں کہا کہ اپنی طرف سے بات ختم کر دی۔

”میں آنٹی کو فون کرتی ہوں پھر کہ یہاں کوئی ڈاکٹر کا مشورہ نہیں مان رہا ہے۔“ وہ تیاری سے آئی تھی لہذا فون بھی ہاتھ میں تھا۔

”آپ، میں ابھی آپ سے یہ ہی کہنے والا تھا کہ صدیقی کا فون تھا اس نے کہا ہے جو ڈاکٹر کہہ رہے ہیں وہ سب کیا جائے۔“

اب اس کے بعد کون بحث اور انکار کرتا۔ سبیل اپنی آنٹی کی اور ممنون ہو گئی۔

اسی وقت آدم عقب سے آتا دکھائی دیا۔
”آپ جیروکا کا سے پوچھ لیں، اگر کنگ نہیں کیا ونڈ میں کہیں ڈالنا ہے تو میں اور نزاکت وہاں پھینک آئیں گے۔“ قریب آ کے اس نے تمیزالدین کو مخاطب کیا۔

”سب صاف ہو گیا؟“ نسیم بانو نے پوچھا۔
”جی۔“ اس نے پی کیپ اتاری اور بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”آپ کو کل صبح دادی کو پھر ہسپتال لے جانا ہے۔“ سبیل نے مداخلت کی۔
”اوکے۔“ اس نے اچھی نظر اس پر ڈالی تھی۔

تمیزالدین، جیروکا کا کو فون لگا چکے تھے۔
”بہت محنت کی بیٹا، تم نے اتنی دھوپ میں۔“ دادی نے اسے سراہا۔ وہ بس مسکرا دیا۔

”جیروکہ رہا ہے لے آؤ۔“ تمیزالدین نے فون بند کرتے ہوئے کہا اور کھڑے ہو گئے۔
”آؤ۔“ وہ اسے لیے عقبی حصے کی طرف بڑھے اور صفانے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”کیا بات ہے۔ تم بڑے غور سے دیکھ رہی تھیں؟“

”کسے؟“ اس نے بلا سوچے سمجھے پوچھا۔

”میرے کو لیک کو۔“
”کچھ بھی!“ وہ کھڑی ہو گئی۔
”پڑھائی کرنی ہے چلو۔“ اس نے صفا کا ہاتھ

کھینچا۔
”ادھر ادھر کی بکواس کر کے اس سے بچ نہیں سکتیں تم۔“ اس نے ڈانٹا۔
”ادھر ادھر کی بکواس؟ جو دیکھا وہ پوچھ رہی

ہوں۔“
”دیکھیں دادی، اسے یہ بالکل پڑھنے کو تیار نہیں ہوتی۔“ اس نے دادی سے شکایت لگائی۔
”کچھ ہی دن باقی ہے بیٹا، پڑھا کرو۔“ دادی

نے فرض نبھایا۔
”میں پڑھتی ہوں، دادی لیکن سبیل کو لگتا ہے۔“
یہ اس کی دھڑکی رگ بھی اور وہ ذرا دیر پہلے والا مشاہدہ بھول گئی۔

☆☆☆

دفتر نہ جانے کی صورت میں میر عثمان کا فون متعدد بار بج چکا تھا۔ اب بھی ان کی فون پر جاری گفتگو لمبی ہو گئی تھی۔ عدن ہر شے کا بغور اور باریک بینی سے جائزہ لیتیں، خواب گاہ میں داخل ہوئیں اور ہر چھوٹی بڑی تفصیل نگاہوں سے سرائتے ہوئے جانے کب وہ اس آرام دہ بستر پر لیٹیں اور سکون بھری ٹھنڈک اور خاموشی میں ان کی آنکھ لگ گئی۔

جانے کتنی دیر بعد آنکھ کھلی۔ اب بھی ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ وہ یونہی سرد فرش پر بیٹا چلوں کے چلتی باہر نکلیں۔ میر عثمان فریج ونڈ کے پاس کرسی پر کتاب لیے بیٹھے تھے۔ جھکتے، چمکتے سرد فرش پر ان کے گلابی پیر بنا آواز کیے آگے بڑھے۔ ساتھ میں ان کی سرخ میکیسی بھی فرش سے ہم آغوش ہو رہی تھی۔

”ہماری بے وقت نیند اب ہمیں ایمرس کرنے لگی ہے۔“ قریب پہنچ کر عدن نے شرمندہ سی دھیمی آواز میں کہا اور میر عثمان جو غرق مطالعہ تھے، چونک گئے۔

”آپ ہارڈلی پندرہ منٹ سوئی ہیں۔“ انہوں نے کتاب بند کر کے، کلائی موڑ کے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہم نے یہ بورنگ کتاب اس امید پر لی تھی کہ کچھ دیر میں ادھر آپ کو پہنچا دے سکیں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دائیں جانب چھوٹی سی میز پر رکھی۔ عدن ان سے دور رکھی، اونٹن چیر پر بیٹھ گئیں۔

”ویسے ہم نے کئی بار کوشش کی کہ کام کے دوران پاور نیپ کی عادت اپنائیں مگر نیند اور ہماری بھی نہیں بنی۔“ بات کے آخر میں عدن کو یہ لگا جیسے وہ یہ جملہ شروع کر کے پچھتائے ہوئے عدن مسکرائیں۔

”اب تو ہمیں اس کی عادت نہیں رہی ورنہ اسٹڈیز کے وقت اسپشلی پیپرز کے دوران ہم دس پندرہ منٹ کا الارم لگا کر سوتے تھے اور واقعی جاگنے کے بعد فریش بھی نہیں کرتے تھے۔ انسٹیٹیوٹ میں ہماری پاور نیپ کافی مشہور تھی۔“ عدن آخر میں ہنسی نکالتیں۔

میر عثمان نے مسکراتے پر اکتفا کیا۔ ان کی نظر عدن کے پیروں پر پڑی۔

”آپ کے سپررز کہاں ہیں؟ آپ کا کولڈ ٹورنس بہت کم ہے۔“ فرش سچ میں کچھ زیادہ ہی سرد تھا پھر بھی عدن کو لگا وہ موضوع بدل گئے ہیں۔

”ہمیں اچھا لگ رہا ہے۔“ انہوں نے ہیر پیچھے کھینچ کر میکسی کے سفید پھولوں کے اندر چھپا لیے۔

”آپ اجازت دیں تو ہم کچھ کہیں۔“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات چھیڑتے، عدن نے التجا کی۔

عدن کے چہرے کو دیکھ کر، میر عثمان کا دل کیا اجازت سے انکار کر دیں کہ وہ اس وقت جذباتی اور گہری بات نہیں چاہتے تھے جو ان کے عیاں ہونے کا سبب بنی۔ اس دن کے عدن کے ابتدائی چند جملوں

نے انہیں خوف زدہ کر دیا تھا کہ وہ ان کے اندر جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مگر لاکھ کوشش کے بعد بھی وہ سامنے بیٹھی بیوی کو انکار نہیں کر سکے۔

”ہوں۔“ ان کا ہنکارا بھی سوچ سے بھرا وزنی محسوس ہوا۔

”ہو سکتا ہے ہم غلط ہوں، بالکل غلط۔“ انہوں نے ہمت تو کر لی تھی مگر اگلے پل یقین ڈولنے لگا تھا کہ انہوں نے ہمت کو مضبوطی سے تھاما۔

”ہمیں لگتا ہے، آپ خود کو خوش ہونے سے روکتے ہیں، آپ کو لگتا ہے، آپ اچھا وقت ڈیزر نہیں کرتے۔ آپ خوش ہو لیں یا کچھ انجوائے کر لیں تو بعد میں گلٹی فیل کرتے ہیں۔“ وہ جس قدر تذبذب کے ساتھ کہہ رہی تھیں میر عثمان اسی قدر حیران ہو رہے تھے۔

”ہم معذرت خواہ ہیں اگر ہم نے آپ کو یوں فیل کروایا۔“ میر عثمان کی آواز اندر کی بے چینی چھپانے میں کامیاب رہی تھی۔

کچھ دیر رک کے انہوں نے عدن کی آنکھوں میں دیکھا۔ ان کے سینے میں راز دفن تھی، مگر وہ بزدل نہیں تھے۔ وہ سب کچھ عدن سے کہہ سکتے تھے اگر ان کے مقابل محض عدن ہوتیں یا یہ جنگ سیدی عدن سے ہوتی۔ عدن اپنی مرضی سے ان کے خلاف استعمال ہو رہی تھیں یا بے خبری میں دشمن کا ہتھیار بنی تھیں، وہ یہ معتمد حل نہیں کر پا رہے تھے تاہم بھی مضبوط لگنے والا شک اب کمزور تھا۔ عدن کے ساتھ منافقت ان کی مجبوری اور ضرورت تھی، وہ اس منافقت سے خوش نہیں تھے۔

”ہمارے گلٹ کی وجہ آپ بالکل نہیں ہیں۔“ اس ایک جملے میں کئی اعتراف تھے۔ اتنے برسوں میں انہوں نے اپنے لیے پہلا درجہ ذرا سا دیا تھا۔ ایک لہر ٹھن کی اس درز سے باہر نکل گئی۔

”ہم اتنے سال ابا سے دور رہنے اور ایکسڈنٹ کے وقت ان کے تہا ہونے کو کیسے بھول سکتے ہیں؟ یہ وہ گلٹ ہے جو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے

کا۔ یہ مکمل سچ نہیں تھا تو غلط بھی نہیں تھا۔
 ”عدن!“ انہوں نے پھر کچھ دیر رک کے
 بات شروع کی۔

”آپ خوش نہیں ہیں؟ آپ کو ہم سے کچھ اور
 بھی شکایت ہے؟ اس ایجنسی کو ہائر کرنے کے پیچھے
 کوئی اور بھی وجہ تھی؟“

”نہیں۔“ خلاف امید عدن نے مسکرا کے سر
 نفی میں ہلایا۔ اس وقت میر عثمان عدن کا رویہ بالکل
 سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

”ہم برسوں سے سنبھالا ایک راز آپ سے
 شیئر کرنا چاہتے ہیں۔“

میر عثمان کے لیے یہ پہلی جان لیوا تھی۔ چند
 سیکنڈ میں انہوں نے نہ جانے کیا کیا سوچ لیا۔
 عدن کی نظریں گود میں دھرے اپنے ہاتھوں پر
 تھیں۔

”ہمارے جوائنٹ فیملی فرینڈ کی شادی کی
 تقاریب کا ایک دن تھا اور آپ اس وقت میر انکل
 کے ساتھ گیٹ سے اندر آ رہے تھے۔“ عدن نے سر
 اونچا کر کے میر عثمان کو دیکھ کر کہنا شروع کیا۔

”اس سے پہلے بھی ہم نے آپ کو کئی بار دیکھا
 تھا مگر اس وقت آپ ہمیں پہلی بار اچھے لگے تھے،
 بہت اچھے، ہم اپنی قبیلنگو پر فریز ہو گئے تھے۔ اس
 وقت ہم نہیں جانتے تھے اس منظر کے بعد ہم پر محبت
 کے سبب ہی منظروں کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔
 ہم اس منظر میں ایسے میر عثمان علی خان کے اسیر
 ہوئے تھے کہ پھر ہمیں دنیا میں کوئی اور متاثر نہیں کر
 سکا۔“ میر عثمان کو حیرت کا ایسا جھٹکا زندگی میں دوسری
 بار لگا تھا۔

”آپ کو شاید ہماری باتوں کا یقین نہ آئے
 لیکن یہ ہماری زندگی کا سچ ہے کہ آپ اس دن سے
 ہماری زندگی میں ہیں، جس دن اس تقریب میں
 آپ ہماری طرف مسکرا کے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ
 گئے تھے۔“

یہ کیوں کر ممکن تھا؟ میر عثمان اپنی بے خبری اور

اس خبر پر جتنا حیران ہوتے، کم تھا۔
 ان کی ملاقاتوں کا شمار ممکن نہیں تھا کہ لندن
 سے واپس آنے کے بعد بھی وہ اتنی دفعہ عدن سے
 ملے تھے۔ ان کے کئی فیشن شو کے مہمان رہے تھے مگر
 کبھی انھیں لگا ہی نہیں کہ عدن انھیں اس طرح پسند
 کرتی ہیں۔

انہوں نے تو اس دن سے پہلے کبھی عدن کو
 خوب صورت عورت سمجھ کر غور ہی نہیں کیا تھا جس
 دن بیگم عنایت جہاں نے ان کا نام لیا تھا۔ اس سے
 قبل وہ ان کے لیے دنیا کی دیگر خواتین میں سے ایک
 تھیں جن میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ان کے
 لیے کام اور سماجی، کاروباری ذمہ داریوں کا حصہ
 تھیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں اور اب وہ کہہ رہی
 تھیں کہ وہ برسوں سے ان کی محبت میں مبتلا تھیں، ان
 کی ملاقاتیں ان کے لیے ویسی عام نہیں تھیں جیسی ان
 کے لیے۔

”اس وقت ہماری اتج ہی ایسی تھی کہ سارا
 وقت ہمارے دل و دماغ پر آپ سوار رہتے۔ ہم نے
 نیا نیا کالج شروع کیا تھا، وہاں آپ ہمارے سینئر
 تھے۔ آپ تب ہمارے لیے کسی ہیرو یا سنگر کے کرش
 جیسے تھے جن کے بارے میں ہمیں علم ہوتا ہے کہ
 انھیں حاصل کرنا ناممکن ہے لیکن ہم پھر بھی ان کے
 پیچھے پاگل ہوتے ہیں۔ ہم کل کے آپ کے سامنے
 آنے سے جھجکتے تھے لیکن آپ کو ہی دیکھتے رہنا
 چاہتے تھے۔ کالج ہوتا یا گھر یا کوئی ایونٹ، ہم ہر اس
 جگہ موجود ہوتے جہاں آپ کی موجودگی کا امکان
 ہوتا۔ اس عمر، اس دور اور نئی نئی محبت کی بے خودی میں
 جینا ہمیں بڑا اچھا لگ رہا تھا۔“

آپ کو دیکھ لیتا، آپ کی آواز سن لیتا، کبھی
 نظریں مل جاتا، کبھی آپ کا مخاطب کر لیتا، کبھی آپ کا
 مسکرا کے دیکھ لیتا، کبھی بات ہو جاتا، کبھی آپ کی
 زبان سے ہمارا نام ادا ہوتا۔

یہ ہی ہمارے دن کے ہائی لائٹس ہوتے تھے۔
 ہمیں اس وقت اپنے جذباتوں کی گہرائی کا احساس ہوا

جب آپ ابراہ چلے گئے۔ ہم می کے ساتھ آپ کے گھر آتے اور وہاں آپ کی ایک جھلک بھی نہیں ملتی، ہم بھائیوں کے ساتھ ان کی گھرنگ میں ہوتے اور ہمیں اس جگہ کی بے روتی اداس کرتی کہ وہاں نہ آپ کی آواز ہوتی نہ ہنسی۔ ہم اپنے سرکل کی ہر شادی، ہر فٹکشن اینڈ کرتے۔

مگر ان میں پہلے جیسا انتظار تھا نہ لطف کہ آپ آئیں گے یا نہیں اور آگئے تو ہم سے شاید ایک آدھ جملہ کہہ ہی دیں گے یا ہماری میز پر کسی انگل آنٹی کو سلام کرنے پچھیں گے، ہمیں کسی کا پاس کیا کولڈ ڈرنک کا گلاس تھمیں گے، ہم سے کچھ لے کر ایک فارل کہا تھیںک یو۔ بھی بے اختیاری سوری۔ تب ہم نے جانا کہ ہماری زندگی کا سارا مقصد ہی یہ ہو گیا تھا۔ ہم تو ان ہی چھوٹی چھوٹی ملاقاتوں، غیر متوقع باتوں، آپ کے دیدار کے لیے جی رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔

”اس کے فوراً بعد ہم اسٹڈیز کے لیے انسٹیٹیوٹ چلے گئے، وہاں آپ کو یاد کرتے رہے۔“
”آپ نے ہمیں بھی بتایا کیوں نہیں؟“ میر عثمان نے درمیان میں پوچھا۔ انہیں اپنی آواز پر یقین نہیں آیا کہ وہ اس قدر حیرانی کے باوجود بول رہے تھے۔

”ہم نے بڑی مشکلوں سے آپ کا انٹرمیڈیٹل نمبر حاصل کیا اور آپ کو ایک ہائے لکھ بھیجا، مہینوں برسوں آپ کے جوابی ہائے یا کون؟ کا انتظار کرتے رہے۔ آپ کا ای میل ہمیں نہیں مل پایا۔ ان دنوں دنیا نیافیس بک ہم نے سیکھا، آپ کو ڈھونڈا مگر آپ نہیں ملے۔ ہم انسٹیٹیوٹ میں بہت بڑی مگر آپ کے انتظار کے عادی ہو گئے تھے۔ آپ واپس آئے تو ایک ٹریجڈی کے بعد۔“

وہ، میر قربان علی خان کے حادثے کے بعد ملک واپس آئے تھے۔

”آپ پہلے والے میر عثمان نہیں رہے تھے، بدل گئے تھے اب کافی میچور اور ریزروڈ تھے۔ اکل

کے بعد آپ نے جہاں نما سنبھالا اور ہم بھی فیملی کے شیڈ سے نکل کر تب اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ آپ کی می کے بعد ہماری فیملی کے ٹرمز بھی پہلے سے نہیں تھے۔ اس وقت ہم ہی نہیں سوچتے تھے بلکہ افواہیں بھی یہ ہی تھیں کہ شاید آپ نے اتنے سالوں میں وہاں شادی کر لی ہے، شادی کے بعد طلاق بھی ہو گئی ہے، کوئی کہتا لیوان ریلیکشن تو کوئی کچھ۔ کچھ وقت بعد افواہیں دم توڑ گئیں اور ہم۔“

انہوں نے گہرا سانس لے کر اوپر دیکھا اور پھر کھڑی ہو گئیں۔

”ہم دور دور سے آپ کو دیکھتے رہے، قیاس کرتے رہیں، ڈرتے رہے۔ ہم نے اتنا وقت اکیلے آپ سے محبت کرتے گزار دیا تھا کہ اب اس احساس کو ختم کرنے یا بدلنے کا خیال بھی جان لیوا محسوس ہوتا تھا۔ آپ اب وہ میر عثمان نہیں تھے جن سے ہم بے تکلفی سے بات کرتے یا دل کی بات سناتے۔ آپ نے جو اپنے گرد ہالہ بنایا تھا وہ اُن بچ ایل، اُن ریمیل، ناقابل حصول تھا۔ ہم نے اتنی ہمت کی کہ آپ کو مذعو کیا اور آپ آگئے، ہمارے لیے وہ ہی معجزہ تھا۔ ہم اب اس اسچ پر تھے کہ انکار سننے اور رد ہونے کے بجائے ایک امکان، ایک شاید باقی رکھنا چاہتے تھے۔ ہم ہر روز دل تھام کے نیوز پیپر اور سوشل میڈیا اوپن کرتے کہ کہیں آج آپ کی شادی کی خبر نہ ہو اور ہم پہلے ہی سوچ لیتے کہ یہ اس وجہ سے ہوگا کہ ہم نے آپ سے اظہار کیا ہی نہیں ورنہ تو آپ ہمارے ہی تھے۔“ وہ ہلکے سے مسکرائیں۔

میر عثمان اپنی زندگی کی سب سے غیر متوقع اور ناقابل یقین سی حقیقت سے روشناس ہو رہے تھے۔ کوئی آپ کے لیے اتنے نفیس اور حسین جذبات چھپائے ایک عمر گزار دے تو یہ انکشاف حیران کن ہی نہیں، دل کی دنیا بدل دینے والا ہوتا ہے۔ میر عثمان اس وقت، سب بھول کے عدن کی ہر بات پر یقین کرنا چاہتے تھے۔

”پھر جانے کیسے نواب بیگم نے ہمارے دل تک رسائی حاصل کر لی۔ آپ اتنی ملاقاتوں کے بعد نہ ہمارا چہرہ پڑھ سکے نہ آنکھیں مگر وہ جان لیں۔ مگر والوں کا شادی کے لیے اصرار اپنی جگہ مگر شاید ایک عمر کے بعد ہمیں جذبات اور احساسات کے ساتھ آپ کی رفاقت کی خواہش بھی ستانے لگی تھی۔ ہمارا صابر عشق چھلنے لگا تھا۔ ہم رو کیے جانے کے خوف سے شاید چپ ہی رہتے مگر نواب بیگم کا سپورٹ ہمیں ڈیوائن اشارہ لگا کہ اب بھی آگے نہ بڑھے تو خود کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ آپ کے حصول کا راستہ ہماری کوشش کے بنا ہی ہمارے قدموں میں بچھا دیا گیا تھا۔ ہم اس پر قدم نہ دھرتے تو ناشکرے ٹھہرتے! آپ سوچیں، اتنے برسوں کی خاموش محبت کے بعد ہم آپ کو جی بھر کے دیکھنے، ہاتھ بڑھا کے چھونے، آگے بڑھ کے خود کو آپ کے سپرد کرنے کی اجازت اور استحقاق چاہتے تھے تو یہ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔“ ان کی آواز بجھنے لگی۔

”اور جب ہم نے یہ سب حاصل کر لیا تو کھلا کہ آپ سے ہم فزیکلی قریب ہوئے ہیں ورنہ فاصلہ تو اب بھی اول دن جتنا ہی ہے۔“ انہوں نے ایک قدم میر عثمان کی طرف اٹھایا جواب تک کرسی پر تھے۔

”اسی کھوج میں ہم سے وہ غلطی ہو گئی۔ ہمیں احساس ہے ہم نے آپ کو بہت ہرٹ کیا ہے لیکن عثمان! ہم اتنے غلط تو نہیں۔ ہم ساتھ اور پاس ہوتے ہوئے بھی تشنہ کیوں ہیں؟ صرف ہم نہیں آپ بھی۔ آپ بتائیں، ہم کیا کریں کہ نیند آپ کی سسکی بن جائے، آپ کی آنکھوں سے اداسی روٹھ جائے، سکریت آپ کی دھن بن جائے اور۔“ ان کے حلق میں جمع ہوئے آنسوؤں نے آواز سلب کر لی۔

ان کے سامنے ان کی حسین اور قابل بیوی تھی، جس نے اپنا دل ان کے آگے کھول کے رکھ دیا تھا۔ وہ عورت جس پر اعتبار نہ ہونے کے باوجود وہ انہیں

کبھی پری نہیں لگی تھی۔ اپنی الجھنوں اور تحفظات کے باوجود انہیں جس کی قربت میں سکون ملتا تھا کہ ان کا تنہائی کے بیاباں کا سفر بھی عدن اتنا ہی طویل تھا۔ اگر عدن اس کے بعد تنہا رہنے تیار نہیں تھیں تو وہ بھی تو خود ساختہ بن پاس کاٹ رہے تھے۔ اپنا محبت اور ساتھ کو ترستا دل نظر انداز کر رہے تھے۔

کئی بار کسی حسین نازک لمحے میں، قربت کے سکون میں ان کا دل چاہا تھا کہ وہ عدن سے اپنی تلاش، طویل جستجو، ملال، دکھ سب بانٹ لیں۔ سواگر وہ اس پل پوری طرح پھل کے عدن کے سحر میں جکڑ گئے تھے تو یہ ایسا حیرت انگیز بھی نہ تھا!

میر عثمان اپنی جگہ سے اٹھے۔ ان چند قدموں کو طے کرتے ہوئے انہوں نے اتنا کچھ سوچ لیا تھا اور اس کے بعد بھی کتنا کچھ باقی تھا۔ اتنے خیالات کے ساتھ بھی ان کے اندر اس وقت عدن کو تمام لینے کی خواہش بڑی شدید تھی۔ گہرائی میں کہیں وہ جانتے بھی تھے کہ وہ صرف عدن کو نہیں عرصے بعد خود کو بھی تمام رہے ہیں۔ عدن کو اپنے اندر سمیٹتے ہوئے، سب کچھ پیچھے دھکیل کر انہوں نے ان لمحوں میں، ان لمحوں پر یقین کو چنا تھا۔ اس لمحے ان کا دل اور دماغ، فکر، شک اور احتیاط سے خالی تھے۔

میر عثمان کی بانہوں میں ساتے ہی وہ تیزی سے رونے لگیں۔ یہ ان کی برسوں کی مسافت کے بعد پہلی حقیقی چھاؤں اور آرام گاہ تھی۔ میر عثمان بھی اس وقت سب بھول جانا چاہتے تھے۔ انہیں ان لمحوں کی دل سے قدر تھی۔ وہ اگر مگر سے اسے کہنا نہیں چاہتے تھے۔

”عدن!“ میر عثمان نے کچھ دیر بعد انہیں خود سے دور کیا۔ اپنے ہاتھوں سے عدن کے بال پیچھے کرتے ہوئے چہرہ تمام کے ان کی پیشانی سے اپنا سر لگایا۔

”ہمیں آپ کے ہر لفظ کا یقین ہے۔ آپ کی شکایت۔ اگر ہم۔ اگر ہم اس وقت کچھ نہ کہیں۔ اگر ہم ابھی۔“

ان کی ٹھہری، تھکی سی سرگوشی جیسی آواز میں کوئی بات مکمل نہیں ہو پاری تھی۔ وہ ایک ساتھ کئی باتیں کہنے کی کوشش میں کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ تقریباً دہائیوں پر محیط محبت کی کہانی سننا جس کا مرکزی کردار آپ ہو اور بے خبر بھی آپ ہو۔ یہ بحر بہ میر عثمان علی خان جیسے شخص کا بھی احتیاطی اور ظاہری خول چٹا گیا تھا۔ وہ جذبات سے اس قدر مغلوب تھے تو وہ تو پھر عدل نہیں۔

”کچھ نہ کہیں عثمان۔“ انہوں نے بھیگی آواز میں انھیں اجازت دے کر مزید بولنے سے روک دیا۔

”آج ہمارا وقت تھا۔ آپ کا نہیں۔“ انہوں نے اپنے دل کی بات کی تھی، کسی دن میر عثمان اپنے دل کی کہیں گے، انہوں نے خود کو یقین دلایا تھا۔ ”تھینک یو۔“ میر عثمان نے اپنا سر دوڑ کیا۔ ”ایک وقت میں ایک قدم!“ عدل نے سوچا۔ وہ اس وقت میر عثمان کی قربت میں واقعی بھول گئی تھیں کہ سارا راج کہنے کے بعد بھی اپنے دور رہنے کی سب سے اہم وجہ وہ پھر چھپا گئی ہیں۔

☆☆☆

شام تک صدیقی کے پاس بری خبر تھی۔ ”میگزین“ ٹیکسٹس تو موجود ہے لیکن وہاں اس نام کا کوئی جرنلسٹ یا ملازم نہیں ہے۔ ”ہو سکتا ہے پہلے ہو اور۔“

”فرسٹ ایڈیٹور سے لے کر اب تک وہاں کسی پراگ پور نے کام نہیں کیا ہے۔“ یہ انھیں ’اوک ہاؤس‘ کی بابت ای میل بھیجنے والے صحافی کا نام تھا۔ ”کوئی ’اوک ہاؤس‘ کو لے کر مٹھوک ہے مگر ایڈریس نہیں جانتا؟“ عنایت جہاں کا انداز خود کلامی سا تھا۔

”اگر کوئی ایڈریس پتا کرنا چاہے تو مشکل نہیں ہے، نیوز پیپر آرکائیوز میں آسانی سے مل سکتا ہے۔“ صدیقی نے کہا۔

”پھر اس ای میل کا مقصد؟“ صدیقی کے

پاس فوری جواب نہیں تھا۔ اچانک وہ ٹھٹک گئیں۔ ”کوئی ہمیں آگاہ کرنا چاہتا ہے، دھمکانا چاہتا ہے کہ وہ ’اوک ہاؤس‘ کا راز جانتا ہے، مگر کون؟“ ان کے اور صدیقی کے علاوہ جو جانتے تھے، وہ ’اوک ہاؤس‘ میں تھے اور ان کے علاوہ سبیل کے وجود کا جنھیں علم تھا وہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یا کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے تھے۔

”کیا کوئی ہمیں فالو کر رہا ہے؟“

”نہیں۔ ہم نے پچھلے تین ماہ سے سکیورٹی ڈبل کر دی ہے۔ جب کہ ای میل اسی دوران کا ہے۔“

”ای میل کہاں سے بھیجا گیا ہے۔ دیکھیں۔“ عنایت جہاں نے نیا حکم دیا۔

”جی۔ مجھے لگتا ہے کوئی مانیٹیشن سے پہلے ایڈیٹورسٹ کرنا چاہتا تھا لیکن ہم نے بیٹ قبول نہیں کی، وہ ناکام ہو کر خاموش ہو گیا۔“

”کیسا ایڈیٹور؟ ایڈیٹور اسی وقت بنے گا جب وہ ’اوک ہاؤس‘ میں بسنے والوں سے واقف ہو، محض ’اوک ہاؤس‘ کیا ایڈیٹور بن سکتا ہے؟“ عنایت جہاں کی بات کے بعد پھر صدیقی کے پاس جواب نہیں تھا۔

”اور اگر اس کی اہمیت سے واقف کوئی موجود ہے تو۔ آپ پہلے میل کا آئی پی ایڈریس نکالیں۔“ ان کا ذہن کسی راستے پر لگ چکا تھا۔

”جی مگر وہ ضرور کسی عام سے سائبر کیفے سے بھیجا گیا ہوگا، اس سے ہمیں کچھ خاص علم نہیں ہو سکے گا۔“ عنایت جہاں پر سوچ سی چپ تھیں۔

”شادی اور ابراؤ سیشنل کرنے والے معاملے کو ہنگامی سچویشن کی طرح دیکھیں۔“

اسی وقت صدیقی کا فون بجنے لگا۔ اسکرین پر نام دیکھ کر اس نے عنایت جہاں کو دیکھا۔

”تمیز الدین۔“ انہوں نے ہاتھ سے فون سننے کا اشارہ کیا۔

”ہیلو۔“ لہجہ یک لخت روکھا ہو گیا تھا جس بھی خود تمیز الدین کے اختیار میں ہوتا تو وہ بھی خود

صدیقی کو فون نہ کرتے مگر یہ ممکن بھی نہیں تھا۔ نسیم بانو کی بیماری اور ان کی باتوں نے مجبور کر دیا تھا۔
محض ہوں ہاں کرتے ہوئے چند منٹ بعد صدیقی نے فون رکھ دیا۔

”وہ آپ سے بات کرنے کی گزارش کر رہا ہے۔“ عنایت جہاں نے ابرو کے اشارے سے کیوں پوچھا۔

”اپنی بیٹی کی شادی وغیرہ کے سلسلے میں، اس کی عمر ہے شادی کی اور فاضل ایگزامز کے بعد پڑھائی بھی ہو جائے گی وغیرہ۔“

عنایت جہاں نے پرسوج انداز میں ہاتھ سے قلم میز پر رکھا اور پیچھے کرسی سے ٹیک لگایا۔
”ان سب کا اب ایک ہی حل ہے۔ اوک ہاؤس بند کر دیا جائے۔“

☆☆☆

شام میں ہی طے ہو گیا تھا کہ وہ صبح سات بجے گھر سے نکل جائیں گے۔ سبیل موقع ملتے ہی آدم کو اپنا فون نمبر دے چکی تھی کہ دادی منع کریں تو وہ وہیں سے اسے اطلاع دے دیں۔

اس رات اچانک افتاد پر، اسے اپنی جیب نکالنا پڑی تھی تاہم وہ ایسی بے فکری سے اسے سڑکوں پر دوڑاتا تو نزاکت، صدیقی مشکوک ہو جاتے کہ جیب اس کے نام رجسٹرڈ تھی اور پولیس اس کی تلاش میں۔ انہوں نے یہی بات صدیقی سے فون پر کہی اور کچھ دیر بعد ہی وہ تمیز الدین کی اسکوٹر پہ نزاکت کے ساتھ دوسری گاڑی لینے جا رہا تھا۔

چند گھنٹے بعد نزاکت اسکوٹر اور وہ کار لیے واپس آئے۔ جیب کے ساتھ دوسری سفید کار دیکھ کر دونوں نے تمیز الدین سے سوال کیا کہ جیب ہے تو کار کیوں؟

”آپا کے لیے کار زیادہ آرام دہ ہے۔“ اور وہ مان بھی گئیں۔

نزاکت اور تمیز الدین ان کے ساتھ گئے۔ سبیل نے اس بار بھی اصرار کیا لیکن نسیم بانو مانیں نہ

تمیز الدین۔

”تم پڑھائی کرو گھر میں۔ وقت کم ہے۔“
”جیرو کو کھانا دینا ہوگا اور رات کا بھی سب کا بنا کے رکھنا۔“

دونوں نے انہیں اپنی طرف سے کام سونپ دیے تھے۔

”اچھا آپ تھوڑی تھوڑی دیر میں فون کیجیے گا۔“ اس نے بھی وعدہ لیتا چاہا مگر اسے ”ٹھیک ہے“ پر رخصت کر دیا گیا۔

سبیل، صفا کو آج بھانسنے کا موقع دیے بغیر پڑھائی کے لیے لے کر بیٹھی تھی۔ درمیان میں اس کی کوشش جاری تھی کہ کسی بہانے اٹھ سکے۔

”آج کھانے پر اہتمام کرتے ہیں۔ وہ ہسپتال کینٹین یا پھر باہر کا بد مزہ کھانا کھا کر آپیں گے، اس لیے ہم کچھ اچھا سا کاتے ہیں جیسے بریانی یا پھر دو تین چیزیں۔“ صفا نے مشورہ پیش کیا۔

”ابھی جو پتیلا بھر کے چکن شوربہ بنایا اس کا کیا؟“ سبیل نے مشورہ رد کیا۔

”دادی کے روم کی چکا چک صفا کی کر کے انہیں سر برازدیں؟“ کچھ دیر بعد صفا کو پھر یاد آیا۔
”بلکہ ہم مال کی سیٹنگ بھی بدل دیتے ہیں، خوش ہو جائیں گے سب تبدیلی دیکھ کے۔“ اسے بس کتاب سے دوڑ جانا تھا۔

”جب میں کہوں گی کہ صفا نے ایک جیٹر مکمل کر لیا ہے تو اس تبدیلی پر ان کی خوشی آسمان چھونے لگے گی۔“ سبیل نے سامنے کھلی کتاب پر اس کا ہاتھ رکھا۔

اگر صفا بار بار بہانے بنا رہی تھی تو اس کی نگاہ بھی اتنی ہی دفعہ فون کی جانب اٹھ رہی تھی۔

آدم اپنا کام کر رہا تھا کہ یہاں اس کی موجودگی کی بنیاد ہی ڈرائیور کی ضرورت تھی۔ تاہم سبیل نے آج اسے اضافی کام سونپا تھا۔ بار بار یہ خیال ستارہا تھا کہ اس نے کسی کو ذمہ داری دی ہے اور اب اس کا فرض ہے کہ ذمہ داری اور کام کرنے والے کو وہ

سرا ہے، کوئی انعام دے۔ حالاں کہ اس نے اب تک نہ کال کی تھی نہ کوئی پیغام بھیجا تھا۔

ذرا دیر بعد اس نے صفا سے نظر ہٹا کے دوسری کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے، خود کو مصروف ظاہر کرنے کے بعد بولنا شروع کیا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ تم پر دھوا، اسپیشل کھانا میں بناتی ہوں۔“

صفا نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”تمہیں بیسک چائے اور روٹی بنانی نہیں آتی اور تمہیں اسپیشل کھانا بنانا ہے؟“ وہ صفا ہی کیا جو چوک جائے!

”یہ وہ موقع ہے کہ میں دل سے کچھ کرنا چاہتی ہوں اور اس دل سے کچھ کی وجہ سے کام یاب ہونے کے چانسز زیادہ ہیں۔“ اس نے ہاتھ روک کے سنجیدگی سے صفا کو دیکھا پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

”اب مالکن اور اس کے دل کے بیچ آنے والی میں کون؟“ صفا نے گویا احسان کیا۔

”تم بتاتی جاؤ، میں ہدایت فالو کروں گی لیکن۔“ وہ جوش میں بولتے ہوئے رک گئی اور تنبیہ ضروری تھی۔

”تم ساتھ ساتھ پڑھتی رہو گی۔ یعنی ہم دونوں ایک دوسرے کی انسٹرکشنز فالو کریں گے، دیکھتے ہیں کون کام یاب ہوتا ہے۔“ صفا اس شرط پر چند ہل اسے کھوڑی رہی۔

”چلو۔“ آخر صفا صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی کہ چائیک یاد آیا۔

”لیکن سالن کا کیا کریں گے؟“

”کل اس میں آلو ڈال کے سب کو ابھی بنایا کہہ کے کھلائیں گے۔“ سبیل پر اب ’اہتمام‘ کا بھوت سوار تھا لہذا اس کا بھی جگاڑ سوچ لیا۔

”تو تمہیں بریانی بنانی ہے؟“ صفا بولتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھی۔

”ہاں۔“ سبیل نے اس کا بازو پکڑ کے روکا اور

کتاب تھماتے ہوئے آنکھوں سے بتایا کہ تمہیں یہ پڑھنا ہے۔

”ویسے جگاڑ کر کے شور بے کو بھی بریانی میں شامل کر سکتے ہیں۔“

”نہیں، مجھے سلیقے طریقے سے بریانی بنانی ہے۔“ پہلی بار اس کے اندر یہ خیال اور احساس جاگا تھا اور اسی کے مطابق جوش جواں تھا۔

پھر دو لوگ اپنے پسندیدہ کام کے لیے دوسرے کو ہدایت دیتے ہوئے، ناپسندیدہ کام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس دوران تمیز الدین نے فون کر کے بتایا کہ ڈاکٹر کے بتائے سارے ٹیسٹ ہو رہے ہیں جن کے نتائج بھی آج ہی معلوم ہو جائیں گے۔ اللہ اللہ کر کے بریانی دم پر رکھی گئی اور سلا دہانے کا انتظام شروع ہوا۔

رات نو بجے کے آس پاس وہ سب ’اوک ہاؤس‘ پہنچ گئے۔ تمیز الدین نے اسپتال سے نکلنے وقت انہیں فون کیا تھا۔

”فکر والی کوئی بات نہیں۔ دوائیاں دی ہیں ڈاکٹر نے۔“ اس کے سوال پر تمیز الدین نے اسے تسلی دی تھی۔ نسیم بانو کا جواب بھی ایسا ہی تھا۔ وہ ان کی فائلیں دیکھنے لگی تھی کہ انہوں نے اس کے ہاتھ سے لے لیں۔

”کھانا لگاؤ۔ سب تھک گئے ہیں۔“

بقول صفا، بریانی کی رونمائی سب کے میز پر آنے کے بعد ہی ہونا تھی۔ کہ پہلے سے ڈھکن ہٹا کے ایک تو خوشبو بھارتی ہو جائے گی جس کی موجودگی ہی ابھی تو مشکوک تھی دوسرے ٹھنڈی ہو جائے گی۔

سارے جھکے ہارے منہ ہاتھ دھو کر میز پر بیٹھے اور صفا نے بریانی کا ڈھکن کھولا۔

”خوشبو تو بڑی اچھی آرہی ہے۔“ تمیز الدین نے کہا اور سبیل کی باپچیں کھل گئیں۔ صفا نے کہنی مار کے اسے متوجہ کر کے پیلے کے اندر دیکھنے کا اشارہ کیا جہاں چادر راز و نیاز کرتے ایک دوسرے سے لپٹے

جیسے جارہے تھے۔ اس کا منہ اتر گیا۔ سب ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

”اب دے بھی دو، سب کو بھوک لگی ہے۔ ذائقہ اچھا ہو تو صورت بگڑ بھی جائے تو چلتا ہے۔“ نسیم بانو نے ماجرا سمجھتے ہوئے تسلی دی۔

”آج ناسبیل کو شوق چڑھا تھا بریانی بنانے کا۔ کبھی کچھڑی نہیں بنائی اور اب بریانی کی شکل کچھڑی کر دی ہے۔“ یہ صفا کی اسے آئندہ کے لیے ایسے اہتماموں سے باز رکھنے کی کوشش تھی۔

”کوئی بات نہیں، ہو جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے ہی سب سیکھتے ہیں۔“ تمیز الدین نے کہا۔ وہ شرمندہ سی سب کے ساتھ بیٹھ گئی۔

جب کھانا شروع ہوا تو تمیز الدین اور نسیم بانو کے ساتھ ساتھ صفائے بھی اعتراف کیا کہ بس چاول نرم ہو گئے تھے، ورنہ بریانی کا ذائقہ بڑا اچھا تھا۔

نزاکت اور آدم یوں کھا رہے تھے جیسے وہ نہ کچھ سن رہے تھے نہ دیکھ رہے تھے۔ کھانے کے بعد سب کمروں میں چلے گئے کہ سونے کی جلدی تھی۔

صفا کی طرح اسے بھی نماز پڑھتے ہی سو جانا چاہیے تھا لیکن اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ ”خبردار!“ اس نے ڈائری اٹھائی اور صفائے کہا۔

”لائٹ آف کرو اور سو جاؤ۔ ایک تو پڑھا پڑھا کے تھکا دیا ہے اب کیا سونے بھی نہیں دوگی؟“ ”اپنی مظلوم تم!“ سبیل نے ڈائری واپس رکھ دی۔

”بریانی پکا کے تم نہیں چکیں؟“ اس نے تکیہ درست کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بھی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ”واہ!“ صفائے ہاتھ اٹھا کے پھیلی کھما کے واہ کا اشارہ بھی کیا۔

”سیکھ ہی لو اب تم دادی سے پکانا، کچن پھر تمہارا ہوا۔“ وہ لیٹ گئی۔

”دل سے اہتمام تھا یہ اس لیے ورنہ میں ابھی

بے ہوش سو رہی ہوتی۔“ اس نے اٹھ کے بتی بند کی اور اپنی جگہ لیٹ گئی۔

”ویسے تمہیں کیا لگتا ہے، دادی سچ کہہ رہی تھیں کہ سب ٹھیک ہے؟“

”پتا نہیں۔ کل ہم ان کی فائل دیکھیں گے تب پتا چلے گا۔“ جیسے وہ تو ماہر تھیں اس میدان کی کہ فائل سے سب جان جاتیں۔

”ہمم۔“ کچھ دیر بعد ہی صفا سو گئی۔ کروٹیں بدلنے کے بجائے وہ ڈائری اور قلم لے کر کھڑکی میں آ بیٹھی۔ جانے کتنی دیر بعد جب لکھتے ہوئے جمائیاں آنے لگیں تب وہ ڈائری رکھ کے سو گئی۔

☆☆☆

اس نے صبح، صفا سے چہل قدمی کے لیے نیچے جانے کا کہا تو وہ ہاتھ ہلا کے پھر سے بستر میں مٹس گئی۔ اس نے درتے سے جھانکا اور بندروازہ دیکھ کر جانے کیوں اسے یقین ہو گیا کہ وہ بھی آج اپنی صبح کی سیر ملاتی کر کے سوئے گا۔

وہ اپنی ڈائری لیے نیچے آئی اور پورچ کی دیوار پر بیٹھنے کے بجائے عقب میں چلی آئی۔ حوض کے اطراف کی جگہ مکمل طور پر جھاڑیوں اور پودوں سے صاف ہو چکی تھی۔

رات جو فٹما کا سفر اس نے ادھورا چھوڑ دیا تھا، وہ اسے آگے لکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد ڈائری بند کر دی۔ جھاڑیاں صاف ہونے کے بعد پھلی دیوار زیادہ واضح تھی۔ پونہی اس کا دل کیا کہ وہاں سے پیچھے جھانک کر دیکھے۔

وہ اٹھ کے دیوار کے پاس آئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح دیوار کے دوسری جانب دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ دیوار کے ساتھ چلتے ہوئے اس میں کوئی ٹکڑا، ٹوٹا پتھر یا پھر رکھنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی۔

”اگر کرسی ہو تو اس پر چڑھ کے، اچک کے دیکھوں تو شاید۔“ اس نے سراونچا کر کے دیوار کی اونچائی دیکھی۔

”نہیں۔ پھر بھی دوسری طرف نہیں دیکھ سکتی۔“

اسے مایوسی ہوئی۔ یکا یک نظر دیوار میں بنے بڑے سے سوراخ پر پڑی۔

”اس میں ایک پھر رکھ کے۔ دوسرا پھر یہاں لگاؤں تو۔ شاید۔“ اوپر دیکھتے ہوئے وہ سوراخ کے پاس آئی جو قدرے اونچائی پر تھا۔

”لیکن اگر اس سوراخ میں۔“ اس نے قریب جا کر ڈرتے ہوئے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے صفا کی خطرناک مخلوق والی بات یاد آگئی تھی۔

”آپ کو یہاں کچھ چھپانا ہے؟“ پیچھے سے آدم کی دھیمی آواز آئی اور وہ جھل ہوئی کہ وہ جانے کب سے اسے دیکھ رہا ہوگا۔

”نہیں۔“ وہ شرمندہ سی پلٹی۔

”پھر؟“

ادھر ادھر کی ہانکنے کے بجائے اس سے سچ کہنا زیادہ ٹھیک لگا۔

”میں دیوار کے اس طرف دیکھنا چاہ رہی تھی۔“

آدم کی آنکھوں میں حیرت درآئی۔

”آپ کو بلا سوچے سمجھے، جو دل چاہے، کر گزرنے کا شوق ہے۔“ آدم اس کے پچھلے کارنامے کا گواہ جو تھا۔

”اور اس میں کیا سوچنا!“ اس نے ذرا سا مڑ کے دیوار کو دیکھا۔

”دیوار کے اس طرف گہرائی میں جنگل اور اس سے بہت دور بستی ہے۔“ آدم نے اس کے تجسس کا جواب دیا۔

”امید ہے اب آپ دیوار پر چڑھ کے اس طرف دیکھنے کا ارادہ تیاگ دیں گی۔“ وہ دونوں ہی بہت دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ وہ جھل ہو کے سر جھکا گئی۔ ممکن تھا وہ وہاں سے چلی جاتی کہ دفعتاً یاد آگیا۔

”آپ نے دادی کے ڈاکٹر سے بات کی تھی؟“ اس نے سر اٹھا کے آدم کو دیکھا۔

آدم کا دل کیا پوچھے، کیا آپ نے فون کا انتظار کیا تھا اسے مسلسل خیال تھا کہ وہ منظر ہوگی تاہم وہ صدیقی والے فون سے اسے کال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”انھیں کچھ ایشوز ہیں۔ میڈیسن کے ساتھ ساتھ کسی پروسیجر کی بھی ضرورت ہے۔“ وہ فکر مند نہ ہو، اس لیے وہ جھوٹ نہیں کہہ سکتا تھا۔ آخر اس نے اس پر اعتبار کر کے ایک ذمہ داری سوپی تھی۔

”اور انہوں نے مجھ سے کہا سب ٹھیک ہے۔“ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ کچھ خفا اور پریشان سی وہ انگلیاں مروڑنے لگی تھی۔

”سب ٹھیک بھی ہے۔“ آدم نے کہا اور سبیل کی نظریں شاکی ہو گئیں گویا وہ بھی سیم بانو کی طرح اسے بہلا رہا تھا۔

”وہ پراپر میڈیسنز لیتی رہیں، اسٹریس نہ لیا، بی بی کنٹرول میں رہا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا ان شاء اللہ۔“ اس نے وضاحت دی۔

”لیکن آئندہ معمولی تکلیف پر بھی شاید پروسیجر کرنا پڑے گا۔“

”ہاں تو انتظار کس لیے؟ یہ ابھی ہو جانا چاہیے۔“ اس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ ابھی جا کر سیم بانو کو ہاتھ پکڑ کے جیب میں بٹھا کے اسپتال کے لیے نکل جاتی۔

”آپ کی فکر اور جلد بازی ٹھیک سی لیکن آپ اپنی دادی کا بھی سوچیں۔“ سبیل نے الجھ کے اسے دیکھا۔ وہ دادی کا سوچ کر ہی تو یہ کہہ رہی تھی۔

”میرا مطلب ہے، وہ اتنے کم وقفے میں دو دفعہ ہسپتال گئی ہیں۔ یہاں سے ہسپتال اور پھر وہاں سے واپسی کا سفر ان کے لیے آسان نہیں ہوتا ہے۔ اس عمر میں کچھ لوگ ہسپتال کے ماحول میں اچھے ہونے کے بجائے مزید گھبرا جاتے ہیں۔ اگر انھیں آج کل میں پھر ہسپتال بھیجا تو وہ واپس آ کر صحت یاب ہونے کے بجائے مریض زیادہ محسوس ہوں گی۔ بہتر ہوگا آپ فوراً انھیں پھر ڈاکٹر کے پاس لے

جانے کی ضد نہ کریں بلکہ ان کا خیال رکھیں، دیکھیں کہ ان کی دوائیاں کس نہ ہوں، انہیں خوش رکھیں، ساتھ ساتھ انہیں آہستہ آہستہ تیار بھی کریں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں پھر ہسپتال تک ڈرائیو نہیں کرنا چاہتا۔“ آخری جملے پر وہ مسکرایا تھا۔ اس نے پہلی بار اپنی لمبی بات کی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ پرسوج سی اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

”میں دادی سے فی الحال کچھ نہیں کہوں گی۔“ اس کے اچھے بچوں کی طرح مان جانے پر وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

دفعتاً اسے دور سے صفا کی آواز سنائی دی۔

”تھینک یو۔“ سبیل نے کہا۔

”تھینک یو۔“ آدم نے جواباً وہی کہا۔ وہ ناشی سے بغور اسے دیکھنے لگی کہ وہ کیوں اس کا شکریہ دہرا رہا ہے۔

”کل کی بریانی کے لیے!“

سبیل کی ایک دوسرے میں ابھی انگلیاں ایک دم رک گئیں۔ اسے لگا وہ اسے دیکھ نہیں رہا بلکہ اس کے اندر جھانک رہا ہے۔ یہ تو اس نے واضح لفظوں میں خود سے بھی اقرار نہیں کیا تھا کہ ’اہتمام‘ کی خواہش کس کے لیے جاگی تھی۔ وہ خود سے ہی جان کر انجان بننے کی کوشش میں لگی تھی اور یہاں وہ نہ صرف جانتا تھا بلکہ اسے جتا بھی رہا تھا۔ وہ گلابی ہو گئی تھی۔

ایک بار پھر صفا کی ہلکی سی آواز آئی۔

”میں بنا انعام کے بھی آپ کا کام کر سکتا ہوں۔“ وہ محفوظ ہو رہا تھا۔

”صفا مجھے محفوظ رہی ہے۔“ اس نے عمارت کی طرف اشارہ کیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

آدم مڑ کے اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا۔ اس نے کمرے سے اسے ادھر آتے دیکھا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ جاگنگ کے لیے نکلا تو سوچا ایک بار قسمت آزمائے کہ وہ اب بھی ادھر ہی

ہے یا نہیں۔

وہ گیٹ کی جانب چلا ہی تھا کہ حوض کی دیوار پر رکھی ڈائری پر نظر پڑ گئی۔ ڈائری اٹھانے کے بجائے وہ دیوار پر بیٹھ گیا۔

اسے شام کے کئی کارنامے پڑھنے تھے۔ صفحے پلٹتے ہوئے وہ آغاز کے کچھ صفحات کے بعد رک گیا۔

”خما کو پہلی بار اپنا آپ اس قدر سو فٹ سو فٹ لگ رہا تھا۔ اپنے بدن کی سفیدی اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر سامنے آنکھیں بند کیے لیٹی اپنی ماں کو دیکھ کر اسے احساس تھا وہ بھی دیکھنے والوں کو یونہی روٹی کے گالے کی طرح سفید اور نرم محسوس ہو رہی ہوگی۔ ماں کو دیکھتے ہی اس کا دل چلا ترپا تھا۔ اس نے دل میں پکارا۔

”ماں!“ اور دنیا نے ایک ننھے لمبی کے بچے کی میاؤں سنی۔ زبان اور کانوں کو یہ نیاز اقلہ بڑا بھلا لگا تھا۔

وہ اچھل کے اس کی اگلی ٹانگوں کے قریب آئی۔ ماں نے آنکھیں کھولے بغیر ہی اسے دونوں پیروں کے بیچ دبوچ لیا۔ اسے ایسی گرم سی محبت پہلی بار محسوس ہوئی جو ماں کے بس میں ہوتی ہے۔ اس نے اپنی دونوں اگلی ٹانگوں میں ماں کا بایاں پیر سیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ یہ وہ نرم سی، چھوٹی سی مگر اس کے لیے ایسی وسیع پناہ گاہ تھی جہاں کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا تھا، وہ خود کو محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ مگر ماں کو اپنی نیند میں یہ مداخلت پسند نہیں آئی۔ اس نے اپنی ٹانگوں سے خما کو خود سے دور کیا مگر وہ پھر ماں کے اندر دبک گئی۔ ماں نے آنکھیں کھول دیں کہ اب خما جیسی اولاد نے اسے آرام نہیں کرنے دینا تھا۔ بڑے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے ماں نے اپنا سر خما کے سر پر رکھ دیا۔ خما کچھ دیر اترائی لیکن جلد ہی اسے یہ بھاری سا وزن اچھا نہیں لگا اور اس نے زور زور سے گردن ہلائی۔ ماں سے اس کی شرارتیں مزید برداشت نہیں ہونا تھیں لہذا اس نے خما کو منہ میں دبایا اور دور لے کر دوڑی۔ سامنے کیاری میں خما کو نرمی

سے چھوڑا اور پلٹ کر اپنی جگہ جا کے بیٹھ گئی۔ خمانے ماں کو واپس وہیں آرام سے دراز ہوتے دیکھا اور پھر اپنے بچوں سے نرم سی مٹی اچھالنے لگی۔

اسے اس وقت دنیا کی کوئی فکر تھی نہ کسی کا ڈر تھا کہ ماں سامنے تھی۔ خمانہ کو علم تھا، وہ بھلے آنکھیں بند کیے اونگھ رہی ہے مگر اسے کسی مشکل یا مصیبت میں پڑنے نہیں دے گی۔ کچھ دیر نرم مٹی میں اپنا سفید بدن رونے کے بعد اسے پھر ماں کی آغوش کی طلب ہوئی اور وہ پھر بھاگ کے ماں کے پاس پہنچ گئی۔

اس کا دل محبت اور ایک بڑی آرام دہ، سکون آور گرم جوشی سے بھرا تھا۔ جس کی اسے آج سے پہلے حسرت ہی رہی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی رات کو آنکھ کھلے تو ایک مستابھری آغوش کی تمنائیں میں آنسو بھر دے، وہ بھی اداس ہو کے دعا کرے تو پہلے بھر کے لیے ماں کی بانہوں میں سامنے کے لیے عجیب عجیب سے وعدے کرے اور۔“

آدم کے حلق میں پھندا سا بن گیا تھا۔ اس نے ڈائری بند کر کے گہری سانسیں کھینچیں۔

جانے کتنے وقتوں بعد وہ ایسا جذباتی ہوا تھا۔ ماں تو اس نے بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ حسرتیں تو اس کے اندر بھی تھیں۔

کچھ دیر بعد یاد آنے پر سہیل دوڑتی آئی تھی مگر تب وہاں شادوم تھا نہ ڈائری۔

”اف!“ اس نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔

اس کا کمرہ باہر سے بند تھا جس کا مطلب تھا وہ جامنگ کے لیے ہے۔

”ڈائری تو ساتھ لے کر نہیں گئے ہوں گے۔“ وہ رک کے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

”میں اندر جا کر ڈائری لے لوں؟ لیکن اس طرح بنا اجازت، چھپ کے اندر جانا۔؟ کسی نے مجھے اندر جاتے یا باہر آنے دیکھ لیا تو۔؟“ اس نے بند دروازے کو دیکھا پھر گیٹ کی جانب اور پھر پورچ کی طرف۔ کچھ دیر شش و پنج میں گزار کے وہ آخر اندر

چلی گئی۔

دادی کو مکمل آرام دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے تینوں وقت باورچی خانہ دونوں نے سنبھال تھا۔ لہذا صفا کی ماتحت بنے اس کے احکام بجالاتے ہوئے وہ دعا کر رہی تھی کہ آدم ناشتے کے لیے آتے ہوئے ڈائری ساتھ نہ لے آئے ورنہ صفا کو ٹالنا سمجھانا مشکل ہوگا۔

اور اس کی دعائیں قبول ہوئیں۔ آدم خالی ہاتھ آیا تھا۔ سب کی موجودگی میں وہ خود اتنی محتاط ہوئی تھی کہ اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ آدم نزاکت کی موجودگی میں غلطی سے بھی اس کی سمت دیکھتا نہیں تھا۔ اب جب وہ ڈائری کے بغیر موجود تھا تو اگلی فکر دامن گیر ہوئی کہ وہ کب اس سے مانگے؟ کب موقع ملے گا اور تب تک وہ کیا کچھ پڑھ لے گا۔

ان سب کے جانے کے بعد وہ دادی کے ساتھ ان کے کمرے تک گئی۔ انھیں اپنے ہاتھوں سے دوائیاں دیں۔

”آپ کچھ دیر باہر بیٹھیں گی؟“ اس نے پانی کا گلاس واپس لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں چلو۔ نزاکت سے کہو، وہ پلنگ کھول دے گا“ وہ تیار ہو گئیں۔ وہ ان کے ساتھ باہر آئی۔ نزاکت بھی ادھر ہی تھا۔

”دادی کے لیے پلنگ بچھا دیں۔“ اس نے تیز قدموں سے نزاکت کے پاس جا کے کہا جو احاطے میں جھاڑو لگاتے ہوئے اب گیٹ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے جھاڑو وہیں چھوڑی اور پلنگ کی جانب چل دیا۔

”آپ لیٹ جائیں۔ تکیہ لا دوں؟“ نہیں، میں کچھ دیر پہلوں کی۔ تھک گئی تو بیٹھ جاؤں گی۔ تم ناشتہ کرو جاؤ۔“ انہوں نے اسے جانے کو کہا۔ اندر جاتے ہوئے اس نے کھلے دروازے کو دیکھا جہاں سے آدم باہر آ رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے فاصلے پر دونوں نے دنیا سے نظر ہچا کے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

ناشتہ کرتے ہوئے وہ صفا کی کلاس لے رہی تھی۔

”تم انگلیوں پر کن لودن اور پھر کتنا پڑھنا باقی ہے تمہارا وہ میں بتاتی ہوں۔“ وہ اسے بھی بتانا چاہتی تھی جو آدم نے کہا تھا لیکن پھر اسے اگلا بھلا سب بتانا پڑنا جو وہ نہیں بتا سکتی تھی۔ یہ بھی پہلی کھٹکھٹ تھی کہ صفا سے چھپانا بھی تھا اور رازداری کا بوجھ بھی دل پر تھا۔

جب صفا کے ساتھ نسیم بانو سے پوچھنے آئی کہ دوپہر کے لیے کیا پکائے تب انہوں نے بتایا کہ آدم اور میزالدین باہر گئے ہیں جو بنانا ہو، ان کو فون کر کے لانے کا کہہ دو۔ صفا فون لینے اور پرگئی اور وہ وہیں بیٹھ گئی۔

”لیکن شاید انہیں دیر ہو جائے۔“ انہیں یاد آیا۔

”وہ شاید شہر کے بازار جانے کی بات کر رہے تھے۔ دال چاول بنالو، صفا سے کہنا۔“

”جی۔ لیکن شہر کیوں؟“ روز کے سودا سلف کے لیے وہ نیچے کے قصبے تک ہی جاتے تھے۔

”پیچھے کے لیے کچھ سامان لینا ہے کہہ رہے تھے۔ کار سے گئے ہیں، نزاکت بھی ساتھ ہے دونوں کے۔“ اس نے تب غور کیا کار نہیں تھی، جیب اپنی جگہ کھڑی تھی۔

اس نے اندر جا کر صفا کو اطلاع دی۔

”رات کے اور کل کے لیے تو کہہ دیتی ہوں کہ جو کھانا ہو وہ لے آئیں۔“ اس نے میزالدین کو فون لگاتے ہوئے کہا۔

کام سے فراغت پاتے ہی وہ اسے لے کر پڑھنے بیٹھ گئی۔ صفا آنکھیں بند کیے، ذرا دیر پہلے یاد کیا ٹوٹا پھوٹا جواب سنا رہی تھی اور اسے سنتے ہوئے یکایک اس کی ذہنی رو بھٹک کے حال سے کٹ گئی۔ جواب ختم کر کے صفا کچھ دیر آنکھیں بند کیے اس کی تنقید کی منتظر رہی لیکن جب کوئی آواز نہیں آئی تو پہلے دائیں آنکھ کھول کے دیکھا کہ کہیں وہ غصے میں لال

پہلی تو نہیں ہو رہی ہے، مگر اسے سامنے دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھ کر اس نے جھٹ دوسری آنکھ بھی کھول دی۔

”اتنا پرنیکٹ سنایا کہ تم خوشی سے پتھر ہو گئیں؟“ صفا نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”اونہوں۔“ سمیل نے انکار میں ذرا سی گردن کو جنبش دی۔

”پھر؟“

”مجھے بہت دنوں سے اپنی پھونشنز، برکوئی فلمی سین یا نہیں آیا۔“ اس نے صدمے کی وجہ بتائی۔

”وہی تو!“ صفا نے پورے جوش سے سامنے رکھی کتاب بند کی۔

”اتنا تم نے امتحان کو سر پر سوار کر لیا ہے۔“ اس نے بازو میں رکھا ریموٹ اٹھایا۔

”اپنی یادداشت کو زنگ لگے اس سے پہلے ریویجن کر لیتے ہیں۔“ صفا نے ریموٹ کا بٹن دبایا اور لی وی اسکرین روشن ہو گئی۔ سمیل نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر لی وی بند کیا۔

”تمہارے حافظے کا زنگ دور کرنا زیادہ ضروری ہے۔“ ریموٹ اپنے پیر کے نیچے دبا کر اس نے کتاب دوبارہ کھولی۔

”اور اب ہم فلمیں نہیں دیکھیں گے ورنہ یاد رکھو مجھے یہاں سے لیمبو میں جانے کا آئیڈیا‘ تب تو سے ملا تھا پھر کوئی انسپریشن مل گئی تو؟“ صفا نے یوں منہ بنایا جیسے کڑوا یا دام دانتوں تلے آگیا ہو۔ ابھی تو اصل وجہ معلوم نہیں تھی کہ سمیل بی بی کی زندگی میں کون سی فلم شروع ہے جس نے اسے ان فلموں سے دور کر دیا ہے ورنہ وہاں ایکشن فلم کا کوئی منظر دکھائی دینے لگتا تھا۔

”واپس سٹاڈیہ ہی جواب۔“ سمیل نے سخت مزاج استانی کی طرح کہا۔

”آدم سے زیادہ پوائنٹس تو کھا گئیں تم۔“ وہ تینوں بہت دیر سے لوٹے تھے۔ گاڑی کی

آواز پر سبیل اور صفا دونوں نیچے دیکھنے کے لیے درپے کے پاس آئیں۔

”اودہ تو میرے مشورے پر کام ہو رہا ہے۔“ نزاکت کو پچھلے حصے سے پودے باہر نکال کر رکھتے دیکھ کر صفا نے مسرت سے کہا۔

”یعنی جو نکال پھینکا پھر وہ ہی لگانے کا مشورہ؟“ اس کے تصور میں پھر ایک مشقت تھی۔

”وہ جنگلی خود رو جھاڑ پاں تھیں، ایسے پیارے پیارے خوب صورت پودے نہیں۔“ صفا نے بتایا۔

”چلو اب کچن میں۔“ اس نے سبیل کا ہاتھ کھینچا۔

کھانے کے دوران بھی اس کے ذہن پر ڈائری سوار تھی، جس کے واپس مانگنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

”اللہ کرے صفا کچھ دیر سو جائے۔“ دوپہر میں سب قیلولہ فرماتے تب ہی وہ جا کر اس سے مانگ سکتی تھی۔

کھانے کے بعد نسیم بانو کو دوا دے کر وہ باورچی خانے میں جاتے ہوئے رک گئی۔

”اگر میں ابھی جا کے لے لوں؟“ وہ نسیم بانو کی خواب گاہ اور باورچی خانے کے درمیان تھی۔

”سبیل آ بھی جاؤ۔“ اندر سے صفا سے پکارتی باہر آرہی تھی۔

”اتنی بھوک لگ گئی تمہیں؟“ اس نے دروازے میں ہی اسے روک لیا۔

صفا کو نہ سونا تھا نہ وہ سوئی۔ ساری دوپہر گزر گئی۔ شام میں تو اب وہ سب باہر اکٹھا چائے پینے لگے تھے جب آدم بھی اپنا کام سمیٹ لیتا تھا۔ نسیم بانو

اور تمیز الدین اس کی کام سے کام رکھنے کی عادت، کام کی لگن، ذمہ داری اور اخلاق سے متاثر تھے۔

سب کے درمیان بات کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

عین اور میر عثمان واپس کوٹھی خیاباں پہنچے۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ بیگم منایت جہاں نے

کئی بار ثروت خاتون سے دریافت کیا تھا کہ وہ آئے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے اپنی منزل تک پہنچنے

کا راستہ بدل لیا تھا، پھر بھی نا چاہتے ہوئے بھی انہیں ان دونوں کا ایک ساتھ خوش ہونا بے چین کر

رہا تھا۔ انہوں نے شام کی چائے اس امید پر باغ میں پی تھی کہ وہ دونوں اس وقت آجائیں تو انہیں

بھی وہاں روک کر گہرائی سے ان کی ’کیمسٹری‘ کا جائزہ لیں گی تاہم وہ نہیں آئے تھے۔ انہیں اپنے

بھائی سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اپنے ماضی کی پراذیت یاد سے پیچھا چھڑالیں گے۔

کھانے کی میز پر، وہ ان دونوں سے پہلے موجود تھیں۔ پہلی بار زینے اتر کر نیچے آتے ہوئے

یا طعام خانے کے باہر سے ہی انہیں عدن کی ہنسی سنائی دی تھی، ورنہ وہ دونوں بات بھی کرتے تو

آوازیں اتنی ہی بلند ہوتی تھیں کہ دونوں سن لیں بس۔

انہیں دیکھتے ہی میر عثمان نے ادب سے سلام کیا اور عدن نے بھی تھلید کی۔

”لگتا ہے، بہت اچھا دن گزار کر لوٹے ہیں آپ دونوں۔“ سلام کا جواب دے کر انہوں نے

پیارے دونوں کو دیکھا۔ میر عثمان نے خفیف سا مسکرائے پر اکتفا کیا۔

”جی نواب بیگم۔“ جواب عدن نے دیا۔

”ماشاء اللہ۔ یونہی خوش رہیں۔“ انہوں نے ثروت خاتون کو ’سروس‘ شروع کرنے کا اشارہ دیا۔

”ہم بہت خوش ہیں کہ ہمارا انتخاب اور فیصلہ بالکل درست تھا۔ کیوں عثمان؟“

”جی آپا بیگم۔“ میر عثمان نے ایک نظر عدن کے سپرد کرنے کے بعد انہیں دیکھا۔

اس سعادت مندی اور عاجزی کے پیچھے میر عثمان کے دل میں کیا چل رہا ہے، انہیں اس کی تلاش تھی۔

عدن اپنی مسرت اور ایک خوب صورت دن

نے چہرے اور آواز کو جو چمک اور کھنک بخشی تھی، چھپانے میں ناکام تھیں تاہم میر عثمان نے آج جو قدم واقعی عدن کی سمت اٹھائے تھے، اسے خود تک رکھنے میں کامیاب تھے۔

☆☆☆

رات میں وہ پھر سب کے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔ سب سے آخر میں ویسے بھی وہ دونوں سوئی تھیں۔ صفائے جب جمائیوں کے بیچ کتابیں بند کر کے سونے کا اعلان کرتے ہوئے جی بھائی تو وہ بھی اس کے بازو میں لیٹ کر سوئی بن گئی تھی۔

جب یقین ہو گیا کہ وہ سو گئی ہے تو وہ دبے قدموں کمرے سے نکل کر نیچے آئی اور دروازہ کھول کے پورچ کی دیوار پر بیٹھ گئی۔ وہ اتنا ہی کر سکتی تھی۔ اس کے آگے دروازے تک جانے کی نہ ہمت ہو رہی تھی نہ دل مان رہا تھا۔

”اللہ کرے وہ باہر آئیں۔“ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔

”کیا پتا وہ اندر ڈائری ہی پڑھ رہے ہوں۔“ نئے امکان نے اسے بے اختیار کھڑا کر دیا۔

”کیا کروں؟“ کھڑکی سے ہلکی روشنی باہر آرہی تھی جس سے اسے امید بندھی تھی کہ وہ سویا نہیں ہوگا۔

”کھڑکی سے ہی بات کر لوں۔؟ نہیں۔ دروازے پر دستک دے آؤں۔؟“ وہ ٹھہرنے لگی تھی۔

”میں نے ان کا فون نمبر کیوں نہیں لیا؟“ میج بھیج کر آرام سے کام ہو سکتا تھا۔ وہ دیوار پر بیٹھ گئی۔

وہ آدم کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی اسے ہی اسی سیدھی باتیں سوچتی اور رد کرتی جا رہی تھی۔ آدم دروازہ کھول کے باہر نکلا اور پہلے اس نے اوپر درتے کچے کودیکھا پھر اس کی آنکھ پورچ پر پڑی تھی جہاں وہ اس کے اچانک نظر آنے پر دم سادھے تھی۔ کچھ پل اسے دیکھنے کے بعد وہ واپس

اندر چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہی تھا۔ ”کیا میں جاؤں وہاں تک؟“ وہ کھڑی ہوئی مگر آگے بڑھی نہیں۔ وہ کوئی فیصلہ کرتی اس سے پہلے آدم کمرے سے باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈائری تھی۔ دروازہ بند کر کے وہ اس کی سمت بڑھا۔

اس کے ذہن میں خما کے کارنامے کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔

”پتا نہیں کیا کیا پڑھ لیا!“ کچھ کارنامے اس کا دل دھڑکا رہے تھے کہ اس کے بعد آدم نے نظر ملانا بڑا مشکل امر تھا۔

”آپ شاید صبح سے اس کے لیے پریشان ہیں۔“ آدم نے ڈائری والا ہاتھ اوپر کیا۔

سبیل نے کچھ بولے بنا ڈائری تھام لی۔ آدم نے فوراً اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں پڑھا سوائے۔“ اس نے ہاتھ ہٹالیا مگر اب وہ اپنا ہاتھ نیچے کرنے کے بجائے اس کے رک جانے پر بے اختیار اسے دیکھنے لگی۔

”جب آپ کی خما ایک کلن تھی۔“ سبیل کی کیفیت ایک دم بدل گئی اور وہ ڈائری لے کر پیچھے دیوار پر بیٹھ گئی۔

وہ سامنے والی دیوار پر بیٹھ گیا۔ ڈائری سبیل کی گود میں تھی، جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا مانو وہ اتنی دور سے بھی بند ڈائری پڑھ نہ لے۔ آدم کے لیے پہلا موقع تھا کہ وہ اسے کچھ بولنے سے پہلے جھجک رہا تھا۔ اس نے یونہی گلا صاف کیا۔

”پہلی بار میں نے سوچا کاش کچھ دیر کے لیے میں خما کی جگہ لے سکتا!“ رات کی خاموشی میں اس کی دھیمی آواز اور اس سے چھلکتی حسرت، سبیل کے دل میں مانوس سی بات بن گئی۔ اس کے لب

ایک دوسرے سے زور ہوئے لیکن کوئی لفظ زبان سے ادا نہ ہو سکا۔

”آپ نے کب۔“ ہمیشہ اس سے بات کرتے ہوئے جو جھک سبیل کے انداز میں ہوتی تھی، آج اس طرف تھی۔

وہ جملہ مکمل نہیں کر سکا مگر سبیل جانتی تھی وہ کیا پوچھ رہا ہے۔

”میں نے اپنے پیرئس کو نہیں دیکھا۔ میں چند مہینے کی گئی تھی ایک ایکسڈنٹ میں ان کی ڈ۔ تھ ہو گئی تھی۔“ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جو اب ڈائری پر اس طرح دھرے تھے کہ اسے چھپا نہیں پارہے تھے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا اسے بتائے کہ سال کا وہ بد نصیب دن کل پھر آئے گا لیکن کہہ نہیں سکی۔

”مجھے اپنے آس پاس کے لوگوں سے بھرپور توجہ اور پیار ملا ہے لیکن ان کی کمی میری زندگی کی وہ حسرت ہے، جو میں اپنے پیاروں سے کہہ بھی نہیں سکتی۔“

”میری پیدائش کے وقت میری ماں فوت ہو گئی تھیں۔ میں اپنی نانی کے ساتھ رہتا تھا۔ جب میں چھ سال کا تھا تو ابا کا انتقال ہو گیا اور پھر اسی سال نانی کا بھی۔“ اسے یاد نہیں تھا کب اس نے ایک سالس میں یوں اپنے حالات بیان کیے تھے۔

”پھر آپ کس کے ساتھ تھے؟“ اسے آدم خود سے بڑا قریب محسوس ہوا۔

”یتیم خانے میں۔“ آدم کے جواب میں طنز، شرمندگی، دکھ یا افسوس نہیں تھا۔ یہ اس نے ایسے ہی کہا جیسے درھیال میں، ننھیال میں یا چاچا ماموں کے ساتھ کہتا۔

”آپ ہمیشہ سے یہیں، اوک ہاؤس، میں ہیں؟“ آدم نے پوچھا۔

”جی۔ دادی، میں، نزاکت اور تمیز جا جاتا تھ پھر صفا بھی آگیا۔“

”سب سے ہم سب ساتھ ہیں۔“ اسے اس وقت ایک دم یاد آگیا۔

”آپ کہاں جا رہے تھے۔ میرا مطلب

ہے جب میں آپ کی جیب کے سامنے آئی تھی اس وقت۔“ اب اس کے اندر آدم کے متعلق جاننے کا شوق اور تجسس تھا۔

آدم اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ وہ اس سے جھوٹ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اتنے کم وقت میں یہ تہہ بلی اس نے بھی نہیں سوچی تھی کہ یہاں اس کا دل کسی سے، دروغ گوئی کے لیے آمادہ نہیں ہوگا مگر ابھی سارا سچ کہنے کا بھی وقت نہیں تھا۔

”آپ نہیں بتانا چاہتے تو بھی ٹھیک ہے۔“ اس کی خاموشی کا مطلب سمجھتے ہوئے سبیل نے کہا۔

”میں کہیں نہیں جا رہا تھا۔“ آدم کی پراسرار آواز ابھری۔

”شاید قسمت کو مجھے، اوک ہاؤس پہنچانا تھا، اس لیے میں اس وقت وہاں تھا جہاں آپ تھیں۔“ سبیل کا دل پھر ڈولنے لگا۔ اب اسے یہاں سے جانا چاہیے تھا۔ مزید باتیں چلیں تو جانے وہ کیا کہہ بیٹھے یا ممکن تھا بنا الفاظ کے یہ سارے راز کھل جائیں۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ آدم بھی اٹھ گیا۔

”گڈ نائٹ۔“ آدم نے کہا اور وہ کچھ بولے بغیر اندر جانے لگی تھی یکا یک یاد آیا۔

”تو پھر وہ۔“ ابھی سی وہ رک گئی۔

”وہ جو بیمار ہیں، جیسی آپ بابا کہتے ہیں وہ کون ہیں؟“

”وہ میرے لیے سب کچھ ہیں مگر میرا ان سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔“ آدم نے خود کو اتنا بے بس بھی محسوس نہیں کیا تھا جتنا اس وقت کہ وہ اس سے کوئی جھوٹ کہنے جا رہا تھا مگر زبان سے سچ نکلا تھا۔

سبیل سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ آدم وہیں بیٹھا رہا۔

”کاش بابا آپ نے مجھے کچھ تو تفصیل بتائی ہوتی کاش میں ہی پوچھ لیتا!“

وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ بابا کا مقصد کیا

تھا۔ ان کا ہدف عنایت جہاں کی کمزوری تھا یا ان کی کمزوری یہاں موجود تھی۔ ان کا تعلق عنایت جہاں سے تھا یا اوک ہاؤس کے مکینوں سے، اور سب سے اہم سبیل ان کے لیے کیا تھی، کون تھی۔ سارے جواب اسے بابا سے ہی ملنا تھے۔ ان میں سے کسی کو ان سے سوال کی عادت نہیں تھی، وہ بلا چوں چہ ان کی بات پر عمل کرتے تھے اور پہلی بار وہ اس عادت پر پچھتا رہا تھا۔

سبیل بستر لیٹی تو ذہن آدم کی باتیں سوچ رہی تھی۔ ”ہم میں کتنی یکسانیت ہے۔ ویسے مجھ سے زیادہ اکیلے وہ ہوں گے کہ یتیم خانے میں تھے۔“ سوچتے ہوئے اس نے کروٹ لی اور آنکھیں صفا کے چہرے میں الجھ گئیں۔ دفعتاً اسے جو آدم سے انسیت اور اپنائیت محسوس ہو رہی تھی وہ احساس جرم میں ڈھل گئی۔

”صفا کی بھی تو امی نہیں تھیں۔ کچھ دنوں کی جان پہچان میں، ان کے ساتھ شیر کر کے میں خوش کیوں ہو رہی ہوں؟“ اس کے اندر اچانک ہی ایک سی کمی، کتنی کی وجہ سے آدم سے قربت کا جو احساس تھا وہ صفا سے دھوکا اور غداری لگنے لگا۔

”مجھے یہ سب صفا کو بتا دینا چاہیے۔ لیکن اسے تو آدم پسند ہی نہیں ہے۔“ ساری عمر سب کچھ اس کے ساتھ سانجھا کرنے کی عادت تھی جو اس وقت رازداری کو بھاری بوجھ بنا رہی تھی۔

”سو ری صفا!“ اس نے نیند میں ڈوبی صفا کے گال پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔ ”جس دن تمہاری ناپسندیدگی ختم ہوگی اسی دن بتا دوں گی۔“

☆☆☆

عنایت جہاں کے مقابل انتخاب لڑ رہے نمائندے کی کارسزک پر حادثے کا شکار ہو گئی تھی اور چند گھنٹوں میں ہی اس کی موت نے سارا سیاسی منظر نامہ بدل ڈالا۔ الزامات اور سازشوں کی سرکوشیوں کے درمیان ایکشن کمیشن نے اپنے خاص اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اس حلقے

کے انتخاب غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیے۔ ان کی انتخابی مہم بڑی کامیاب تھی۔ اعداد و شمار کے مطابق فوری ووٹنگ انھیں با آسانی فاتح بنا سکتی تھی لیکن آنے والے چند دنوں میں زمینی سطح پر حالات کون سی کروٹ لیتے، کہا نہیں جاسکتا تھا۔ لہذا عنایت جہاں خوش نہیں تھیں۔

”ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھیں گے۔“ اپنے کارکنان کے لیے ایک حوصلہ بخش اور جوش سے بھری تقریر کر کے اندر آنے کے بعد انہوں نے صدیقی سے کہا۔

”ہمیں جو وقت ملا ہے اس میں ہم اوک ہاؤس اور عدن کا قصہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک بار ہم دہلی میں مصروف ہو جائیں تو پھر ان باتوں کے لیے وقت نکالنا بھی مشکل ہوگا۔“ انھیں اپنے دہلی پہنچنے کا ایسا ہی یقین تھا۔

”سبیل کو نکاح کے بعد ابراؤ بھیج کر اوک ہاؤس بند کریں اور عدن۔“ وہ رک گئیں۔ صدیقی منتظر تھا۔ ان کے پاس کئی طریقے تھے۔ ”عدن کا رول یہیں تک تھا۔ اب ان کے منظر سے غائب ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔“

☆☆☆

اسپتال کے اسی وارڈ میں مشینوں سے گھرے ساکت ’وسیم علوی‘ کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے دوسری جانب سے موصول ہوا پیغام پڑھا اور اس کی پیشانی پر سوچ لکیروں سے بھر گئی۔ ”بابا کو کوئی ڈر تھا جو انہوں نے میرے علاوہ کسی سے کچھ شیر نہیں کیا لیکن اب آگے میں کیا کروں، اس کے لیے بابا کا ہوش میں آنا ضروری ہے اور۔ آئی ڈاؤٹ کر۔ بابا کا ایکسیڈنٹ ایکسیڈنٹ ہی تھا۔“

آدم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسپتال پہنچ کے خود کسی طرح انھیں ہوش میں لے آتا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

گنگا کنارے

تقسیم ہند سے پہلے کی کہانی ہے۔ جہاں دلی کی قدیم حویلی میں فتح محمد صاحب اپنی بیٹی ذہین آرا اور والدہ فضیلت بیگم کے ہمراہ رہتے ہیں وہ مسلم لیگ کے متحرک کارکن ہیں ان کے ہمراہ ان کا بھانجا کبیر بھی مایاں باپ کے مرنے کے بعد رہتا ہے۔ کبیر اور ذہین آرا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں فضیلت بیگم یہ بھانپ جاتی ہیں۔ کبیر کا باپ بد قماش آدمی تھا جس کی وجہ سے ان کی بیٹی جواں مرگی کا شکار ہو گئی تھی فضیلت بیگم نہیں چاہتیں کہ کبیر اور ذہین آرا کی شادی ہو، وہ بیٹے سے ذہین آرا کا رشتہ کہیں اور کرنے کا کہتی ہیں فتح محمد کو کبیر پسند ہے۔ وہ اسے غارہ پور بھیج دیتے ہیں۔

آزاد اپنی ماں امیر بیگم اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتا ہے۔ بوا سے آپا کے گھر لحاف اور سوغات دے کر بھیجتی ہیں۔ آزاد بھی تحریک پاکستان کے نعرے لگاتا ہے لے کے رہیں گے پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان۔

فرخ پردیس سے آئے ہیں سعادت کے رشتہ دار ہیں جو لکھنویوں ان کا استقبال کرتے ہیں فرخ کا یہ سفر دراصل سلسلہ جینیاتی سے جڑا ہے۔

ذہین کبیر کی آمد کی دعائیں کرتی ہے۔ طلعت فتح ہاشمی سے کبیر اور ذہین کے رشتے کی بات کرتی ہیں لیکن ان کا جواب انہیں مایوس کر دیتا ہے۔ ذہین ٹوٹ جاتی ہے۔

چوتھی قسط

کبیر بے اختیار پیچھے مڑا۔ جان اچھل کر حلق میں آ گئی تھی۔ اس کی نگاہیں اپنے سامنے کھرے رئیس الزماں بدایونی پر تھیں۔ چھوٹی داڑھی والے متوسط قد و قامت کے مارا الزماں کی آنکھوں میں محبت اور شفقت کے کوندے لپک رہے تھے۔ وہ مسلم لیگ رہنما تھے۔ فتح ہاشمی کے ربا دوست اور ساتھی۔ کبیر نے ایک گہری سانس لی۔ گڑبڑا کر انہیں سلام کیا۔ جو گھبراہٹ میں بھول گیا تھا۔

”ارے میاں، تمہارے ماموں جان نے بتایا تھا کہ تم غازی آباد میں ہو۔ میری مصروفیات ایسی رہیں کہ ملاقات نہ ہو سکی۔“ وہ اپنی لشت پر براجمان ہو گئے۔

”ہاشمی نے تازہ بیج دیا تمہیں کہ اس بڑے کو اپنی نگرانی میں۔ لے آؤ؟“ وہ ہارغ دیہار اور بذلہ رخ شخصیات کے مالک تھے۔ ان کی گفتگو میں بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ ساتھ سادگی بھی نمایاں تھی۔

”جج..... جی ا“ کبیر ابھی تک بوکھلایا ہوا کھڑا تھا۔

”نہ رگوں کا ادب اچھی چیز ہے کبیر میاں اگر اب بیٹھ جاؤ اور یہ بتاؤ۔ مجھے ڈھونڈا کیسے تم نے؟“

”قسمت.....“ کیر کے الفاظ بھی کہیں گم ہو گئے تھے۔ ریل اپنی پوری رفتار کے ساتھ پٹری پر بھاگ رہی تھی۔ بالکل جیسے کیر کا دل۔
رئیس الزماں صاحب، سننے سے زیادہ بولنے میں دلچسپی اور کمال رکھتے تھے۔ اور ان کی یہ عادت اس وقت کیر کے بہت کام آ رہی تھی۔

☆☆☆

شادی کے چھپے اور ہنگامے عروج پر تھے۔ کوٹھی کے زنان خانے میں رنگین آنچلوں کی بہار تھی۔ لڑکیوں کی ہنسی، قل قل کرتی ہنسی کی پھوار بس مستقل ہی تھی۔ مائیں آنکھیں دکھا رہی تھیں مگر شادی کے گھر میں بھی لڑکیاں نہ نہیں تو پھر کب نہیں؟

دو چار عمر رسیدہ بھی جو چیں بہ چیں ہو رہی تھیں۔

”اتنا کون ہنستا ہے؟ ہنسی ہے کہ جمہرات کی جھڑی؟ ایک بار شروع ہو جائے تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔“
”یہ نئی بات ہے، کیا کہیں دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے، بڑوں کا لحاظ، شرم، سب ناپید ہو رہا ہے۔ ہم بھی گزرے ہیں اس عمر سے، بول رہے تھے کہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا۔ اور اب ذرا انہیں دیکھیں، ہر وقت کی ٹھی ٹھی باتیں ختم ہوئی ہیں نہ ٹھی ٹھی۔“

”نانی حضور! آپ ہنستی نہیں تھیں۔ بولتی نہیں تھیں تو زندہ کیسے رہتی تھیں؟“ نیلو فر نے قاطمہ کے کان میں سرگوشی کی کہ بیاواز بلند یہ سوال کرنے کی جسارت کرتی تو قیامت ہی آ جاتی۔
”کیا سچی کی طرح کترنی زبان ہے، نیلو فر بی بی، ہیاؤ ڈھل گیا ہے آپ کا، بخدا یہ زبان لے کر سرال لکھیں تو خاندان بھر کی ناک ہی کٹاؤں گی۔“ قاطمہ نے نانی حضور کی لہلہ اتار تے ہوئے پوپے لب و لہجے میں نیلو فر کو تار اور وہ ہنستے ہنستے دہری ہو گئیں۔

”توبہ ہے۔ چکنے گڑے کی ذات کچھ بھی کہہ لو۔ کوئی اثر نہیں، بھلے گھوڑے کو ایک چاک اور بھلے انسان کو ایک بات کافی ہوتی ہے۔ مگر یہ تو ہیں ہی سدا کی بے کہنی۔“ نانی نے ناگواری سے انہیں دیکھا بلکہ گھورا۔
”ذہین آرا بھی تو ہے، ماشاء اللہ، کیسی خاموش طبع، فرماں بردار بچی ہے۔“
ذہین کی تحسین باواز بلند کی گئی، جسے سن کر وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ طلعت آپا کے سمجھانے بجھانے پر سب کے درمیان بیٹھ رہی تھی۔ اس وقت بھی زبردستی مسکرا دی۔

لڑکیاں بالیاں، ہنس رہی تھیں۔ بول رہی تھیں۔ گیت گارہی تھیں پہلا سا وقت اور حالات ہوتے تو ذہین بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان کا حصہ بنی ہوتی۔ وہ تو اتنا ہنستی تھی کہ ہنستے ہنستے آنکھ میں آنسو آ جاتے تھے.....
اتنا بولتی تھی کہ کبیر بھی تو ہاتھ جوڑ دیتا تھا۔

”رحم کرو۔ ہمارے پاس فقط دو ہی کان ہیں۔“

اور اسے گیت گانے کا بھی شوق تھا۔ کبھی چھپ کے گنگنا لیتی، شادی بیاہ کے موقعوں پہ بھی یہ آزادی کم ہی ملتی تھی۔ گیت گانا، میرا محوں کا کام تھا۔ یہاں اس شادی میں بھی گیت گانے کے لیے میرا محوں کی خاص ٹولی کو بلا دیا گیا تھا۔ پھر بھی لڑکیوں نے ڈھولک پائے شوق پورے کیے اور بڑی بوڑھیوں سے میرا محوں کے القاب پائے۔
پاٹ دار۔ آوازوں والی غورتوں کی ٹولی ڈھولک کی تھاپ پہ گیت گانا شروع ہو گئیں۔

پھولوں کا سجرا لاؤ رنی سکھی

بنو کی زلفیں سجاؤ رنی سکھی

ماہر سرد ہوا ان گیتوں کو سمیٹتی ہوئی آکے کی طرف بہتی جا رہی تھی، ذہین کا دل ان لفظوں میں اٹک رہا تھا۔

جودل کی زمین پہ نقش ہو گئے تھے۔

ہم آ رہے ہیں۔
تم کہاں ہو کبیر؟ کب آؤ گے؟

☆☆☆

گھیر میں رونق ہو گئی تھی۔ چھوٹے سے بچے نے سنائے اور خاموشی کی دیواریں توڑ کر ہر طرف آوازیں بکھیر دی تھیں۔ سب کو ایک کھلونا مل گیا تھا۔ جس سے کھیل کھیل کر دل نہیں بھر رہا تھا۔ بہزاد نے تو مدر سے کی چھٹی کر لی تھی۔ مگر آزاد کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ دوا خانے کی چھٹی تو وہ بیماری کی حالت میں بھی نہیں کرتا تھا۔

”دوا لینے بھی تو ہیں جاؤں گا۔ سارا دن خالی رہ کے کیا کروں گا۔“
جیانا شہ کر رہی تھی۔ بچے کو بوائے سنبھالا ہوا تھا۔ جو نالی کی گود میں بہت بے چین ہو رہا تھا۔
”اچھا آ یا! میں جا رہا ہوں، کچھ منگوانا ہے تو بتا دو۔ کوئی خمیرہ، مربہ، صحت بنانے کا نسخہ!“ آزاد نے بوا کی گود سے بھانجے کو نکالا، حسب عادت اچھالا۔

بچے نے کی تلقاریاں خوشی کی تھیں اور جیا کی چیخ ڈر کی۔

”ادھر دے اسے۔“ بوائے نواسے کو اپنی گود میں دبوچا۔

”ہڑڈ آنو لے کامربہ بنوادے حکیم صاحب سے۔“

”ٹھیک ہے۔“ آزاد باہر نکل گیا۔

آج حکیم صاحب کے ساتھ باہر کا دورہ تھا۔

قبرستان اور جنگل ساتھ ساتھ تھے۔

”کو ار پھٹا (کھیکو ار) خود رو تھا۔ جگہ جگہ گھنے جھاڑ موجود تھے۔ ویسے لوگ حد بندی کے لیے جانوروں کا راستہ روکنے کے لیے بھی اسے لگاتے تھے۔ اس کے کانٹے جانوروں کو دور رکھتے تھے۔“

آزاد نے بڑی تعداد میں اسے کاٹ کاٹ کے ٹوکرا بھر لیا۔

حکیم صاحب اس کے گودے سے حلوہ بناتے تھے۔ گھٹیا (جوڑوں کا درد) کی تکلیف میں فائدہ دیتا تھا۔

یہاں ”نیل“ نام کا ایک درخت تھا۔ جس میں سوسوں کے بیج جیسی پھلیاں لگتی تھیں۔ اسے بکریاں کھاتی تھیں۔ برسات کے بعد خود رو پودوں کی طرح جگہ جگہ اگ جاتا تھا۔ لوگ اس کی شاخیں کاٹ کر سکھا لیتے۔ اور اسے ایندھن کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ایندھن کے لیے ”جھاؤ“ کی لکڑی بھی استعمال ہوتی تھی۔ ”جھاؤ“ گنگا کنارے، ریت میں ہوتا تھا۔ اس کی چھوٹی اور بلی لکڑی سے ٹوکریاں بنائی جاتی تھیں۔ یہ لکڑی کیلی بھی جل جاتی تھی۔ اسی میں قدرتی تیل ہوتا تھا۔ پھٹ پھٹ خوب جلتی تھی۔

دریا کنارے ”کچری“ بھی ہوتی تھی۔ جسے سبزی کی طرح پکاتے تھے۔ اس میں کھٹاس ہوتی تھی۔ یہ ترکاری۔ مختلف سائزوں میں ہوتی تھی۔ ہیر سے لے کر کیری تک کا سائز سکھانے کے لیے ترپال پہ ڈھیر لگا کر بھانے کی دھوپ میں سکھاتے تھے۔

جنگل سے گنگا کنارے آئے۔ ”جھاؤ“ کی شاخیں کاٹ کے ٹوکرے میں ڈالیں۔

دوپہر کی نرم گرم دھوپ جسم و جاں کو گھسیٹ لگ رہی تھی۔ آزاد کا دل چاہا، یہاں کچھ دیر اور ٹھہر جائے، مگر حکیم صاحب نے واپسی کا اشارہ کیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

جوڑا خوب بھاری تھا، زری گونا، لگا دو پٹہ اس سے بھی زیادہ بھاری اور خوب صورت، نورن کی تو آنکھیں

پھٹ گئیں۔

”جوڑا تو بہت خوب ہے بوا، کہاں سے آیا؟“
”لوہن کی ماں نے بانٹے ہیں۔“ مغلانی بوائے نے فخریہ بتایا۔

”اور میرا؟ میرا جوڑا نہیں دیا؟“

”یہ رہا، دم نہ نکال، پکڑ اپنا جوڑا۔“ بوائے نے جوڑا نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

”اولی اللہ، اتنا بھاری؟ کیسے خوب صورت ستارے لگے ہیں بوا!“

نورن نے جگر جگر کرتے جوڑے پہ ہاتھ پھیرا۔

”ملکے لوگ تھوڑی ہیں جو ہلکی چیز دیں گے۔“ بولتے بولتے اچانک بوا کو کچھ یاد آیا۔

”اتنی سنبھال کے رکھ دے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

”کہاں جا رہی ہو؟“

”کام سے جا رہی ہوں۔“

”یہاں کون سے کام تمہارے پلے پڑ گئے؟“

”کوٹوالی میں بھرتی ہو گئی ہے جو جرح پہ جرح کیے جا رہی ہے؟ اپنے کام سے کام رکھ۔ آتی ہوں ابھی۔“ بوا جھنجھلائی۔

”اچھا بھئی جاؤ، ہمیں کیا۔“ نورن اپنے جوڑے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

مغلانی بوا چپکے سے نکل پڑیں۔

کوٹھی سے باہر لمبی، ہموار سڑک تھی۔ جو اس وقت سنسان اور خاموش تھی۔ سڑک کی پرلی طرف درختوں

کے گھنے جھنڈ میں وہ کھڑا تھا۔ چمکتی آنکھوں میں اضطراب تھا اور وجیہہ چہرے پہ انتظار۔

مغلانی بوا کو دیکھتے ہی وہ کھل پڑا۔

”بہت انتظار کروایا خالہ جان نے۔“

”ارے بیٹا، بس کیا بتاؤں، وہ جوڑ کی ہے نا، میری جان کو لگی رہتی ہے۔ آزاری کہیں کی۔ ابھی بھی جرح

کر رہی تھی۔ کہاں جا رہی ہو؟ کیوں جا رہی ہو؟“

مغلانی بوا شروع ہو گئیں۔ فرخ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

”ذرا دم لیجیے، یہ بتائیے کہ ہمارے کام کا کیا ہوا؟“

”بڑے امتحان میں ڈال دیا گیا۔ ہم کیا کریں؟ کیسے کریں؟ ذہین بیٹا اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ انہیں کون

حکم دے سکتا ہے؟ ہماری لاکھ عزت کریں پھر بھی رہیں گے تو ان کی کھلائی۔ کس منہ سے فرمائش کریں کہ ذری،

یا شیخے میں نہیں بیٹھنے دے گا۔ ہمارے ساتھ چلیں، اور پھر جو بات چل گئی بعد میں کہ یہ سب ہمارا کیا دھرا ہے تو؟.....“

اس عمر میں سفید چوڑے میں کالک لگانے کی ہمت نہیں ہو رہی۔

”تو یہ ہے خالہ، آپ کو دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ اتنی ڈرپوک ہوں گی۔ آپ؟“ فرخ کی مسکراہٹ میں بڑی بہادری تھی۔

”سب کچھ آپ کو بتا چکے ہیں دوسرے ذرائع سے بھی آگاہ ہیں آپ۔ کہ ہم اس گھرانے کے ہونے

والے ذاماد ہیں۔“

”یہی تو بات ہے بیٹا، خدا خواستہ کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو لیپے سے دینے پڑ جائیں گے۔ بنتی بازی بگڑ جائے گی،

آپ کے بارے میں کیا رائے قائم ہوگی؟“ بوا۔ ساری اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں مگر اس قسم کی باتیں تو وہ

بہت آہستہ اور سعادت سے بھی سن چکے تھے۔ انہیں ناصح نہیں چاہیے تھا۔ کوئی چارہ ساز، غم گسار مطلوب تھا۔

”دیکھیں خالہ جان! آپ ہماری بات غور سے سنیں اور سمجھیں، آج شام کی گاڑی سے ہاشمی چچا کے مہمان

آ رہے ہیں، عصر پڑھ کے وہ اسٹیشن کے لیے نکل جائیں گے۔ کل بارات آرہی ہے۔ ہمارے پاس بس آج کا دن اور شام کا وقت ہے۔ عصر کے بعد کسی بھی طرح انہیں پائیں باغ لے آئیں۔ جو جگہ آپ کو دکھائی تھی، وہاں کوئی نہیں آتا، وہ گوشہ غم و مأسا بن رہا ہے۔

اور ہاں.....“ فرخ نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

”یہ آپ کے لیے خریدے تھے۔ چھپیں گے آپ پر۔“

”سو نے کے جھالے!“ بوا کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

”بیٹا، بہت زیادہ زیر بار کر دیا، ہم تو.....“

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، پلکیں، آنکھوں پہ بوجھ نہیں ہوتیں۔ آپ کو حالہ زبان سے نہیں دل سے کہا ہے۔ انہیں قبول کریں اور رہی میری عرضداشت، تو دوپٹے کے پلو میں باندھ لیں۔ یاد رہے تو گرہ کھول دیجیے گا نہ بھی ہوا تو شکایت نہیں ہوگی۔“

فرخ میاں آدھ کر کے چل دیے۔

مغلانی بوا کے لیے واپسی کا سفر ٹھن تھا۔

یہ آج کل کے جوان، انوکھے لاڈلے ہیلن کو مانگیں چاند، دو چار۔ حروف پڑھ کے انگریز بن جاوے ہیں، ایک ہمارا دور تھا۔ ٹھوٹھٹ اٹھانے پر ہی ایک دوسرے کی شکل پتا چلتی تھی کہ اچھا..... یہ ہے جو ہمارے بے بندھا ہے مگر اب تو پہلے سے پہلے دیکھنا بھی ہے۔ اور آگے بڑھ کے بات بھی کرنا ہے تو بہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں بزرگ، چودھویں صدی قیامت کی صدی ہے۔ خدا جانے ان آنکھوں کو اور کیا دیکھنا ہے ان کانوں کو اور کیا کیا سنتا ہے؟

☆☆☆

محن میں نرم گرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی، چار پائیوں پر مہمان، میزبان سب براجمان تھے۔ ایک چار پائی پر جیا بیٹھی تھی۔ بیٹا گود میں تھا جسے انڈا اکل رہی تھی۔

امین نانا اور بندو ممائی لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ بیٹی ساتھ آئی تھی۔ سیدھی سادی شریف الطبع بنی۔ بہزاد سے تھوڑی ہی بڑی ہوگی۔ نام تھا۔ ”ماشاء اللہ“ پلنگ پہ بیٹھی بڑے انہماک سے سمجھاتی کہ ”اے علی کو دیکھ کر مسکراتی، کبھی محن میں چلتی پھرتی مرغیوں پہ توجہ ہو جاتی۔“

بڑے اپنی باتوں میں مگن تھے بہزاد ”آپا“ کی جان کھارہا تھا۔

”بوا امین نانا کو ماموں کیوں کہتی ہیں؟“

”کیوں کہ وہ بوا کے ماموں ہیں۔ ہمارے نانا ہیں۔“

”اور عمر ماموں؟“

”وہ ہمارے ماموں ہیں۔ بوا کے بھائی ہیں۔“

”اور میں..... علی کا ماموں ہوں۔“

”سولہ آنے درست۔“ آپا نے بیٹے کا منہ صاف کر دیا۔ ”ماشاء اللہ“ نے اسے آگے بڑھ کر گود میں لے لیا۔

”بال بچوں کو لے کر لاہور کا چکر لگاؤ کبھی۔ اپنے شہر کی سیر کرائیں گے۔ بہت اچھی اچھی جگہیں ہیں دیکھنے کی۔“ امین نانا اپنی بھانجی سے مخاطب تھے۔

”اللہ نے چاہا تو ضرور آئیں گے۔“ امیر بیگم یونہی گول مول جواب دے کر مسکرا دیتی تھیں۔

”اگلی بار میں ٹکٹ لے کر آؤں گا اور سب کو لے جاؤں گا۔“ نانا نے اعلان کیا۔

”ہیں نانا“ بہزاد پر جوش ہو گیا۔

”لاہور میں کیا کیا ہے؟“

”بہت کچھ ہے بیٹے، تم آؤ تو سہی۔ ہم تمہیں راوی کی سیر کرائیں گے۔ انارکلی گھمائیں گے۔ شالامار باغ، جہانگیر کا مقبرہ اور بارہ درہری شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد، داتا دربار، بھالی گیٹ، مستی گیٹ..... بندوانی بولتی رہیں، میزبان دیکھی سے سن رہے تھے اور حیرت سے مرعوب ہو رہے تھے۔“

”ایک دنیا آباد ہے وہاں بالکل جیسے دل۔“ نانا نے لقمہ دیتے ہوئے مثال دی۔

”میں نے تو دلی بھی نہیں دیکھی۔“ بہزاد نے منہ بسورا۔

”اللہ بخشے تمہارے بابا کام کرتے تھے وہاں، آج ہوتا تو تم سب کو دلی بھی گھما دیتا۔ لاہور بھی لے آتا۔“

”جوانی ہی میں چلا گیا بے چارہ۔“ نانی نے ایک آہ بھری۔

”یہی خدا کو منظور تھا۔“ امیر بیگم کے انداز میں بردباری تھی۔

”بہزاد نے تو باب کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ انتقال کے تین ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔ جیا کو باب کا چہرہ اور شفقت یاد تھی۔ اس کا دل بھاری ہونے لگا۔ باحول میں یک دم ہی خاموشی اور افسردگی چھا گئی۔

محکم میں اچانک ہی دو بلایاں ایک ساتھ وارد ہوئیں، گھر کے کواڑ عموماً ادھ کھلے ہی رہتے تھے۔ مرغیوں میں سراپسنگی پھیل گئی وہ ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ کٹ کٹا مرغی۔ غرا کے بلیوں کی طرف لپکا۔ ان میں سے ایک پتنگ کے نیچے کھس گئی۔ دوسری بہادر تھی، تن کر مرغی کے سامنے کھڑی ہو گئی اور جواباً غرائی۔

محکم میں عجب ایک شور اور ہنگامہ مچ گیا۔ مرغیاں پیں پیں کرنی ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔ پتنگ کے نیچے ملی میاؤں

میاؤں اور دوسری ملی کے سامنے کھڑے مرغی نے اچانک ہی آسمان کی طرف منہ کر کے زوردار بانگ دی۔

ملی نے نیم وا آنکھوں میں بے نیازی بھری اور بڑے اطمینان سے بہزاد کی گود میں رینگ گئی۔ قصبے کے

سارے جانور اور بچے ایک دوسرے سے واقف تھے۔

سب سے پہلے علی محفوظ ہوتے ہوئے کھلکھلایا۔ آگے پیچھے بہزاد اور ”ماشاء اللہ“ ہنس پڑے اور پتنگوں پہ

براجمان سارے بڑے مسکرا دیے۔

☆☆☆

باغیچے کی اپنی ایک الگ دنیا میں جہاں بلند بالا شجر سر اٹھائے کھڑے تھے، سورج کی نرم گرم کرنوں میں نہا گئے۔ دھوپ

میں ڈوبی شاخوں پہ پرندوں کے مستقل آشیانے بھی تھے اور عارضی ٹھکانے بھی۔ اس وقت امرود کے پیڑ کی شاخوں پہ جو

طوطے بیٹھے تھے وہ عارضی ٹھکانے والے تھے۔ ان میں سے چند۔ امرود کو کتر کتر کے کھانے میں مصروف تھے۔ اور کچھ

خاموشی کے عالم میں شاید دنیا کی بے ثباتی کا جائزہ لے رہے تھے۔ قریب ہی بڑے درخت کے تنے پر کھٹ کھٹ بڑھتی نے

شور مچایا ہوا تھا۔ اُلی کے پیڑ پہ چھٹی فاختہ نے منہ بنایا۔ ایک تو کھٹ کھٹ بڑھتی کا شور۔ اوپر سے شاخوں اور پتوں سے آتی

کھٹ کھٹ مہک، نازک مزاج فاختہ کو طوطوں کی ٹیٹ ٹیٹ بھی گراں گزر رہی تھی۔

”تو یہ ہے، اس دنیا میں نہیں سکون بھی ہے یا نہیں؟“ فاختہ بی نے اپنے پر پھڑ پھڑائے اور قدرے دور

کونے میں نیمل کے درخت پہ جائی بھی دھوپ چھن کر آرہی تھی۔ اچھی لگ رہی تھی۔ مگر یہ سکون عارضی تھا۔

کوؤں کی ایک ٹولی جانے کہاں سے مڑگشت کرتی ہوئی آئی اور پھر جو کائیں کائیں کا طوفان برپا ہوا بی

فاختہ نے اپنے کان ہی دبا لیے۔

”کم بچو مارے جنے کہاں سے آ جاوے ہیں۔ اپنی منخوس کائیں کائیں کرنے۔ فاختہ بی کو رسولن دادی کا

کوسنا یاد آ گیا۔ پرلی طرف کی کوئی شاگرد پیشہ میں قیام تھا ان کا، فاختہ بی اکثر ان کے آگن میں لگے جامن کے

درخت پر اپنی پہلی چڑیوں کے ساتھ چھدکتی تھیں۔ ان کوؤں نے یہاں آسمان سر پہ اٹھایا ہوا تھا۔ لہذا وہ بہتر یہی تھا کہ یہاں سے پرواز کر کے رسولن دادی کے آگن میں جایا جائے۔
بھی کبھار بہت بڑے بڑے عالیشان باغ باغیچوں میں وہ سکون نہیں ملتا جو چھوٹی سی انگنائی میں لگے ایک بیڑ پر مل جاتا ہے۔ پرواز کے لیے پرتولتی فاختہ بی پہ زندگی کا ایک اور فلسفہ عیاں ہوا تھا۔

☆☆☆

کوٹھی کے ہال نما بڑے کمرے میں لڑکیوں ہالیوں کا جھوم اکٹھا تھا۔ کل دوپہر بارات کی آمد تھی۔ اور تیاریاں.....؟ وہ تیاریاں جو کئی مہینوں سے ہو رہی تھیں۔ ابھی تک نامکمل تھیں۔

”آپا! یہ زری سی کرن رہ گئی، لکھ لگا دیجیے۔ احسان ہوگا ہم پر۔“
”دیکھو، چمن! تم عین وقت پہ کام لیے دوڑی چلی آتی ہو۔ پھر نہیں کرتی ہو۔ لکھ ہم تمہارے آگے ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ ہمیں معاف کرو۔ پھوپھو بیگم کے پاس جاؤ وہ کر دیں گی۔“
ادھر ذہین آرا، طلعت آپا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ سامنے پیازی رنگ کی خوب صورت ساڑھی پہیلی تھی۔ بنارس سنہری و نقری ساڑھی کا بارڈر فیروزہ کی تھا۔ اس کے ساتھ سرخ رنگ کا مٹھلیں ڈبا تھا۔ انہوں نے ڈبا کھولا۔ اندر فیروزہ کے کاسیٹ جگمگا رہا تھا۔

”بہت حسین ہے۔ لا جواب۔“ ذہین کی توصیفی نگاہیں پہلے سیٹ پر، پھر طلعت آپا پر مرکوز ہو گئیں۔
مہناز شریٹر بار بار اندر باہر ہو رہی تھی، جھومر کے چند موتی نکلے ہوئے تھے۔ ساس نے پہلے ڈانٹ پلائی پھر جھومر ٹھیک کروانے سار کے ہاں بھیجا۔

”میرے، تہنیتی پیغامات اور قصائد کا اہتمام مردانے ہی میں نہیں زنان خانے میں بھی تھا، باذوق اور باصلاحیت خواتین لڑکیاں اپنے لکھے ہوئے کی نوک پلک سنوار رہی تھیں۔ رات میں خاندان بھر کا زنانہ مشاعرہ تھا۔ تم نے کچھ لکھا ذہین؟“

”جی، لکھا تو تھا۔ ایک نظر دیکھ لیجیے گا ذرا۔“
”دیکھ لیں گے۔ ویسے تمہارے مصرعے خاصے چست ہوتے ہیں۔ شاید ہی اصلاح کی ضرورت پڑے۔ لیکن اگر دکھانا ہے تو ابھی لے آؤ۔ اس کے بعد فراغت نہیں ملے گی۔ اپنی تالی ساس کی عیادت کے لیے جانا ہے“ طلعت آپا نے ساڑھی تہہ کرنا شروع کی۔

”میں ابھی لے کر آتی ہوں۔“ ذہین اٹھ کھڑی ہوئی۔
کمرہ ابھی تک بھانت بھانت کی بولیوں سے گونج رہا تھا۔
وہ اپنے کمرے کی طرف آرہی تھی، راہ میں صولت مل گئی۔
”اچھا ہوا آپ یہیں مل گئیں، ہم آپ کو ہی تلاش کر رہے تھے۔“

”جی بالکل خیریت ہے، بس فیروزہ ممانی آپ کو یاد فرما رہی ہیں۔“
”افوہ.....!“ ذہین کراہ کر رہ گئی۔ فیروزہ بھابھی نے تہنیتی پیغام لکھا تھا۔ کل سے اب تک وہ مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔
ذہین کے ہمراہ بیٹھ کر بھی مغز ماری کی گئی مگر ان کی مرضی کا نتیجہ نہیں نکل رہا تھا۔ اب پھر ذہین کو یاد فرمایا تھا انہوں نے۔
”کہاں ہیں وہ؟“

”ادھر، باغیچے میں۔“ صولت نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ جہاں ٹوٹا ہوا تپڑا ہے۔
”ٹھیک ہے۔ ہم چلے جاتے ہیں۔“ ذہین نے سر ہلایا۔

صوبت مطمئن ہو کر چل دی۔ اس نے فیروزہ ممائی کا پیغام ذہین آرا تک پہنچا دیا تھا۔ ہاں بس وہ یہ بتانا بھول گئی تھی کہ فیروزہ ممائی کا یہ پیغام مغلائی بوائے دیا تھا۔

☆☆☆

آنگن میں چھالیہ اور پٹی کے درختوں تلے بطخیں قیس قیس کرتی پھر رہی تھیں۔ بیشتر کی رفتار سستی کاہلی سے عبارت تھی۔

”ہش ہش..... قیس قیس.....“ منھی لیلیٰ انہیں دوڑنے پر اکسانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ کاہل بطخیں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ رحیمہ خاتون نے سل پہ ایک ایک کر کے چیزیں پینا شروع کیں۔

لہسن، ادرک، پیاز، گرم مسالہ، مرچیں، دھنیا خوب باریک کر کے انگلی کی مدد سے مسالہ اتار کر پیالی میں رکھا۔ قنات سرسوں کا تیل گرم کر کے مسالہ بھونا اور پھلی کے قتلے اس میں چھوڑ دیے۔ جب تک ہنڈیا تیار ہوئی۔ لیلیٰ اور اس کا بھائی حسن بطخوں کے ساتھ کھیتے رہے۔

رحیمہ خاتون نے مٹی کی ہنڈیا میں چاول پکنے رکھ دیے۔ قدرے موٹا جوشی چاول اچھی طرح ابل گیا تو اس کی چچ پھینک دی۔ چاولوں میں نمک بھی ڈالا تھا۔ پلیٹ کے کنارے نمک رکھ کر چاول کھانے کا رواج تھا۔

رحیمہ خاتون گھر کے عقب میں واقع مشترکہ تالاب میں نہانے چلی گئیں۔ یہ خواتین کے نہانے کی مخصوص جگہ تھی۔ محسن میں حسن چھالیہ کے درخت پہ چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیلیٰ ماں کے پاس آ گئی۔ رحیمہ خاتون بیٹی کو ڈبکی لگانا سکھا رہی تھیں۔ اس خطے کے بچے اپنے بچپن میں تیراک بن جاتے ہیں۔ پھر ماہر بھی ہو جاتے ہیں۔ لیلیٰ ناک بند کر کے ڈبکیاں لگا رہی تھی۔ ماں کے ہاتھوں نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔

کھیتوں میں کام کر کے لیلیٰ کے والد بھی گھر آ گئے تھے۔ رحیمہ خاتون نے سب کو کھانا دیا۔ لیلیٰ باپ کے کندھے پہ چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہوں نے پڑ کے گود میں بٹھالیا۔

بھو شتم نا پر نی بھائی کم جیت (بھوکے کو کوئی شے اچھی نہیں لگتی)

انہوں نے نوالہ بنا کر پہلے بیٹی کے پھر اپنے منہ میں ڈالا۔

☆☆☆

ریل گاڑی کا انجن دھواں چھوڑتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اور کبیر کا دل اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

خدا جانے وہاں جا کر کیا حال ہوگا؟ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ہم سفر بے حد اطمینان سے بیٹھے بیٹھے

اونگھ رہے تھے۔ کبیر اب تک سینکڑوں باتیں سوچ چکا تھا جو ماموں جان کے سامنے کہہ سکتا مگر ہر بات پر جب بھی

تھوڑا سا اور تک غور کرتا وہ بودی اور کنزور غسوس ہوتی۔

بھاگتی ہوئی ریل کی کھڑکی سے نظر آتے مناظر چند لمحوں کے لیے نگاہوں میں سماتے اور ماضی بن جاتے ہر لمحے، ہر منظر کو ماضی بنادینے کا یہ سفر کبیر کے لیے بہت دشوار ہو رہا تھا۔ دل اور دماغ دونوں پہلے ہی الجھن اور

تضاد کا شکار تھے۔ دل کا کہنا کچھ اور تھا۔ دماغ کا سمجھنا کچھ اور دل کی مرضی کچھ اور سی اور سیر کی نصیحت اس کے

برعکس اور وہ دل کی انگلی تھا اسے اس سفر پر چل نکلا، جہاں گہری ہوتی شام شد بد تاریکی میں ڈھل گئی تھی۔

اس نے وہ دنوار چہرہ تصور میں لا کر اگلے کے حصول کی کوشش کی۔

سوچ سوچ کے خود کو پریشان کرنے اور تھکانے سے کیا حاصل؟ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ منزل پر پہنچنے تک

خود کو سنبھالو تاکہ آگے کے حالات بھی سنبھال سکو۔ دل نے جیکے سے صلاح دی۔

کبیر کی نگاہیں قدوائی صاحب سے ٹک گئیں۔ اونگھتے اونگھتے جھٹکا سا لگا تھا۔

”کیا ہوا میاں صاحبزادے! اسٹیشن آ گیا کیا!“ انہوں نے اپنی مندی مندی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔

”جی نہیں ابھی وقت ہے اسٹیشن آنے میں آپ آرام فرمائیے۔“
 ”اس عمر میں کاہے کا آرام۔“ انہوں نے جھانکی لیتے ہوئے منہ پہ ہاتھ رکھا۔
 ”آرام تو بس ایک ہی بار ملے گا۔“ دوسیدھے ہو کر لیٹ گئے۔
 ”میاں آپ بھی آرام کر لیں کچھ دیر۔ وہاں تو شادی کا گھر ہے۔ شور شرابے اور گہما گہمی میں آرام کا موقع ملے گا نہ نیند کا۔“

”جی.....!“ کبیر نے ایک گہری سانس لی۔
 ”حالات تو سانس لینے کا بھی موقع نہیں دے رہے تھے۔“

۲۰۲۰ء

دیوان خانے میں محفل جچی تھی۔ ہاشمی صاحب کے علاوہ چھ سات مہمان اور بھی موجود تھے۔
 ”ارے صاحب اب اس خطہ ہندوستان میں نہ اردو کا مستقبل محفوظ ہے نہ مسلمانوں کا، نہ ہی اسلام کا۔“
 بریلی والے مظفر چچا نے قطعیت سے رائے دی۔

”سارے مسلم لیگیوں کو دن رات یہی ادھام ستاتے رہتے ہیں۔“ اعجاز ماموں کا لہجہ طنز بہ تھا۔
 ”یہ ادھام نہیں ہیں بھائی! حقائق ہیں۔ یہ آنے والے دور کی جھلک ہے۔ اس پر غور کرنا چاہیے۔ ذرا ٹھہر کر سوچنا چاہیے۔“ ہاشمی صاحب نے اپنے مخصوص سنجیدہ اور بردبار انداز میں رائے دی۔
 ”الگ ملک بنانے سے مسلمانوں کی طاقت تقسیم نہیں ہوگی؟ یہاں رہ کر بھی تو الگ الگ خانوں میں بنے ہوئے ہیں۔ ذات برادریاں مسلک، عقیدے، ہر طرح سے خود کو تقسیم کیا ہوا ہے۔ یہاں کون سے طاقت ور ہیں ہم؟ بالادست تو ہندو ہی ہے۔“

”اچھا! تو علیحدہ ملک لے کر آپ یہ تفرقات ختم کریں گے؟ ایک ہو جائیں گے؟“ اعجاز ماموں کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

”کوشش کریں گے میاں! سردست جو مسئلہ ہے مسلمانوں کی بقا کا ہے وجود کا ہے تشویش کا ہے۔ پھر ہمارا تو نعرہ ہی ہے پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ ایک کلمے کی پہنچ کے دانے ہیں ہم جس دنیا آٹھویں ہے۔ یہ تعصب کی پٹن بنا کر دیہیں گے ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن جائیں گے۔“ مظفر چچا کا لہجہ دھیماتا تھا، اعجاز ماموں ذرا تن کر بیٹھ گئے۔
 ”خیالی پلاؤ بنانے سے پیٹ نہیں بھرنا بھائی صاحب! ہوائی قنصوں میں رہائش ممکن نہیں حقائق کو نظر انداز نہ کریں۔ اس خطے پہ ہم نے ہزار برس حکومت کی ہے۔ آگے بھی کر سکتے ہیں۔ آپ علیحدہ ریاست کی بات کر کے مسلمانوں کی طاقت تقسیم کر دیں گے۔ یہاں کے مسلمان بھی برباد ہوں گے اور پاکستان کے مسلمانوں کے لیے بھی تباہی ہوگی۔“
 ”آپ کچھ کر نہیں سکتے تو بددعا میں بھی نہ دیں۔“ مظفر چچا تلخ ہو گئے۔

”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا میں تو اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ مزاج پہ گراں گزرا تو معذرت خواہ ہوں۔“ وہ خفیف ہو گئے۔

سید ہاشمی صاحب خلاف معمول خاموش بیٹھے تھے۔ بظاہر پرسکون چہرے سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اندر ہی اندر کیا جوار بھانا مچل رہا ہے۔

مظفر چچا نے ان پہ نگاہ کی۔

”اسٹیشن چلیے گا کیا؟“

جی ضرور..... ان شاء اللہ۔

۲۰۲۰ء

یائیں باغ میں کھنے درختوں کے اوپر ٹیلا آسمان یوں جھکا ہوا تھا گویا کہ بس ابھی سب کو اپنی آغوش میں لے لے گا۔ یہ ایک قدرے اندر اور خاموش گوشہ تھا۔ یہاں پھولوں کی مہک تھی اور مختلف پرندوں کی بولیاں۔ بے چینی سے ٹپکتے ہوئے فرخ میاں کچھ دیر کے لیے غم گئے اور بڑے درخت سے ٹپک لگالی۔

”ٹھیک کہہ گئے ہیں بڑے بڑے۔ الانظار اشد من الموت (انتظار موت سے زیادہ برا ہے)“
”بڑے تو اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں۔ اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ضمیر نے لتاڑا۔ کل رات ہی بھت آپا نے ایک مختصر مگر جامع گوش مالی کی تھی ان کی.....“

”فرخ اپنی نہیں تو ہماری اور خاندان کی عزت کا بھی کچھ خیال کر لو۔“
”مجھے بالکل خیال ہے آپا، بس تھوڑی سی فکر اپنے دل کی بھی کر لیتا ہوں۔“ اگلا فقرہ اتنی دھیمی آواز میں کیا تھا کہ خود اپنے سوا کوئی اور نہ سن پائے۔

”ویسے یہ خانہ خراب دل انسان کو خوار کرنے میں ماہر ہے۔“ وہاں کھڑے کھڑے فرخ نے اعتراف کیا۔
بھت آپا کے بقول ان کے بھائی کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔

دوستوں کے بقول فرخ میاں میں پارہ بھرا ہوا تھا۔ ہر آن مضطرب، سیماب پا، بے چین و بے قرار جو دل میں سما جائے اسے پورا کرنے کی دھن اور یہ دھن آج یہاں کھڑا کیے ہوئے تھی۔

بھت آپا بے اکثر اسی بات پر ڈانٹ پڑتی تھی۔

”آپ کے اندر صبر نام کی کوئی شے ہے یا نہیں؟“

”جمل بھی کوئی خوبی ہوتی ہے۔ بردباری بھی ایک صفت ہے۔“

”اس عمر میں یہ سب؟“

”آغا جان تک تمہاری حرکتیں اور خیالات اپنا دیے نا۔ بے موت مارے جاؤ گے۔ پتا نہیں کیوں ہر بار ترس آ جاتا ہے۔“

”اب کسی اور کو بھی آ جائے۔“ فرخ نے ایک آہ بھری۔

جوانی کی شوخی دل کے شوق انسان کو کہاں سے کہاں لے آتے ہیں۔

”آپ کو ڈر نہیں لگتا؟“ سعادت نے سوال کیا تھا۔

”کبھی سوچا نہیں اس بارے میں۔“ فرخ نے بڑی معصومیت سے اعتراف کیا تھا۔

اور پھر یکدم ہی وہ چونک پڑے۔

یوں لگا جیسے قدموں کی چاپ سنی ہو۔ کوئی آہٹ محسوس ہوئی ہے۔ ساری حسیات چوکنے لگیں۔ وہ سراپا مجسم سماعت بن گئے۔ مجسم شوق بن گئے۔ اور لگا ہیں اس سمت پہ لگا دیں جہاں سے آہٹ سنائی دی ہوگی۔

☆☆☆

ذہن کمرے میں کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ طلعت آپا سے تو کہہ آئی تھی کہ ممانی کے بلاوے پر وہاں جاری ہے مگر یہاں تک آتے آتے اک دم ہی دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔

بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر مسکرا رہی تھی۔ مگر اس مسکراہٹ کے پیچھے جو قیامت چھپی تھی۔ اس کا اندازہ ذہن کے علاوہ اور کون کر سکتا تھا۔

کل رات ابا جان آئے تھے۔ اس کی طبیعت اور ہال احوال دریافت کرنے، ان کے چہرے پر اپنی شفقت اور لہجے میں اتنی محبت تھی ذہن کو ردنا آ رہا تھا بڑے جتن سے خود پہ قابو پایا تھا۔ مگر اب بار بار کبیر کا خیال آ رہا تھا۔
”اللہ کرے کہ وہ آج آ جائے۔“ دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی۔

”وہ آ بھی جائے تو کیا کر لے گا؟ تقدیر کے تیروں کا رخ موڑ سکتا ہے کیا؟“
 چھیر کھٹ پہ بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے کی رنگت سفید ہونے لگی۔ اندیشوں کے ناگ سرسراتے ہوئے
 جسم و جاں سے لپٹ رہے تھے۔ فاطمہ اندر آ کی بھی کسی کام سے، اس کا چہرہ دیکھ کر چمک گئی۔
 ”ذہین آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“
 ”سر میں درد ہے۔“ ذہین نے بہانا بتایا۔

”صندل لگوا دیں؟“
 ”نہیں نہیں اتنے جتن کی ضرورت نہیں تھوڑی دیر سوئیں گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اچھا تو پھر آپ آرام کریں۔“
 ”ایک کام کرو گی ہمارا؟“ ذہین کو اچانک ہی یاد آیا۔
 ”جی کہیے۔“

”باغیچے میں فیروزہ ممانی انتظار کر رہی ہیں ہمارا ذرا وہاں جا کر اطلاع کر دو انہیں۔“
 ”ضرور بے فکر ہو جائیں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔“ فاطمہ باہر نکل گئی۔ ذہین بیٹھی رہی۔ دل کی بے کلی
 بڑھتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

شام گہری اور سرد تھی۔ مٹی کے لپے پتے جو لہے کے گرد دونوں ماں بیٹی بیٹھی تھیں۔ جلتی لکڑیوں کا کڑوا دھواں فضا
 میں پھیل رہا تھا۔ ساتھ ساتھ گرمائش اور حرارت بھی، بچہ اندر سو رہا تھا۔ جیہا کرم شمال میں خود کو لیٹے ہوئے تھی۔
 بوانے بیسن کی روٹی اور لہسن مرچ کی چٹنی بنائی تھی اگرچہ ایسی چیزیں دن میں بنانی تھیں مگر بیٹی کا دل چاہ
 رہا تھا ابھی کھانے کو پھر آزاد بھی شوقین تھا سو وہ آٹا گوندھ کر روٹی بنانے بیٹھ گئیں۔ چٹنی پہلے ہی پیس کر بکھا رکھا دیا
 تھا۔ مغرب کی اذان سے پہلے پہلے دن کی روشنی میں روٹی ہنڈیا کا کام ختم کر لیتی تھیں۔
 روٹی سینک کر اس پہ اصلی مٹی لگایا۔ چنگیر بیٹی کے آگے رکھ دی ایک کٹوری میں چٹنی ایک میں اچار سرکہ بھی
 گھر کا تھا جو انہوں نے گنے کے پیس سے بنایا تھا۔

جیہا بڑے شوق سے کھا رہی تھی۔

”بہت دنوں سے جی چاہ رہا تھا بیسن کی روٹی چٹنی کھانے کو۔“ اس نے اچار کا چٹخارہ بھرا۔

”دو بجے جی سے ہو تو یہی ہوتا ہے۔“ بوانے دوسرا پیڑہ بنایا اتنے میں آزاد آ گیا۔

”آہا..... بیسن کی روٹی چٹنی۔“ آزاد نے گھستے ہی نعرہ لگایا۔

”ابھی آتے ہوئے راستے میں یہی سوچ رہا تھا کہ بیسن کی روٹی پکواؤں بوا سے۔“ آزاد کی باغیچیں کھلی

ہوئی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا مرتبان جیہا کے آگے رکھا۔

”یہ لو آتا تمہارے لیے سیب کا مربہ بنوایا ہے حکیم صاحب سے کھاؤ اور جان بناؤ۔“

”اندر رکھ دے گھر جانے کی تو لے جائے گی۔“ بوانے ہدایت کی۔

”جب تک یہاں ہو روز کھاؤ، اور اپنے گھر بھی روز کھانا۔“ آزاد نے تاکید کی۔

”یہ تو اک دم ہی بڑا اور ذمے دار ہو گیا ہے۔“ جیہا نے اپنے چھوٹے بھائی پہ فخر کی نگاہ ڈالی۔

آزاد ہاتھ منہ دھو کر آ گیا۔ عموماً مغرب کی نماز پڑھ کر کھانا کھاتا تھا۔ مگر آج بیسن کی روٹی چٹنی نے مغرب

کے پہلے ہی دسترخوان پہ بٹھا دیا۔

”سبحان اللہ بہشت کی نعمت ہے۔“ آزاد رغبت سے کھا رہا تھا۔ لہسن، مرچ، زیرے کا ٹیکھا ذائقہ، اصلی مٹی

کی مہک، سر کے اور اچار کی کھٹاس، مولی کے ٹکڑے واقعی جنت کے ذائقے تھے۔
 امین نانا اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ حسن پور میں موجود دوسرے رشتے داروں سے ملنے گئے تھے۔
 ”کل چند گوشت پکالوں ہیں؟“ بوانے شائقین سے رائے مانگی۔
 ”لوگوں کا پلاؤ بنالینا بوا۔ امین نانا بھی شوق سے کھاتے ہیں۔“
 ”ٹھنڈ ہو رہی ہے خدا جانے چاول کھائیں نہ کھائیں۔“ بوا متذبذب تھیں۔
 ”ان سے پوچھ کے پکالینا۔“ جیانے معاملہ نپٹا دیا۔

☆☆☆

ذہین درتے میں کھڑی تھی۔ پائیں باغ کی سمت جاتی فاطمہ کی پشت اسے دکھائی دے رہی تھی۔ جو چند
 لمحوں بعد نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔
 نگاہوں سے اوجھل بھی زندگی بھی ہو جاتی ہے۔ اسے کہاں ڈھونڈیں۔ گم شدہ راستوں کو کیسے تلاش کریں؟
 خالی الدہنی کی کیفیت میں وہ باہر دیکھ رہی تھی۔
 ”ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ تم یہاں کھڑی خلاؤں میں گھور رہی ہو؟“ طلعت آپا کی آواز اسے دوسری
 دنیا سے واپس بھیج لائی۔

”بھول گئی۔“ ذہین کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔
 ”آج کل تو تم خود کو بھولی بیٹھی ہو۔“ طلعت آپا اس کے ساتھ کھڑے ہو کر درتے سے باہر دیکھنے لگی۔
 جہاں بڑی اچھی دھوپ بکھری ہوئی تھی۔

ذہین خاموش تھی فضا میں پرندوں کی چہکار تھی جو اسے کسی اور ہی دنیا میں لے جا رہی تھیں۔
 ”پرندوں کی آواز سن کر مجھے ہمیشہ تمہارا خیال آتا ہے۔“ کبیر نے ایک بار اس سے کہا تھا۔
 ”کائیں کامیں سن کر!“ ذہین کی نگاہیں ٹپکتی تھیں۔ لہجہ نگاہوں سے نہیں زیادہ ٹپکتا۔
 ”دنیا میں ایک ہی پرندہ ہے کیا؟“

”پھر کسے سن کر میرا خیال آتا ہے؟ غم غموں غم غموں سن کر؟“
 ”تم تو بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتی ہو۔ وہ بچھلایا ذہین ہنسی۔
 ”ذہین۔“ طلعت آپا نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔
 ”جی!“ وہ مڑی ماضی کی ہنسی کی گونج۔ مسکان بن کر اس کے چہرے پہ بکھری تھی۔
 ”شکر ہے تم مسکرائیں تو سہی۔“

”یہ ماضی کی مسکراہٹ ہے۔“ ذہین نے لب بھیج لیے۔
 ”میں نے اس لیے نہیں کہا کہ تم پھر اپنے چہرے پہ بارہ بجالو۔“ طلعت آپا نے اس کا سر پکڑ کر ہلایا۔
 ”کبیر آ رہا ہے۔“ ذہین نے اچانک ہی کہا۔
 ”کبیر؟ یہاں؟“ طلعت آپا بھونچکا رہ گئیں۔
 ”جی یہاں میں نے سوچا آپ کو اطلاع دوں۔“ ذہین کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ بے بسی

تکلیف اور موہوم سی امید۔
 ”اچھا۔“ طلعت آپا نے ایک گہری سی سانس لی۔
 ”پھر ایک خبر میں بھی دے دوں نہیں۔“
 ”کیسی خبر؟“ ذہین کے چہرے پہ استعجاب ابھر آیا۔ طلعت آپا نے چند لمحوں کو سوچا پھر گویا ہوئیں۔

”وہ صاحب زادے یہاں آئے ہوئے ہیں جنہیں تمہارے لیے منتخب کیا گیا ہے۔“
”جی؟“ ذہین کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

☆☆☆

”جی؟ کیا فرمایا؟“ اپنے خیالات میں مگن کبیر ہڑبڑا گیا۔ قبلہ رئیس الزماں نے کچھ کہا تھا مگر کیا کہا تھا؟ وہ بہت تیزی کے ساتھ قیاس کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔
”میں نے کہا میاں، اسٹیشن آنے والا ہے۔ اُترنے کی تیاری کر لیجیے۔“
”جی.....“ کبیر نے ایک گہری سانس لی۔
”میں تیار ہوں۔“

”سامان نہیں لائے اپنے ساتھ؟ زادراہ لیے بغیر ہی چل پڑے؟“
”زادراہ تو ہے مگر دیکھنے والی نگاہوں سے اوجھل ہے۔“ کبیر زریب بڑبڑایا۔
”کسی کی یاد، چند خواب، ہنسی کے جگنو، امید کی تلی بس بھی ساتھ ہیں۔“
اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہر منظر بہت تیزی کے ساتھ نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا یہ دور ہوتے مناظر اشارہ کر رہے تھے کہ اس کی منزل قریب ہے۔
”کیا واقعی؟ منزل قریب ہے؟“ وہ مضطرب ہو گیا۔ یہ زندگی کا عجیب لمحہ تھا۔ منزل قریب آتی بھی محسوس ہو رہی تھی اور دور ہوتی بھی۔

”کیا ہے قسمت میں؟“ وہ یکا یک ہی خوف زدہ ہو گیا۔
رئیس الزماں جھکے ہوئے اپنے سامان میں جانے کیا ٹھول رہے تھے۔ اسٹیشن پر ماموں جان سے سامنا یقینی تھا۔

”وہ کیا کہے گا؟ آخر وہ کیا کہہ سکتا ہے؟“
”اور ماموں..... وہ کیا کہیں گے؟“ وہ سارے خدشات جو وہ راستے بھر سوچتا چلا آیا تھا۔ ایک بار پھر اکٹھے ہو کر اس پر حملہ آور ہو گئے۔
”اتنے پریشان کیوں ہو میاں؟“ رئیس چچا اب سیدھے ہو بیٹھے تھے اور بغور اسے دیکھ رہے تھے۔
”سفر کے آغاز میں پریشان ہوا جاتا ہے اختتام پر نہیں۔“ بڑے بوڑھوں کی طرح وہ مائل بہ نصیحت تھے۔
”اور جب اختتام ہی کسی انجام نے سفر کا آغاز ہو تو انسان کیا کرے؟“
کبیر کھڑکی کے باہر بے مقصد دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

درخت خاموش تھے مگر اتنے بھی نہیں تھے کہ بالکل ہی گونگے بن کر کھڑے ہو جائیں۔ مگر اس وقت آس پاس کے پتے بھی گنگ ہو گئے تھے۔ جیسے فرخ ہو گیا تھا۔
بس ایک دلی دلی سی چیخ فاطمہ کی نکلی تھی۔
فرخ نے اضطرابی کیفیت میں اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گویا اسے خاموش کرنے کی کوشش کی تھی۔
”ڈریں مت ہم کوئی جن بھوت نہیں ہیں۔“ فرخ نے ملائمت سے وضاحت کی۔ مگر فاطمہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ابھی تک اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے سچ کوئی جن بھوت اس کے سامنے کھڑا ہو۔
”مہمان ہیں غلطی سے یہاں آ گئے تھے۔“
فرخ نے مزید صفائی پیش کی مگر فاطمہ نامی مجھے میں نہ کوئی تہدیلی ہوئی نہ کوئی حرکت۔

”ہم معافی چاہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ یونہی مجسمہ بنی رہیں تو سچ مجھ ہمیں خود پہ شک ہونے لگے گا۔“

”ہم جارہے ہیں۔“ فاطمہ کو یکدم ہی ہوش آیا تھا۔

”آپ چاہیں تو بخوشی یہاں تشریف رکھیں جانا تو ہمیں چاہیے اور ہم جارہے ہیں۔“

فاطمہ جھٹکتے سے مڑی اور بھاگنے کے انداز میں وہاں سے گئی۔

فرخ نے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

”گڑبڑ ہو گئی ہے۔ مگر کہیں زیادہ نہ ہو جائے۔ پتا نہیں کون محترمہ ہیں، کہیں کو تو الی نہ بٹھا دیں۔“

☆☆☆

”ہمیں کیا پتا کون تھا؟ مگر خود کو مہمان بتا رہے تھے۔“ فاطمہ کے حواس ابھی تک قابو سے باہر تھے جب وہ

طلعت آ پا اور ذہین کے سامنے بیان کر رہی تھی کہ ممائی کی جگہ ایک نوجوان لڑکے کو دیکھ کر وہ کیسی اور کتنی خوف زدہ ہو گئی تھی۔

”مہمان خانے سے غلطی سے اس طرف کوئی آ گیا ہو گا تم اتنی حواس باختہ کیوں ہو رہی ہو۔“ طلعت آ پا نے تسلی دی۔ ذہین لا تعلق تھی۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ باغ میں فاطمہ کا سامنا کس سے ہوا تھا؟

”بہت ہی باتونی قسم کے تھے بجائے اس کے کہ غلطی کا احساس ہوتے ہی خاموشی سے چلے جاتے وہ تو ہیں کھڑے کھڑے وضاحتیں کرنے لگ گئے۔“ فاطمہ کا دھڑ دھڑ کرتا دل اب ذرا قابو میں آ رہا تھا۔

”تم اندر دیکھو شاید ممائی وہاں ہوں۔ انہیں میرا پیغام دے کر معذرت کر لینا۔“

”جی اچھا۔“ فاطمہ نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

”تم نے نام نہیں پوچھا؟ کون تھے موصوف؟“ طلعت آ پا نے سوال کیا۔

”ہم؟ نام پوچھتے؟“ فاطمہ کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔

”ہم تو خود اتنے گھبرا گئے تھے کہ کیا بتائیں۔ شکر ہے بے ہوش نہیں ہوئے۔“

”ایک تو تم بات بات پر بے ہوش ہونے کے لیے تیار رہتی ہو۔ چوہا نظر آ جائے تو بے ہوش، کتا آگے سے گزر جائے تو بے ہوش، کسی انجانے سے سامنا ہو جائے تو چکرا جاتی ہو۔ اتنی حواس پاختہ کیوں رہتی ہو۔“ طلعت آ پانے اسے تقریباً ڈانٹ ہی دیا۔ انہیں ایسی چھوٹی موٹی لڑکیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ اور خاندان بھر میں انہی کی اکثریت تھی۔

”ہر کوئی تو آپ کی طرح بہادر نہیں ہوتا نا آ پا!“ فاطمہ نے دانتوں کی نمائش کی۔

”ہر لڑکی کو بہادر ہونا چاہیے۔ بات بات پر ہائے اللہ، اوکی اللہ کی گردان اب ختم کر دو تو بہتر ہے۔“

”بڑی دادی جان ٹھیک کہتی ہیں آپ کے متعلق۔“

”کیا؟“

”نئی تانہ کو بگاڑنے والی ہیں طلعت خاتون۔“ فاطمہ نے پو پلے لہجے میں اتنے مزے سے نقل اتاری کہ

ذہین بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکی۔

”تم لوگ لا علاج ہو۔“ طلعت آ پانے جیسے ہار مان لی۔

”آداب عرض ہے۔“

☆☆☆

کپڑے فین روئی بھر کے بوانے صدری تیار کی تھی۔ امین نانا کے لیے تحفہ، ماشاء اللہ کے لیے لیڈی کریپ کا جوڑا اسیا تھا۔ بندو تانی کو دوپٹہ دیا تھا جس کے چاروں طرف کروشے سے چوڑا چوڑا جال بنایا تھا۔

امین نانا اور نانی بھی کبھی خالی ہاتھ نہیں آتے تھے۔ اس بار وہ کھڑی پہ ہاتھوں سے بنا کھیس لائے تھے سفید اور لال خالوں کا گرم کھیس، جو پنجاب کی خاص سوغات تھا ڈھیروں خشک میوہ اور ساتھ وہ اپنائیت، خلوص اور محبت جو اس وقت رشتوں اور لوگوں کے درمیان بہت عام تھے۔

آج گھر میں خاصی چہل پہل تھی، بوا کی بہن اور بھانجی حنیفہ آئی ہوئی تھیں۔ جیا سے اور لاہور والے مہمانوں سے ملاقات کے لیے وہ آج پھر آئی تھیں۔

بچے صحن میں کوڑا جال شاہی کھیل رہے تھے۔ صحن میں پھرتی مرغیاں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتیں۔ جیا کا بیٹا بندوانی کی گود میں تھا۔ انہوں نے بچے کو سامنے لٹایا۔ سرسوں کے نیم گرم تیل سے خوب اچھی طرح مالش کی۔

”روزانہ بچوں کی مالش کرو تو ہاتھ پیر مضبوط ہوتے ہیں۔“ مالش کے بعد بچے کو کچھ دیر کے لیے دھوپ میں لٹا دیا۔

بڑوں کی محفل جی تھی گپ شب ہو رہی تھی۔ ماضی کی یادوں اور باتوں کو دہرایا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ امیر بیگم کے بھائی عمر بھی محفل میں چار چاند لگانے آ گئے۔ ہاتھ میں کپڑے کا تھیلا تھا۔ وہ جیا کے حوالے کیا کیونکہ اور موسمیوں سے بھرا ہوا۔ بہن بھانجی کے گھر بھی خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے۔

محفل کے درمیان موسمیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ باتوں کے ساتھ ساتھ یہ مشغل بھی چلتا رہا۔ کسی نے ماضی کی شان و شوکت کا ذکر چھیڑ دیا۔

برکھوں کی خویلیاں، زمینیں، دروازوں پہ جھولتے ہاتھی، سونا اگلتے کھیتوں میں کام کرتے کارندے۔

”بس اب تو باتیں ہی باتیں رہ گئی ہیں۔“ عمر ماموں نے ایک آہ بھری۔ ”ہاں میاں کبھی ہم بھی یونہی کہانی بن کر رہ جائیں گے۔ ہمارے بچے ان کے بچے ان کہانیوں کو دہرا میں گے۔“ امین نانا نے زندگی کا فلسفہ بیان کیا۔

”کون جانے کل کون کہاں ہو۔“ بندوانی گویا ہوئیں۔ ”پاکستان بننے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ دیکھو کل کیا ہو۔“

”کیا سچ بچ بن رہا ہے پاکستان؟“ امیر بیگم کی بہن نے بھولپن اور سادگی کے ساتھ سوال کیا۔

”نہیں جھوٹ موٹ بن رہا ہے۔ مذاق ہی مذاق میں۔“ بھائی عمر نے جیسے بہن کا مذاق اڑایا۔

”تو کیا ہم سب پاکستان چلے جائیں گے؟ ہیں آپ؟“

”نال بیہوش گڑی ہے، کون جائے گا اپنا گھر بار چھوڑ کے؟“

عمر بھی، قائد اعظم اور مسلم لیگ کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے مگر اپنا گھر گاؤں چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہ تھا ان کا۔ بڑوں کے اندیشوں اور فلسفوں سے بے نیاز بچے صحن میں اپنے کھیل کود میں مگن تھے۔ زندگی کی اس پہیلی سے بے خبر کہ بھی پیدائش کا مقام، زندگی گزارنے کی جگہ اور ابدی قیام گاہ ایک دوسرے سے طویل فاصلے پر ہوتے ہیں اور برصغیر کے لاکھوں عوام زندگی کی اس پہیلی کا حصہ بننے والے تھے۔

☆☆☆

وقت کے تھال سے انتظار کے سارے سکے ایک ایک کر کے گرے چلے گئے، تھال خالی ہو گیا اور ریل گاڑی لکھنؤ چارباغ ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہو گئی۔

مسافر جلدی جلدی اپنے اسباب کے ساتھ ڈبے خالی کر رہے تھے، منزل پہ پہنچنے کی خوشی اکثر چہروں سے عیاں تھی جس نے طویل سفر کی تھکن کو دھندلا دیا تھا۔ شاید کبیر واحد انسان تھا۔ جس کا چہرہ کئی جذبات کا عکس لیے ہوئے تھا۔ خوف، گھبراہٹ اور موہوم سی امید۔

رئیس الزماں کا اسباب قلی نے سر پہ اٹھایا ہوا تھا۔ تیز قدموں سے وہ لوگ چلتے جا رہے تھے۔ سامنے سے عباد الرحمن ٹپکتے ہوئے آرہے تھے۔

”کہاں تھے آپ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔“ معالجے اور علیک سلیک کے بعد عباد الرحمن نے شکوہ کیا۔ ”جہاں ٹرین رکی، وہیں اترے ہیں۔ اسٹیشن سے باہر تو اترنے سے رہے۔“ رئیس الزماں نے ترنت جواب دیا عباد الرحمن سے بے تکلف دوستی تھی ہاشمی صاحب سے یہ بے تکلفی عزت و احترام کے اندر تھی۔

”ہاشمی صاحب؟“

”باہر موٹر میں بیٹھے ہیں۔ طبیعت ذرا ناساز تھی۔ میں نے اصرار کیا کہ آپ یہیں رہیں گے میں اندر جا کر مہمانوں کو لے آؤں گا۔“

”معزز مہمانوں کو۔“ رئیس الزماں صاحب نے گویا صحیح کی بجائے فرمایا۔ عباد الرحمن نے سر تسلیم خم کیا۔

اسی نوک جھونک کے دوران وہ تینوں اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ کبیر خاموش تھا۔ بالکل خاموش جیسے زندگی میں ایک چپ سی ٹھہر گئی تھی۔ موٹر سامنے ہی کھڑی تھی۔ ہاشمی صاحب باہر نکل کر کھڑے تھے۔ رئیس الزماں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اگلے ہی لمحے جب ان کے عقب سے کبیر نمودار ہوا مسکراہٹ کی جگہ استعجاب نے لے لی۔

”کبیر میاں..... آپ؟“

☆☆☆

مہمان خانے میں ایسی گہما گہمی تھی کہ جیسے بارات آ گئی ہو مگر فی الحال تو رشتے داروں کی ایک کھیپ آئی تھی۔ جنہیں بارات کا استقبال کرنا تھا۔

”اس شور شرابے میں تو نہ کچھ کہا جائے گا نہ سنا جائے گا۔ باہر چلیں؟“ فرخ کی سنجیدگی اب بے زاری میں بدل رہی تھی۔

”آ جاؤ۔“ یار غار سہادت نے آمنا و صدقنا کہا اور دونوں ذرا دیر بعد کوشی سے باہر تھے۔ صاف ستھری سڑک کے دونوں طرف درخت ایستادہ تھے، جیسے محافظ جو سڑک کی حفاظت کر رہے ہوں۔ یہاں اکا دکا افراد تھے مگر ایسا ہجوم نہیں تھا جو شاہانہ منزل کے اندر تھا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ کچھ نہیں ہوا۔ انتظار لا حاصل ساری سہی، کاوش بے سود۔“

”یعنی ملاقات نہیں ہو سکی؟“

”جی ملاقات تو نہیں ہوئی ہاں کسی اور سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ایک گھبرائی ہوئی حواس باختہ بی بی مجھے دیکھ کر یوں ڈر گئیں جیسے کسی جن بھوت کو دیکھ لیا ہو۔“

چہل قدمی کرتے ہوئے دونوں کی باتیں جاری تھیں۔

”ناچیز نے پہلے بھی سمجھایا تھا آپ کو، مگر آپ تو پھر آپ ہیں کرنا ہی ہے جو دماغ میں سما جائے۔“

”دل میں..... کرنا وہی ہے جو دل میں سما جائے۔“ فرخ نے گویا صحیح کی۔

”کب سدھریں گے آپ؟“

”ہم ایسے ہی ہیں اور جیسے ہیں۔ ویسے ہی رہنا پسند کریں گے۔“ ایک شان بے نیازی کے ساتھ جواب دیا گیا۔

”یہ روش ٹھیک نہیں کسی روز نقصان اٹھائیں گے۔“ سعادت نے خبردار کیا۔
 ”وہ زندگی ہی کیا جو سود و زیاں کے خوف سے ڈر ڈر کے گزاری جائے۔“
 ”ماشاء اللہ کیا کہنے آپ کے ذریعہ خیالات کے تو پھراب کیا کیجیے گا؟“
 ”کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔ اتنا طویل سفر کر کے یونہی تو نہیں آئے کہ ناکام و نامراد واپس لوٹ جائیں۔“
 فرخ کا لہجہ اٹل تھا۔

”تو..... کیا کریں گے آپ؟ کل بارات ہے۔ دلہن کی رخصتی کے اگلے روز ہمیں بھی رخصت سفر باندھنا ہے۔ اس عجلت اور کم وقت میں کیا ہو سکتا ہے؟“ بھائی سعادت نے بہت پریشان ہو کر دیکھا تھا۔ پھر مزید گویا ہوئے۔

”بہت آپا ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ سرکش گھوڑے کو لگام ڈالنے کے لیے کوئی ماہر شہسوار ہونا چاہیے اور میرا قیاس یہ ہے کہ۔“

”آپ اپنی قیاس آرائیاں چھوڑیں جی اداس ہے۔ کوئی اچھی سی شاعری سنائیں۔“
 ”اداسیوں کے شاعر تو میری نفی میر ہیں۔“
 ”کسی کو بھی سنا دیں بس الفاظ ایسے ہوں کہ دل میں اتر جائیں۔“
 ”بے فکر ہو جائیں ایسا کلام سنائیں گے کہ ہر مصرعے پہ واہ واہ کریں گے آپ۔“ بھائی سعادت نے دعویٰ کیا اور شروع ہو گئے۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
 یہ نمائش سراب کی سی ہے

☆☆☆

دھوپ سارے آنگن میں پھیل گئی تھی۔ مہمان جا چکے تھے۔ لاہور والے مہمان بھی روانہ ہو گئے۔ جیا بھی سرال چلی گئی۔

صبح ناشتے پہ بوا اور آزاد یہی باتیں کر رہے تھے۔ ”گھر کی رونق تو انسانوں کے دم سے ہے۔ سب تھے تو کیسی رونق لگی رہتی تھی۔ شور شرابا ہنگامہ اب دوبارہ خاموشی چھا گئی۔“ بوانے ایک آہ بھری۔
 ”ٹھیک کہہ رہی ہو بوا، گھر میں اک دم سناٹا چھا گیا۔“ آزاد نے پراٹھے کا نوالہ توڑتے ہوئے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”رحمت نانی کہہ رہی تھیں کہ لونڈے کا بیاہ کر دو گھر میں بہو آئے گی تو رونق ہو جائے گی۔“
 ”کون سے لونڈے کا؟“ آزاد اک دم چونک اٹھا۔
 ”یہ لو۔“ بوا انہیں ”کتنے لونڈے ہیں میرے؟ تو ہی ہے بیاہ کے قابل خیر سے چار پیسے بھی کمانے لگا ہے۔“

”ابھی سوچنا بھی نہیں پہلے مجھے کسی قابل تو ہونے دو۔ چار دن حکیم صاحب کے ساتھ رہ کر کوئی حکمت تھوڑی آ جاتی ہے۔ ایک عمرتی ہے۔“

”تو کیا بڑھاپے میں بیاہ کرے گا؟ میں نے تو لڑکی بھی سوچ لی۔“
 ”لڑکی؟ کون لڑکی؟“ آزاد بری طرح کڑبڑا گیا۔ نوالے مقلق میں پھنسنے لگے تھے۔

”گھر کی بچی ہے میری بھانجی۔“
 ”کون حنیفہ؟ میں نہیں کروں گا ابھی کوئی شادی وادی۔“ آزاد بوکھا کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے ہوا ابھی ہاتھ پکڑ کے قاضی کے سامنے کھڑا کر دیں گی۔
 ”اچھا ناشتہ تو ٹھیک سے کر لے۔ میں کون سا ابھی پیغام لے کر جا رہی ہوں۔“
 ”بس میں نے ناشتہ کر لیا۔ میں جا رہا ہوں۔“ آزاد نے پھرتی دکھائی اور فوراً ہی گھر سے باہر اکل گیا۔
 پیچھے بوا ناشتہ سمیٹتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔
 ”ان کے باوا کا تو اس عمر میں بیاہ ہو گیا تھا۔ مگر یہ نئی تانہ؟“ الگ ہی مزاج اور خرمے ہیں ان کے۔“

☆☆☆

کبیر کے کچھ کہنے سے قبل مولا ناریمیں الزماں آگے بڑھ کے گویا ہوئے۔
 ”ارے بھئی یہ باتیں تو راستے میں بھی ہو سکتی ہیں۔ ہم آپ کو ساری تفصیلات بتائے دیتے ہیں۔“
 معاملے اور مصالحت سے فارغ ہو کر سب موٹر میں بیٹھ گئے۔ ہاشمی صاحب اور مولا ناریمیں الزماں آپس کی گفتگو میں مشغول تھے۔ کبیر کے چہرے پہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک غیر محسوس سا تناؤ تھا۔ جو بہت غور کرنے پر ہی نظر آ سکتا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ ہاشمی صاحب گاہے گاہے اس پہ نگاہ ڈالتے مگر ابھی تک باقاعدہ کوئی بات نہیں کی تھی یا شاید ریمیں الزماں نے اب تک موقع نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے سفر کی روداد سنارے تھے۔
 ”میں تو فکر مند تھا کہ اتنے اسباب کے ساتھ سفر کیسے کروں گا۔ اللہ نے ایک فرشتہ بھیج دیا مدد کے لیے کبیر میاں نے بہت خیال رکھا۔“

”نہوں۔“ ہاشمی صاحب نے ہنکارہ بھرا۔
 کبیر نے اب تک ان سے نگاہ نہیں ملائی تھی۔ جرات ہی نہیں ہوئی۔ مگر ہاشمی صاحب نے اسے مخاطب کیا۔
 ”غازی پور کے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟“
 ”جی بہت بہتر ہیں۔“

”کس کے سپرد کر کے آئے ہیں آپ؟“
 ”کامل بھائی اور لڈن بھائی ہیں وہاں۔“
 ”ٹھیک ہے۔ پھر واپسی پر ہمارے ساتھ دلی چلیے گا۔ باقی معاملات وہیں دیکھ لیں گے۔“
 ”جی بہتر۔“ کبیر نے اب تک ان سے نگاہیں ملانے کی جرات نہیں کی تھی۔ تمام راستے وہ سر جھکائے ہی بیٹھا رہا۔

☆☆☆

شاہانہ منزل میں شور شرابا، ہنگامہ اور گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ نئے مہمانوں کی آمد نے شور ہنگامے میں اضافہ تو نہیں کیا مگر ایک پچھل ضرور گئی تھی۔
 مغلانی بوا خود کو کھینچتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ چہرے پہ مایوسی تھی جسے بڑی محنت سے چھپایا ہوا تھا۔ فرخ میاں کی آرزو پوری نہ کر سکنے کا ملال ان کے چہرے پر بھی تھا۔
 ذہین اور طلعت آپا باتیں کر رہی تھیں۔ مغلانی بوا کی آمد پر ان کی آوازیں اور بھی دھیمی ہو گئیں اور ذرا دیر بعد بالکل خاموشی پھر طلعت آپا اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”ہم جا رہے ہیں۔ بعد میں ملاقات ہوگی۔“
 ان کے جانے کے بعد ذہین مغلانی بوا کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کل کے لیے ہمارا جوڑا اور زور نکال دیجیے گا۔“

”ابھی نکال دوں؟“ وہ مستعد ہوئیں۔

”نہیں نہیں اتنی عجلت کی کوئی ضرورت نہیں صبح نکال دیجیے گا۔ اور یہ نورن کہاں ہیں؟ ہمیں کام تھا ان سے، کب سے راہ دیکھ رہے ہیں۔ مگر کوئی خبر خبر ہی نہیں موصوفہ کی۔“ ذہین کے انداز میں خفیف سی جھجھلاہٹ تھی۔

”میں دیکھ کر آتی ہوں اس چھلدا کو۔“ مغلانی بوائے اٹھنے کی کوشش کی مگر ذہین نے روک دیا۔

”آپ رہنے دیں۔ یہیں کہیں ہوں گی محترمہ، آجائیں گی۔ یہاں بھی سہیلیاں بھنڈیلیاں جوڑی ہیں۔ ان ہی کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ آجائے ذرا یہ“ قطامہ“ مغلانی بوائے کے کہنے کی دیر بھی کہ وہ قطامہ سچ سچ حاضر ہوئی۔ چہرے پر جوش و خروش اور انداز میں ایسی بے تابی کہ صبر کرنا مشکل۔

”کہاں تھی؟ اور اب کیا نئی خبر لے کر آئی ہے؟“ مغلانی بوا تو اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گئیں۔

”کبیر بھائی آئے ہیں۔“

”ہیں؟“ مغلانی بوائے کے ہاتھ سے سردہ چھوٹ کر نیچے گر پڑا اور ذہین کے ہونٹ بے آواز ہلے تھے۔

”کبیر.....!“

☆☆☆

”جی جی..... یہ میرے بھانجے ہیں کبیر چغتائی۔“

ہاشمی صاحب کسی سے اس کا تعارف کر رہے تھے۔ اور جب سے وہ آیا تھا یہاں یعنی پچھلے آدھ گھنٹے میں بلا مبالغہ درجنوں افراد سے مل چکا تھا۔

”ارے میاں، اب آرام کرو اتنا لمبا سفر طے کر کے آئے ہو۔ بعد میں ہو جائے گا یہ ملنا ملنا۔“

ایک مہربان نے مشورہ دیا۔ کبیر نے ممنون لگا ہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ واقعی تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اور یہ تھکن جسمانی سے زیادہ ذہنی تھی۔ وہ گاؤں کیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ہاشمی صاحب چلے گئے تھے۔ کہاں گئے تھے۔ کیوں گئے تھے۔ کب آئیں گے۔ کبیر ہر سوال کے جواب سے لاعلم تھا۔

اف..... کبیر نے سہولت سے پیر پھیلا کر آنکھیں موند لیں اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

”وہ یہیں ہے، قریب، بہت قریب۔“ کبیر نے آنکھیں بند کیے کیے ایک خوب صورت احساس کو پوری

شدت کے ساتھ محسوس کرنے کی کوشش کی۔

انک آہٹ ہوئی۔ کبیر نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔

ہاشمی صاحب ایک نوجوان کے ہمراہ کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ کبیر نے جھٹ سے ہیر سمیٹ لیے، بڑوں کی موجودگی میں یوں پیر پھیلا کر بیٹھنا معیوب خیال کیا جاتا ہے۔

”یہ میرے بھانجے ہیں کبیر چغتائی۔“

ہاشمی صاحب نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

”سارے خاندان سے آج ہی تعارف ہوگا۔“ کبیر نے ایک نظر اس خوش شکل اور براعت دار نوجوان کو دیکھا

اور چہرے پر مسکراہٹ سجا کر مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مگر ماموں جان کے اگلے جملے نے اس کے

پرچے اڑا دیے۔

”اور کبیر یہ فرخ ہیں۔ جن سے ذہین کی لبت طے ہوئی ہے۔“

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مسکراہٹ عید

دکھائی دیتیں۔

”شادی سے پہلے چوبیس سال علی بھائی صاحب کی اجازت کے بغیر رہی ہوناں۔“ عدینہ جڑ جاتی۔
دیا مسکرا دیں۔ ”تمہاری بات میں ہی اس بات کا جواب ہے شادی سے پہلے۔“

”تم اپنے لیے کوئی مصروفیت کوئی ایکٹیویٹی ڈھونڈو۔“

”اب پڑھائی کے ساتھ اور کیا ایکٹیویٹی ڈھونڈو؟“

”کوئی اسکل (ہنر) سیکھ لو یا کوکنگ کورس یا بیوٹیشن وغیرہ۔“ دیا آپنی کے پاس وافر مشورے تھے۔
”فائنل کے بعد ہی کچھ کروں گی ایسا۔ یا سر بھی سار اوقت باہر ہوتا ہے دوستوں میں۔ یا رات گئے آتے ہیں۔ اماں اپنے گھٹنوں کا درد بہلاتی رہتی ہیں۔ اور میں میرے پاس بس دو ہی آپشن ہوتے ہیں یا تو پڑھ لو یا تو بور ہو جاؤں۔“ عدینہ روہا سی ہوئی۔

”تمہاری اسٹیڈ بڑھیک جا رہی ہے۔“
”اسٹیڈی تو تھیک ہی جاتی ہے۔“ عدینہ نے برا سامنہ بنایا تب ہی ڈیوری بوائے کی کال آئی۔
عدینہ نے پیزا آرڈر کیا تھا۔

دیا آپنی کی شادی سے پہلے دونوں بہنیں یونہی دوستوں کی طرح رہیں، اکٹھے بازار جاتا، ڈریس ڈائز مننگ کرتیں، کوئی نئی سووی دیکھ لی۔ پرانی دیکھی سوویز یہ بات کر لی ایئر پوڈ لگا کر داک کرتے ہوئے گانے سن لیے۔
دیا آپنی کی شادی نے تو عدینہ کو بہت ہی تنہا اور بور کر دیا تھا۔

☆☆☆

”کاش عیدیں اور تہوار کبھی نہ آیا کریں۔“
عدینہ نے آنکھیں زور سے میچیں دو آنسو پلکوں کی باڑ سے رخساروں پر پھیلے۔ اسے یاد آیا یہ فقرہ اس نے پہلے بھی بار بار سوچا تھا چھٹی عید پر بھی تو سوچا تھا اور وہ اس فقرے سبست حیرت کا دن بن گیا تھا۔ اس نے عربیہ کی کبھی سی پھیلی کھولی جو مہندی سے جچی تھی۔
وہ گہری نیند میں تھی اور عدینہ کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ نیند نہ ہو خواب ہو تب بھی رات بھل ہو جاتی ہے مگر یہاں تو نہ نیند تھی نہ خواب بس یاد ماضی کا عذاب تھا۔ ناکردہ گناہ کی سزا تھی اور محاسبہ بھی۔
وہ کہاں غلط تھی؟ وہ کہاں صحیح ہوتے ہوئے بھی غلط تھی۔

وہ پوری رات سوچ سوچ کر کسی نتیجے پر پہنچی اور نتیجہ پھر اسے سوچ کے سرے تک لے آتا۔ عدینہ سمجھ نہ پائی اسے حیرت زیادہ بھی یاد رکھ۔ اندر ٹھہری بے یقینی جو کسی بھی یقین کے سرے تک نہ پہنچی تھی۔ اور کل پھر عید تھی۔ کاش عیدیں اور تہوار سوچ جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں آٹھہری تھی۔

☆☆☆

دیا آپنی کی شادی کے بعد سے عدینہ خود کو زیادہ ہی تنہا محسوس کرتی خیر اب رہ بھی تنہا ہی گئی تھی۔ اماں تو اسے سوسل ورک، رشتہ مہم اور کسی نہ کسی کے کام آنے میں وقت گزار دیتیں کچی عدینہ تو کانچ کا سارا وقت تو اچھا گزارتا مگر گھر آکر بولائی بولائی پھرئی ایسے میں دیا آپنی ملنے آتیں تو عدینہ کا اصرار بڑھ جاتا کچھ دن رک جائیں ناں۔
”علی رکے کی نہیں اجازت دیتے۔“ وہ بے بس

دیا آپ کی شادی کو سال سے اوپر کا وقت ہو رہا تھا مگر عدینہ کی ابھی تک کوئی دوست نہ بن پائی تھی۔ البتہ اسے مصروفیت مل گئی تھی۔ اس کی کلاس کے جی آر نے میٹرک تک کے بچوں کو ٹیوشن دینے کے لیے اکیڈمی بنائی تھی اور عدینہ کو بھی پڑھانے کی آفر دی تھی، فی الحال تو معاوضہ مناسب سا ہی تھا اگر اکیڈمی چل جاتی یقیناً سرعازم معاوضہ دیتے۔

وہ ٹول سات اساتذہ تھے اکیڈمی کے، عدینہ کی کلاس سے تو ان کا جی آر عازم اور وہ تھے باقی دوسرے ڈیپارٹمنٹس سے عازم کے دوست تھے۔ وہ یونی سے آکر تھوڑا ریٹ کرنی اور پھر اکیڈمی پڑھانے چلی جاتی۔ واپسی پر اماں کے ساتھ کھانے میں ہاتھ بٹا دیتی۔ فائل سمسٹر ہونے کی وجہ سے پڑھائی توجہ مانگتی تھی۔ رات دیر تک وہ پڑھتی رہتی۔ یاد اٹس ایپ گروپ میں اکیڈمی کے معاملات ڈسکس ہوتے رہتے۔ اس بار دیا آپ نے آئیں تو چڑ گئیں۔

”اب تمہارے پاس دو گھڑی بیٹھنے کی بھی فرصت نہیں ہے؟“

”آپ نے ہی کہا تھا مصروفیت ڈھونڈو اب ڈھونڈ لی ناں۔“ عدینہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے مسکرائی تھی۔ ہاتھ میں اکیڈمی کے بچوں کے چیک کرنے والے ٹیسٹ تھے، سامنے لیپ ٹاپ آن تھا، اسائنمنٹس کے پوائنٹس بھی ساتھ ساتھ لکھے جا رہے تھے۔

دیا انھیں اور دونوں کے لیے کافی بنالائیں۔

”اس حالت میں اچھی ہے آپ کے لیے۔“

عدینہ نے سارے ٹیسٹ لیپ ٹاپ ایک طرف رکھ کر دیا آپ کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اس حالت میں تو اور بھی بہت کچھ اچھا نہیں ہوتا جو میں کر رہی ہوں۔“ دیا اداسی سے مسکرائیں۔

”مثلاً؟“ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے عدینہ نے پوچھا۔

”بہت سارے کام۔ ساس سر کی خدمت..... دیورند کے خمرے۔“ کیا بہت کام کرنے پڑتے ہیں آپ کو؟“

”مجھے ہی نہیں سب ہی لڑکیوں۔ آئی مین سب ہی شادی شدہ لڑکیوں کو، عدینہ! شادی کنواری لڑکیوں کے خوابوں اور خواہشوں سے الگ ہی چیز ہوتی ہے۔“

”چیز؟“ عدینہ کھٹکھٹائی۔

”مطلب جیسا ہم شادی سے پہلے سوچ رہے ہوتے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔“

”شادی سے پہلے ہم کیا سوچتے ہیں؟“ عدینہ نے جاننا چاہا۔

”تم مذاق اڑا رہی ہو؟“ دیا مٹھوک ہوئیں۔

”نہیں میں صرف جاننا چاہتی ہوں ظاہر ہے ہر کوئی الگ الگ سوچتا ہو گا نا“ اس نے تاویل دی۔

”شادی کا کنسپٹ سب لڑکیوں کے دلوں میں یہی ہوتا ہے کہ گھو میں پھریں گے، نت نئے کپڑے پہنیں گے۔“ گفتش ملیں گے۔ لانگ ڈرائیو، ہاتھوں میں ہاتھ دے کر واک، رات گئے تک باتیں۔ اپنی مرضی..... مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شادی اپنی ”میں“ کی مرگ ہوتی ہے۔“

”آپ اتنی مایوس ہیں۔“ عدینہ نے ان کے ہاتھ تھامے۔

”مایوس نہیں ہوں۔ حقیقت کا سامنا کر رہی ہوں۔“ دیا آپ نے سچ بولا۔

”تو کیا یہ حقیقت سچ ہے۔“

”سچ تو نہیں کہہ سکتے البتہ مشکل ضرور ہے۔ زندگی کو صفر سے شروع کرنا مشکل ہی لگے گا۔“

”اور میری بہادر عقل مند، سکھڑ سمجھ دار بہن یقیناً جلد ہی اس مشکل پر قابو پا لے گی۔“

”جی بالکل..... بس تمہارے لیے ایک نصیحت ہے۔“

”وہ کیا؟“

”اپنی خواہشیں، خواب، ساتھ ساتھ پورے کرتی رہو۔ شادی کے بعد یہ کچھ نہ چھوڑنا۔“

”اوکے جی۔ آپ کی نصیحت پلو سے باندھ لی ہے۔“ عدینہ نے دوپٹے کو گرہ لگائی۔ دونوں کھٹکھٹائیں۔

☆☆☆

سب کے فائلو اسٹارٹ ہو رہے تھے۔ عازم نے کہا تھا آپس میں ایسے بیچ کر لو کہ کسی کا بھی حرج نہ ہو۔

آمنہ اور عقیقہ نے آپس میں کر لیا تھا۔ واصف اور اور عتیق نے آپس میں بیچ کر لیا تھا۔

اب پیچھے عازم، عدینہ اور صفی بچے تھے عازم اور عدینہ ایک ڈیپارٹمنٹ، ایک ہی کلاس میں ہونے کے سبب آپس میں تعاون تو کر نہ سکتے تھے۔ سو عدینہ صفی کے پاس جا پہنچی تھی۔

”چار دن میرے لیے اکیڈمی آنا پابل نہ ہوگا۔ آپ پچیس بڑھادیں گے؟“ عدینہ ڈیٹ شیٹ کو مارک کر کے لائی تھی۔

”زیادہ ایڈیٹ نہیں ہے میں ایگزامز کے ساتھ اکیڈمی بیچ کر لوں گا۔“ صفی نے کہا۔

”آپ بتا دیجیے جن دنوں نہیں آ سکتے؟“ عدینہ کو ایسے اچھا نہ لگا کہ وہ اس کی جگہ چار دن پڑھائے اور عدینہ اس کے کسی بھی کام ہی نہ آ سکے۔

”ارے نہیں میں نے کہا ناں میں بیچ کر لوں گا بس ایگزامز کے بعد میرا ایک ٹیسٹ ہے شاید اسلام آباد جانا پڑے ان دنوں آپ دیکھ لیں۔“

”اوکے تھینک یو۔ ویسے ٹیسٹ کس سلسلے میں ہے؟“ اٹھتے ہوئے عدینہ نے یونہی پوچھا۔

”باہر کی یونیورسٹی میں اسکالرشپ کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے اسی سلسلے میں ہے۔“

”اللہ کریم آپ کو کامیاب کرے۔“ دعا دیتی عدینہ باہر نکلی۔

”یہ یاسر بھی بہت ہی لاپرواہ ہے۔“ یونی گیٹ کے باہر کھڑی عدینہ بڑبڑائی۔

اچھی بھلی وہ اوپر کروا کے چلی جایا کرتی تھی جب سے بابا نے یاسر کی ڈیوٹی لگائی تھی اسے

یونیورسٹی سے پک کرنے کی، اچھا خاصا تنگ ہو رہی تھی کبھی بھی وہ وقت پر موجود نہ ہوتا۔

کافی دیر انتظار کے بعد اس نے یاسر کو کال کی تھی وہ جہاں تھا۔ اس تک آنے میں ایک گھنٹہ لگا۔

عدینہ نے اوپر کروانے کا کہہ کر اسے آنے سے منع

کر دیا۔ دماغ اتنا گرم ہوا کہ بجائے کوئی رائڈ لینے کے وہ پیدل ہی چل پڑی۔

”آ میں میں چھوڑ دیتا ہوں؟“ صفی نے اس کے پاس ہانک روکی۔

”کوئی بات نہیں، چلی جاؤں گی۔“ عدینہ نے اپنے لہجے کو گرم ہونے سے روکا۔

”میں بھی اکیڈمی ہی جا رہا ہوں۔ آجایے۔“ صفی کے اصرار پر عدینہ سمٹ کر اس کے پیچھے بیٹھی۔ آج یاسر کو

تو خواب ڈانٹ بڑھاؤں گی۔ دل ہی دل میں وہ مہم ارادے باندھ رہی تھی۔ میٹرک کلاس کے ایگزامز قریب تھے سو وہ سب یونیورسٹی سے سیدھا اکیڈمی آ رہے تھے۔

☆☆☆

یونیورسٹی سے فارغ ہوتے ہی عدینہ نے کوئٹہ کلاسز میں ایڈمیشن لے لیا بابا تو خوب ہی خوش ہو گئے تھے۔ روزنت نئے کھانے کھانے کو ملتے۔

اماں البتہ ہوتی رہتیں۔ عدینہ اتنی مہنگی چیزیں؟؟ یاسر ہر چار دن بعد دوستوں کو گھر کھانے پر بلانے لگا تھا۔

”اب عدینہ کل کوئی رشتہ وغیرہ دیکھیں۔ پڑھائی مکمل ہو گئی ہے۔ سکھڑا پا سیکھ رہی ہے۔“ رات اماں نے بابا سے کہا۔

”اتنی بھی کیا جلدی ہے یاسر کسی کام دھندے سے لگے تو دونوں کا اکٹھا ہی کر دیں گے؟“

”یاسر تو مرد ذات ہے اس کا کیا مسئلہ عدینہ کی یہی مناسب عمر ہے میں دیا کو کال کر لی ہوں۔ رشتے والی کو بھی

باناں ابوں آپ بھی اپنے حلقہ احباب میں دیکھیں۔“

”چلیں پھر جیسے اور جہاں نصیب ہوا۔“ رات دیا آئی آپس میں تو کھانا کھا کر بہت ہی خوش ہوئیں۔

”عدینہ یہ سب وہ کھانے تھے جو ڈیل یوز میں دیکھتے تھے اور اب کھا رہی ہوں ماشاء اللہ بہت ہی

ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں۔“

”بس آپ کچھ اچھا بتانے کا شوق تھا۔ کچھ کوشش اور کچھ پیسے جو گیس کی صورت اور اجزا کی

صورت لگ رہی ہے۔
 ”کتنی دیر کا رہ گیا ہے کورس؟“ دونوں بیلہ پہ
 آنے سامنے بیٹھی تھیں۔

”نیکسٹ ویک ٹیسٹ ہے پھر سٹوڈنٹس مل
 جائے گا۔“

”اکیڈمی بھی جارہی ہو؟“

”نہیں۔ چھوڑ دی گئی۔“

”اچھا کیا..... اب تم اپنے گھر جانے کی تیاری
 پکڑو۔“ دیا نے بتایا۔

”اپنا گھر؟“

”جی اپنا گھر جس کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا
 ہے۔“ دیا آپلی نے چھیڑا تو عدینہ بھی ہنس دی۔

”بابا اماں نے مجھے بھی تمہاری رشتہ ڈھونڈ وہم
 میں شامل کیا ہوا ہے۔ اب یہ نیا پار لگے ہی لگے۔“

”آپ تو شادی کے اتنا خلاف ہیں پھر بھی
 میری کروا رہی ہیں۔“

”خلاف تو خیر میں نہیں ہوں۔“

”جی خلاف نہیں ہیں پر ایسا کرتی ہیں۔“

”برائیاں بھی نہیں کرتی ہوں۔ بس یہ کہتی ہوں
 لڑکیاں جو شادی کے بارے میں سوچتی ہیں دیا کچھ
 نہیں ہوتا۔“

”تو شادی درحقیقت ہے کیا؟“

”شادی کا دوسرا نام ذمہ داری ہے اور ذمہ
 داری جب اٹھائی جاتی ہے تب اصل پتا لگتا ہے ذمہ
 داری ہوتی کیا ہے؟“

”پھر تو مجھے بھی لگ پتا جائے گا۔“ عدینہ نے دیا
 آپلی کی گود میں سر رکھتے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔

”ہالک۔“ دیا آپلی بھی کھلکھلائی۔

☆ ☆ ☆

خوب صورت منالی رنگ کے سلک کے ڈریس میں
 عدینہ خوب ہی بچ رہی تھی۔ آج اس کی بات بچی کی رسم
 تھی۔ رہائی کلائی ہونے والی رکیں، ٹو میک اپ لک کے
 ساتھ کرن لگے دوپٹوں پہ تحریر کی صورت اٹھ رہی تھیں۔

شریلی سی مسکان کے ساتھ وہ سب کے بچ
 کے ساتھ

بیٹھی تھی۔ گھر کے سب سے چھوٹے اور اڈالے بیٹے
 ہونے کی وجہ سے مہاس کی ہرزم میں سب بڑے چڑھ
 کر حصہ لے رہے تھے۔ مہاس کا ایک بڑا بھائی
 بھابھی تھے جو الگ رہتے تھے۔ تین شادی شدہ بہنیں
 تھیں اور والد والدہ بھی۔ ابھی اس کی شادی کی لائٹ
 ڈنکس ہو رہی تھی اور مہاس کے علاوہ سب موجود تھے۔
 سب کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

عدینہ نے کن اکھیوں سے دیا آپلی کی طرف
 دیکھا وہ اس کی طرف آئیں۔“

”میں جاؤں؟“ اس نے اشارے سے پوچھا۔

”بیٹھی تجھے وصول رہی ہو اور کیا چاہیے؟“ دیا
 آپلی نے سرکوشی کی۔

عدینہ کے ہونٹ پھیلے چھوٹے بڑے سب اس
 کے لیے گفٹس لے کر آئے ہوئے تھے۔ دو تندیں

مختلف شہروں سے آئی ہوئی تھیں جب کہ ایک ان ہی
 کے شہر میں رہتی تھیں۔ وہ اکیلی ہی تھیں بچے میاں

نہیں ساتھ آئے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے جانے
 کے لیے بھی وہی اٹھی تھیں پھر سب کھڑے ہوئے اور

رخصت کی اجازت لینے لگے۔

ان کے جانے کے بعد عدینہ نے سب سے
 پہلے تو سیٹ کا دوپٹا اتارا پھر سامنے رکھے تحائف اور

فروٹ مٹھائی کی ٹوکریوں کو دیکھا۔

”یہ سب کون کرے گا؟“ سب پھیلاوے کی
 طرف دیکھتے اس نے دیا آپلی کو دیکھا۔

”ظاہر سی بات ہے جس کے لیے یہ سب
 آیا ہے۔“ کندھے اچکاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

”میں تو پہلے ہی بہت تھک چکی ہوں۔“

”فارغ بیٹھ بیٹھ کے۔“

”نئے کپڑے، میک اپ اور مصنوعی پن
 کر کے؟“ وہ صوفے پر ڈھیر ہوئی۔

”تمہاری یہ حالت اور کلام، مہاس کو بھی جیتی
 ہوں۔“ دیا آپلی نے کیرہ آن کیا۔

”نہیں نہیں، عدینہ فوراً اٹھی اور دبا مسکرا دی۔

”تمہاری جیٹھائی مجھے تھوڑی تیز لگی ہے۔“ دیا

”ہاں ذرا صفی کو بلاؤ۔ وہی تم اٹھو یہاں سے۔“
 بڑی آپا کی آواز آئی۔

”کیوں بھی میری بھی تو ممانی ہے میں بھی
 بارات کے ساتھ گیا تھا، مجھے بھی دو منٹ بیٹھ لینے
 دیا جائے۔“

”بارات کے ساتھ ہم بھی گئے تھے۔ تم ایسے
 اترارہے ہو جیسے دولہا کی گاڑی چلا رہے تھے۔“
 جواب دینا تو گویا ہر کسی پر فرض تھا۔

”صفی آگیا۔ ممانی کا پرس ہٹا ہوگا۔“ کمرے
 کے ایک کونے سے تان اٹھی تھی۔

”یہ دلہن اتنی چانی پہچانی سی کیوں لگ رہی
 ہیں۔“ کوئی اس کے قریب بیٹھا عدینہ نے نگاہیں
 اٹھائیں اور مسکرائی یہ تو صفی تھا۔

”ارے یہ تو عدینہ ہیں۔ ہم اکٹھے اکیڈمی میں
 پڑھاتے رہے ہیں۔“ صفی اوچی آواز میں بولا۔

”تمہاری کلاس فیلو ہے؟“
 ”صفی بھائی آپ کی دوست ہیں کیا؟“

”تمہارے ڈیپارٹمنٹ کی ہیں؟“ کتنے
 سالوں سے جانتے ہو؟“ بھانت بھانت کی بولیاں۔

”عازم کی اکیڈمی میں تین ماہ اکٹھے پڑھاتے
 رہیں میں اور عدینہ۔“

”عدینہ..... ممانی بولو۔“ شازمہ بھابی نے
 ٹوکا۔

”میں تو عدینہ ہی کہوں گا۔“ صفی نے ہاتھ
 اٹھا کر علی الاعلان کہا۔

”عدینہ کوئی اور ہوتا تو میں اپنی ڈیماڈ بتاتا مگر
 آپ چونکہ عدینہ ہیں تو اس رسم کے جتنے بھی عنایت
 کر دیں گی میں شکر گزار رہوں گا۔“

صفی اس کے کھٹنوں پر ہاتھ رکھے سر جھکائے
 نہایت ادب سے گوش گزار تھا۔ عدینہ نے سچ کھولا اور

دو پانچ پانچ ہزار کے نوٹ منشی میں نکال کے اس کی
 منشی میں منتقل کیے صفی نے کسی راز کی طرح پکڑے۔

ذرا سی انگلیاں کھول کے دیکھا دونوں ہاتھ باندھ کے
 آداب بجالایا۔

آپا نے تبصرہ کیا۔
 ”اس دور میں بھولا کون ہے؟“ عدینہ سارے

گفتگوں اکٹھے کرنے لگی۔
 ”چھوٹی مند تو بڑی لاڈورانی بن رہی تھی۔ امی

زویا کو دیکھیے گا۔ ابو زیان کو پکڑ لیں اور خود میاں
 صاحب کے ساتھ سیلفیاں۔“ دیا نے آواز باریک

نکال کر اس کی نقل اتاری۔
 ”چھوڑیں آپا! وقت سے پہلے کیا گمان

رکھنا۔“ عدینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”وقت سے پہلے گمان کر لیں تو بہتی ناؤ کو بچایا

بھی جاسکتا ہے۔“
 ”استغفر اللہ آپا۔“ عدینہ نے افسوس سے

کانوں کو ہاتھ لگائے۔
 ”میں جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہوں مجھے

اندازہ ہے ان سسرالی رشتہ دار یوں کا۔“
 ”میرا بہر حال جوائنٹ فیملی تو نہیں ہے صرف انکل،

آئی ہوں گے، ساتھ آئی کافی ایکٹو لگ رہی ہیں۔“
 ”آئیاں ایکٹیو ہی ہوتی ہیں، بہو آنے کے بعد ان

کے جوڑ دکنے لگتے ہیں۔“ دیا نے بے لاگ تبصرہ کیا۔
 ”شرم کریں آپا۔ ہماری اماں کے بارے میں

بھی کوئی ایسا ہی سوچتا ہوگا پھر۔“ عدینہ نے گفتگو
 کے ڈبے اٹھائے اور کمرے میں رکھنے لگی۔

دیا آپا بھی انھیں اور اس کی مدد کروانے لگیں۔
 ☆☆☆

عدینہ کو اس کی چھوٹی مند فارینہ اور جیٹانی شازمہ
 نے جملہ عروسی میں لا کر بٹھایا تھا۔ جملہ عروسی حقیقتاً جملہ

عروسی تھا سرخ جالی اور گلابوں سے خوب صورتی سے سجا
 ہوا پھولوں کے اوپر سنہری جتاں جلتی تھیں۔

ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ کمرے میں بہت سے
 لوگوں نے دھاوا بول دیا۔

چھوٹے بڑے سب کسی کے ہاتھ میں موہاں تھا
 کمرے آن تھے۔ مختلف پوز کے لیے ہدایات جاری تھیں۔

”آپا گود بٹھائی کی رسم بھی کر لیں پھر عدینہ کو
 ریٹ کرنے دیتے ہیں؟“ شازمہ بھابی نے کہا۔

”کتنے دے؟ کتنے ملے؟“ ایک شوراٹھا تھا مگر وہ ہاتھ ماتھے پر رکھے باہر نکل گیا تھا۔

شازمہ بھابھی نے فروٹ باسکٹ ٹیبل پر رکھی اور سارے بچوں کو باہر نکالا۔

”میں عباس کو بھیجتی ہوں۔“ سارے بچوں بڑوں کو نکالتی وہ باہر نکلیں باہر ایک شور مچا ہوا تھا۔

عدینہ نے ٹھیک ہو کر بیٹھتے کمرے کا از سر نو جائزہ لیا۔ عباس اندر آیا۔ شیر والی اتار کر صوفے پر رکھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہوا۔

”سب سے تعارف ہو گیا ہوگا آپ کا؟“

”جی۔“ عدینہ نے سر بھی ہلایا۔

”یہ بچے کیا ذکر کر رہے تھے صفی اور تم کلاس فیلو رہے ہو؟“ انداز نارمل تھا۔

”ہم اکیڈمی میں اکٹھے پڑھاتے رہے ہیں تین ماہ تک۔“

”مجھ سے صرف پانچ سال چھوٹا ہے۔ صفی۔“

عباس مسکراتے ہوئے بیڈ پر آ کر بیٹھا۔

”تم تو اتنے شور شرابے کی عادی نہیں ہوگی؟“

عباس کا اشارہ باہر لاؤنج سے آتے شور کی طرف تھا۔

”نہیں.....“ اس نے سر ہلایا۔ ”لیکن بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ ساتھ ہی اضافہ کیا۔

”یہ.....“ عباس نے سیاہ ویلوٹ کیس کھولا۔

”آپ کی رونمائی۔“

عدینہ نے دیکھا گولڈ کا بریسلٹ تھا۔ خود عباس آپ اور تم کے بیچ پھنسا ہوا تھا۔

عدینہ نے داہنا بازو آگے کیا۔

”بچہ پارٹی کہہ رہی تھی منہ دھلوا کے منہ دکھائی دیتا۔“ عباس بریسلٹ پہناتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

عدینہ مسکرا دی۔

شازمہ بھابھی اپنی پلیٹ ہاتھ میں لیے ٹہل رہی تھیں۔

”شمینہ آئی، پوری اور دوں؟“

”روزینہ آئی براٹھا چائے کے ساتھ کیوں کھا رہی ہیں۔“ پلیٹ لیجیے ناں۔“

”قارینہ..... موسیٰ کو مجھے پکڑا دیں۔ آپ اچھی طرح ناشتا کریں۔“

”امی جی! ابو جی کچھ اور چاہیے؟“

”عدینہ! یہ پلیٹ لیجیے۔“ صفی کے کہنے پر کئی گردنیں مڑی تھیں۔

”لے لیجیے عدینہ ممانی! صفی بھائی نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔“ روزینہ آئی کی بیٹی آیت بولی تھی۔

”ضرورت پڑنے پر اپنے ہاتھوں سے بھی بنالوں کا تمہاری طرح کھٹو ٹھوڑی ہوں۔“ صفی نے منہ چڑایا تھا۔

”شازمہ بھابھی! آپ عدینہ کو پارلر لے جائیں گی؟“ روزینہ آئی نے پوچھا۔

”لے جانی میری طرف سے تو انکار نہیں ہے لیکن اپنے بھائی جان کا کہیں پتا ہے۔ بچوں کی طرح ہر چیز ان کے آگے رکھنا ہوتی ہے پھر قاطعہ کو بھی رات بخار ہو گیا بہت چڑ چڑی ہو رہی ہے اسی لیے تو اٹھایا نہیں اسے ناشتے کے لیے بھی۔“

”قارینہ کا موسیٰ گود سے اترے تو اسے کوئی کام کہیں۔“ روزینہ آئی بولیں۔

”لے دے کر شمینہ باجی آپ ہی بچتی ہیں۔ صفی تم اپنے ماموں اور ممانی کو پارلر چھوڑ آنا۔ میں ان بچیوں کے ساتھ مل کر گھر سمیٹتی ہوں۔“ قارینہ تم اور شازمہ بھابھی میڈ سے چکن صاف کروادینا۔ امی ابو اپنے کمرے میں چلے جائیں گے بچہ پارٹی اوپر چلے جانا۔“ روزینہ نے سب میں ان کی ڈیوٹیز بانٹیں۔

”اوپر اللہ میاں پاس؟ آیت کی زبان پھسل گئی۔“

”اوپر والے پوسٹن میں۔“ روزینہ نے بیٹی کو کھورا۔

عدینہ نے مسکراتے ہوئے سب کو دیکھا۔ تقریباً سب ناشتا کر چکے تھے۔ وہ بھی عباس کے ہمراہ اپنے

ناشتے پہ خوب ہی گہما گہمی تھی۔ چار میز پر جوڑ کر ایک بڑے ڈائننگ ٹیبل کی شکل دے دی گئی تھی۔

چھوٹے بڑے سب ہی موجود تھے اور خوب ہی انجوائے کر رہے تھے۔

بیڈروم میں آئی۔
 ”لاڑکیاں جوائنٹ فیملی سسٹم سے بہت گھبراتی ہیں
 لیکن تم دیکھو، حرا بھی تو جوائنٹ فیملی میں ہی آتا ہے۔“
 صوفے پر عدینہ کے سامنے بیٹھتا عباس کہہ رہا تھا۔
 ”اس میں تو کوئی شک نہیں۔“
 ”دو تین روز تک سب چلے جائیں گے پھر تم
 میں اور امی ابو ہی رہ جائیں گے۔“ عباس کو سب کے
 جانے کی اداسی ابھی سے ہونا شروع ہو گئی تھی۔
 ”بہت دور تو کوئی بھی نہیں رہتا۔ آتے جاتے
 ہی رہیں گے۔“ عدینہ نے تسلی دی۔
 ”ہاں یہ بھی ہے۔ تم ریٹ کر لو تھوڑی دیر میں
 ذرا باہر کے انتظامات دیکھ لوں۔“
 عباس اٹھا اور باہر چلا گیا۔

☆☆☆

دیا آپنی کی کچھ کچھ باتیں عدینہ کی اب سمجھ میں
 آرہی تھیں۔ شادی سے پہلے وہ یہی سب کام اپنی
 مرضی اور خوشی سے کرتی تھی اب ذمہ داری سے کرنے
 پڑ رہے تھے۔ اسے ایک اچھی جا ب آفر ہوئی تھی۔
 عباس سے مشورے کے بعد اس نے آفس جوائن
 کر لیا تھا۔ صفی کے آفس میں ہی ایک پوسٹ خالی تھی۔
 اسی نے اس کو سی دی بھجوانے کا مشورہ دیا تھا۔ بطور تجربہ
 اس نے آفس جوائن کر لیا۔ ٹیکسٹ اچھا تھا۔ صفی باہر جانے
 کی تنگ دود میں تھا، آفس کے بعد یونیورسٹی چلا جاتا اس
 کی زندگی اچھی خاصی مصروف تھی۔
 مصروف تو عدینہ بھی بہت تھی۔

صبح کوشش کے باوجود لیٹ ہو جاتی۔ رات کو
 سوتے سوتے ہی بارہ ایک بج جاتے جس کی وجہ سے صبح
 لیٹ ہی آنکھ کھلتی امی ابو کو ناشتا بنانے کے دینا ہوتا۔ عباس کو
 آفس کے لیے ریڈی کرنا ہوتا خود کی تیاری۔ ناشتا اور
 بیڈروم کی صفائی، عدینہ اور عباس کا آفس مختلف سائیڈ پر
 تھا سو عدینہ نے آفس کے لیے وین لگوائی ہوئی تھی۔
 وین کا ہارن بجتے ہی وہ بھاگ بھاگ باہر نکلتی۔

میڈ سب کام کر کے امی ابو کو ہلکا پھلکا کچھ
 بنا دیتی۔ عدینہ آتے ہی پیچ کر لی اور سیدھا کچن میں

تھکتی۔ جب تک کھانا تیار کرتی عباس بھی آ جاتا کھانا
 کھانے کے بعد وہ تھوڑی دیر ریٹ کرتی، کبھی عباس
 واک یا اسٹریٹ فوڈ کی آفر کر دیتا۔
 ”آج نہیں، بہت تھک گئی ہوں۔“ عدینہ کبھی
 چلی جاتی اور کبھی انکار کر دیتی۔
 عباس اس ویک اینڈ امی کی طرف چلتے ہیں۔
 کپڑے پر لیس کرتی عدینہ نے کہا۔
 ”خیریت ہے؟“

”خیریت ہی ہے، بہت دن ہو گئے۔“
 ”ٹیکسٹ ویک اینڈ چلیں گے۔“ عباس
 منوبائل میں کم مصروف انداز میں گویا ہوا۔
 ”اس ویک اینڈ کیا ہے؟“

”امی بتا رہی تھیں اس ویک اینڈ ریاض بھائی
 بھابھی آئیں گے شاید کوئی ایک آدھ باجی بھی، تو ادھر
 بھی خوب رونق ہوگی تو مزہ آئے گا۔“

”اچھا۔“ عدینہ نے ڈھیلے سے انداز سے کہا۔
 کہہ نہ سکی مجھے تو اپنے اماں بابا کے گھر کی رونق مزہ
 دے گی، یہاں تو ذمہ داریاں ہی ہوں گی۔

بھتیجے کی شام عدینہ نے اپنی طرف سے کھانا
 بنالیا تھا مگر شازمہ بھابھی نے آنے سے پہلے ہی
 رشین سلاڈ کی فرمائش کر دی تھی۔

عدینہ کچن میں تھیں ابھی سلاڈ اختتامی مراحل
 میں ہی تھا جب وہ لوگ آ پہنچے تھے۔ عدینہ اپنے
 کمرے کی جانب بھاگی اس نے گھر والے رف
 کپڑے ہی پہنے ہوئے تھے۔ تیار ہو کے وہ سیدھی امی
 ابو کے کمرے میں ان سے ملنے آئی تھی۔

”عدینہ! یہ تمہارے لیے۔“ شازمہ بھابھی
 نے ایک ٹیکٹ آگے کیا۔

”یہ کیا ہے؟“ عدینہ نے تھامتے ہوئے
 پوچھا تھا۔

”میرے بھائی کی پوسٹنگ ہے چکوال میں۔
 وہ ریوڑیاں لے کر آئے تھے میں ابو کے لیے لائی تھی
 ساتھ میں تمہارا اور عباس کا حصہ بھی ہے۔“
 ”تھینک یو بھابھی! کھانا لگائی ہوں۔“

”جگ جگ چو شازمہ! موکی سو غاتیں
تہمارے ہاتھوں ہی چمکتے ہیں۔“ وہ واپس نکل رہی
تھی جب امی کی آواز کانوں میں پڑی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تھا۔ خوش
مکھیوں کی آوازیں مچن تک آرہی تھیں۔ عدینہ برتنوں
کا ڈھیر دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی کل میڈ کی چھٹی
تھی اور اس کو یہ سب دھونا تھا۔ ویک اینڈ تو مصروف
تھا ہی سنڈے بھی مصروف ترین ہونے والا تھا۔

”اور سنائیں کوئی سین شروع ہوا؟“ صفی کے
کپ پکڑنے کے بعد راز دارانہ مگر اونچی آواز میں
پوچھا تھا عدینہ کا دل دھک سے رہ گیا وہ سب کے سب
کس سین کی بات کر رہا تھا؟

”کیا سین؟“ عدینہ نے لہجے کی لرزش پہ قابو
پایا سب ہی متوجہ تھے۔

”لڑائی والا سین، ساس بہو، چچا شازمہ؟“
”جہنم مایوسی ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔“
عباس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دراصل آپ صحیح کردار نہیں نبھا رہے۔ نہ
بیوی کے پیچھے لگتے ہیں نہ ماں کی باتوں میں آتے
ہیں چہ چہ چہ.....“ صفی نے اکسایا۔

”جہنم میں اس سب سے کیا ملے گا؟“ نانی نے
ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔

”کبھی صلح کروانے آئیں ہم، کبھی نانی کی سینیں
کبھی عدینہ کو حق بجانب کہیں۔“ صفی نے مقصد بتایا۔

”یہ تو تمہارا خواب ہی رہے گا۔ دن بھر تو عدینہ
جواب پہ ہوتی ہے۔ شام میں کام کرے یا لڑائی؟“
شازمہ نے کہا تھا۔

”ویسے عدینہ! آپ لوگوں کی اگر آپس میں
نہیں بنتی تو سید حاصل ہے۔“ صفی نے آفر کی۔

”ویسے ہماری آپس میں اچھی خاصی بن رہی
ہے لیکن تم پھر بھی حل بتاؤ۔“ عباس نے پوچھا۔

”لاؤج میں دیوار بھی نہیں کرنا پڑے گی بس
آپ لوگوں نے اپنے بیٹہ کو پچھلے مچن کی جانب کھولنا
ہے اور پورشن علیحدہ ہو جانا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے.....“ عباس نے سر ہلایا۔
”حل موجود ہے اور مسئلہ ہے ہی نہیں۔“
شازمہ بھابھی ہنسی تھیں۔ تائید میں سب نے سر ہلائے
تھے۔

☆☆☆

رمضان میں روٹین بہت اچھی رہی تھی۔ صبح
سحری کروانے کے بعد پڑھتی اور پھر آفس کی تیاری
میں لگ جاتی۔ آفس کی ٹانگلو بھی کم ہو گئی تھیں۔
واپسی پر ایک دو گھنٹے ریٹ کرتی اور پھر افطار کی
تیاری شروع کر دیتی۔

”ایسی روٹین سوکھی افطاری کا تو مزہ ہی نہیں
آتا۔ سب لوگ ہوں تو برکت ہوتی ہے۔ اس جمعے کو
روزینہ فارینہ کو افطاری پر بلا لیتے ہیں۔“ عدینہ کی
ساس فرزانہ نے سب کو تائیدی انداز سے دیکھا ان کا
لہجہ مشورہ لینے والا نہیں بلکہ فیصلہ کن تھا۔

”جی امی!“ عباس نے عدینہ سے نگاہیں
چراتے کہا تھا۔

عباس تراویح پڑھ کر آیا تو عدینہ بیڈ سے فیک
لگائے بیٹھی تھی۔ عباس بھی دوسرے طرف آکر بیٹھا۔
”تم میڈ سے کہنا، اپنی بی بی کو لے آئے۔ کنگ
وغیرہ وہ کروادے گی۔ میں کچھ فروزن آئٹم لے آؤں
گا۔ کوئی اور میڈ وغیرہ نظر میں ہو تو اسے بھی بلو الینا۔“
عباس نے اسے بہلانے کی سعی کی۔

”اگر آپ کو احساس ہے اور اندازہ بھی ہے کہ
یہ سب میرے لیے کتنا مشکل ہے تو تب امی کو منع
کیوں نہ کر دیا۔“ عدینہ نے لہجے کو نارمل کیا۔

”کیسے منع کرتا؟ انہوں نے کوئی غلط بات نہیں
کی نہ ان کی نیت بری ہے۔“

”تو پھر مجھے کیوں بہلا رہے ہیں؟“
”مجھے تمہارا احساس ہے تمہارے اوپر برڈن
ہوگا۔ بہت کام ہوں گے۔“

”میں کرتی آئی ہوں اور کر بھی لوں گی۔“
عدینہ کبیل تان کر لیٹی۔

”ہنستے کو تمہارے میکے چلیں گے؟“

عباس نے کبیل کا کوٹا کھینچا۔
 ”مگر دوسری کی لسٹ صبح بتا دوں گی۔“ عدینہ نے
 کروٹ بدلی۔
 عباس کچھ دیر کچھ لفظ جوڑتا رہا پھر تھک ہار کر
 سو رہا۔

☆☆☆

دیا آپنی بھی اپنے ننھے آئندہ کے ساتھ رہنے آئی
 ہوئی تھیں۔
 ”آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا آپنی!“ عدینہ کی
 آواز میں یاسیت تھی۔
 ”کسا کہا تھا؟“ آئندہ کی منھی سی منھی کھول کر دیا
 نے اپنی انگلی کھمائی۔
 ”جب میں نے کوئنگ سیکھی تھی تو آپ نے
 کہا تھا۔ ہنر کا خراج بھی چکانا پڑتا ہے۔“
 ”میں تو ہمیشہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔“ انہوں نے
 آئندہ کو گد گدایا۔
 ”بالکل ٹھیک کہتی تھیں، شادی ذمہ داری کے سوا
 کچھ نہیں۔“

”اور اتنی خوب صورت ذمہ داری بھلا کون نہیں
 لینا چاہے گا؟“ دیا آپنی نے آئندہ کو گود میں بھرا۔ ”میں
 ذرا چیخ کر دادوں اس کو۔“
 عدینہ نے صوفے سے ٹیک لگائی۔ ”یہ شادی
 سے پہلے اس کا کمرہ ہوتا تھا۔ اب کتنا پرایا پرایا سا
 لگتا ہے۔“

”اماں، یاسر کے لیے بھی اب کوئی رشتہ
 ڈھونڈیں۔ کوئی رونق ہو۔ کوئی خدمت ہو۔“ عدینہ
 باہر آئی اور اماں کو اکیلے کچن میں مصروف دیکھ کر
 بولی۔

”تمہارے بابا سے کہا ہے۔ جاب تو شروع
 کر لی ہے یاسر نے مگر اس کی لاابالی طبیعت سے
 ڈر رہتا ہے اسی لیے تمہارے بابا کہتے ہیں سال بھر
 دیکھ لو۔“

”دیا کو تو آئندہ سے ہی فرصت نہیں، تم بھی اتنے
 دنوں بعد آئی ہو، میں نے کچھ لڑکیاں دیکھی ہیں میرا

مطلب ہے میری نظر میں ہیں۔ آج رات فرصت
 سے ڈسکس کرتے ہیں۔“
 ”جی کیا کام رہ گیا ہے۔ لائیں میں ہیلپ
 کروں۔“ منھی ہوئی عدینہ بھی منھی منھی مگر ماں کو اکیلے کام
 کرتے دیکھ کر رہا نہیں گیا۔
 ”نہیں ہو گیا ہے سب۔ آؤ تھوڑی دیر بیٹھتے
 ہیں ابھی تو افطاری میں خاصا وقت ہے۔“

عدینہ نے ایک لیموں پکڑا اور درمیان سے
 کاٹ کر دو حصے کیے، چھوٹی سی پلیٹ میں رکھ کر باہر
 آئی۔

”تمہارا تو روزہ ہے ناں!“ دیا آپنی نے پہلے
 پلیٹ کو پھرا سے دیکھ لیا۔

”جی..... یہ سوکتی رہتی ہوں تو طبیعت فریش
 رہتی ہے۔“ وہ لیموں کو ناک کے قریب لے گئی۔
 ”تمہاری ساس ساتھ ہیلپ کر دیتی ہوں گی،
 تمہاری تو اپنی طبیعت ایسی ہے۔“ دیا آپنی نے صوفے
 پر اس کے بیٹھنے کی جگہ بنا میں۔

”انہوں نے جتنے کام کرنے تھے اپنے وقتوں
 میں کر لیے۔ اب ان کے آرام کا وقت ہے۔“

”لیکن تمہاری تو اپنی طبیعت۔“ دیا آپنی نے
 اس کے سر پر پر نگاہ دوڑائی۔

”پہلی بار میں تو پتا بھی نہیں چلتا۔ ہمت ہوتی
 ہے۔ ایسا میری ساس کہتی ہیں۔ مجھے تو لگ پتا لگ
 رہا ہے۔“

”تم نے جاب والا بھی بنگالیا ہوا ہے۔“
 ”جواب تو ذرا بھی مشکل نہیں۔ سیلری پیکیج بھی

اچھا ہے اور برڈن بھی خاص نہیں۔ مہینے میں چار
 سنڈے کی چھٹیاں ہو جاتی ہیں اور آٹھ دن ورک فرام

ہوم ہوتا ہے۔ دو تین لیو بھی مل جاتی ہیں۔“
 ”عید سے پہلے تم فارغ ہو جاؤ گی ناں۔“

”جی جی..... لاسٹ منٹھ اینڈ ہونے
 والا ہے۔“

”اماں کہاں رہ گئی ہیں؟ افطاری کا وقت ہونے
 والا ہے۔ آئندہ سو رہا ہے میں ذرا کچن دیکھ لوں۔ اماں

بے چاری اکیلی کرتی رہی ہیں۔“ دیا آپلی انھیں۔

”کوئی تصاویر دکھانے والی تھیں وہ..... ہمیشہ کی طرح رکھ کر بھول گئی ہوں گی۔“

”میری ہیلپ چاہیے ہو تو بتائیے گا دیا آپلی۔“
عدینہ وہیں صوفے پر بیٹھی۔

☆☆☆

وہ سلیب پر دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ باہر ایک ہنگامہ ہوا تھا۔ عید الفطر کا دن تھا۔ اور عباس کے سارے بہن بھائی آئے ہوئے تھے۔ یہ محفلیں تب اچھی لگتی ہیں جب کام بھی سب ہی مل جل کر کریں۔

”تھک گئی ہو؟“ عدینہ نے مڑ کر دیکھا۔ شازمہ بھابھی بچن کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ ان کا لہجہ۔ عدینہ نے کھوجا، اس میں احساس سے زیادہ طنز کی آمیزش تھی۔

”نہیں۔“ وہ پلٹ کر سیدھی کھڑی ہوئی۔ رانی جھوٹے برتن دھو رہی تھی۔ ایک عارضی ملازمہ چائے بنا رہی تھی۔

”میری ہیلپ چاہیے تو بتاؤ۔“
”نہیں بھابھی شکریہ۔ آپ بیٹھیں۔ میں چائے لارہی ہوں۔“

”عدینہ! ایک گلاس پانی..... بلکہ میں لے لیتا ہوں۔“ صفی اندر آیا تھا۔ پانی پیا اور واپس مڑا۔

شازمہ بھابھی پلٹیں تو صفی کو کرسی لاتے دیکھا۔ ”یہ لیں عدینہ! کرسی پر بیٹھ جائیں، کھڑے ہو ہو کر آپ کے پاؤں سوچ رہے ہیں۔“

”شکریہ صفی!“ عدینہ ممنون ہوئی۔ صفی نے جاتے ہوئے شازمہ ممانی کو اوٹ میں کھڑے دیکھا اچھی بھی نانی، نانا کی فیورٹ بہو شازمہ ممانی ہیں۔

”رضیہ، چائے تم ہی دے آؤ۔“ عدینہ نے کرسی کو ہلک لگائی۔

”بھابھی! اندر روم میں جا کر ریٹ کر لیں۔“
فاریہ کپ لینے آئی تھی اسے بیٹھے دیکھ کر بولی۔

”رانی برتن سمیٹ لے تو جاتی ہوں۔“ عدینہ کو پتا تھا جیسے ہی وہ اندر جائے گی ایک ایک بات کے

لیے اسے پکارا جاتا۔ بہر حال مالکن تو وہ ہی تھی اور اسے ہی سارا پتا تھا۔ بار بار یہ فقرہ سننے کو ملتا۔

مرد حضرات لان میں محفل سجائے بیٹھے تھے۔ جبکہ خواتین لاؤنج میں تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے اس نے شازمہ بھابھی اور شمینہ بھابی کو اکٹھے بیٹھے دیکھا۔

”عدینہ! یہ سوہن حلوہ آپ کے حصے کا۔ میں اور ریاض سب کے لیے لائے تھے۔“

”فرق میں رکھ دیں۔“ عدینہ میں واپس مڑنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ اس نے وہیں کھڑے سب کے خوش باش کھٹکھٹاتے چہرے دیکھے پھر ساس کو دیکھا۔

کوئی ستائش بھری نظر، کوئی شکریہ جیسا لفظ، ذرا سا خیال، کوئی احساس بھرا لمس، کوئی دعائیہ کلمات، وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کے نزدیک رضیہ اور رانی نے ہی تو سب کیا تھا۔

دل پہ منوں بوجھ آن پڑا وہ بھاری قدموں سے سمٹتی اپنے کمرے میں آئی۔ تیل کی شیشی لیے بیڈ پر آئی مگر اپنے پاؤں پر خود ہی مساج کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

”کام تمہارے لیے اچھا ہے۔“
”تمہیں آسانی ہوگی۔“

”ڈاکٹر زان دنوں زیادہ کام کا کہتی ہیں۔“
”جتنا ایکٹو ہوگی۔ اتنا آسان کیس ہوگا۔“
مختلف فقروں کی بازگشت، آنکھوں میں نمکین پانی کی صورت لگی۔ عباس اندر آیا۔

”عدینہ.....“ اس نے آواز دی۔ وہ سوتی بن گئی۔ احتیاط سے دروازہ بند کر کے وہ باہر نکلا۔ یہ جو سسرال میں دعوتیں کرتی لڑکیاں ہوتی ہیں نایاں ان کے میکے میں بھی عید ہوتی ہے۔ دو شفاف مولی ٹیکے میں پیوست ہوئے۔

☆☆☆

منہی عرشہ منہی منی معروفات لائی تھی۔ عدینہ کی دوزیں پہلے سے بھی بڑھ گئی تھیں۔ فرق یہ تھا کہ

عباس رات کے وقت آئے تو عدینہ کا منہ سو جا ہوا تھا۔

”اب بتاؤ میں کیا کروں؟“ وہ بھی بے بس دکھائی دیئے۔

”تو بتائیے میں کیا کروں؟“ عدینہ نے الٹ کر اس سے سوال کیا۔

”تم منع کر دو۔“ عباس کو یہی حل بچھائی دیا۔

”میری بیٹی کے اعزاز میں دعوت رکھی گئی ہے اور میں ہی منع کر دوں؟“

”پھر کیا حل ہے؟“

”کر لوں گی۔ جیسے ہر بار کر لیتی ہوں۔“

”عرشہ کو میں سنبھال لوں گا۔“ عباس نے طفل تسلی دی۔

☆☆☆

دعوت کا دن گویا کوئی شادی کا دن تھا۔ رنگ و نور کا طوفان اتر آیا تھا۔

عدینہ ہمیشہ کی طرح یہی فیصلہ نہ کر پائی کہ اسے تیار کھانا لگانے سے پہلے ہونا ہے یا بعد میں۔ کپڑے نکال کر بیڈ پر پھیلائے پھراٹھائے اور واپس الماری میں لٹا کر کر دیئے، بیڈ پر سب کا آنا جانا بیٹھنا لگا رہتا وہ کس کس سے کپڑے بجاتی۔

عرشہ کو بھی نازل سے کپڑے پہنائے اور عباس کو پکڑا کر چکن کی راہ لی۔

کچھ مسالے وغیرہ تو اس نے پہلے ہی تیار کر رکھے تھے۔ لیکن پھر بھی اچھا خاصا کام تھا۔ جو فیملی آرہی تھی اسے پہلے چائے، چپس اسٹیکس بھی ساتھ ساتھ سرو کر رہی تھی۔ میڈ چھٹی پہنچی۔ ایک بارہ تیرہ سال کی بچی کا بندوبست عباس نے کیا تھا۔

وہ ساتھ ساتھ سارے برتن دھو رہی تھی۔ چکن پیسز کو مسالہ لگا کر کل ہی فریج میں رکھ دیا تھا۔ انہیں نکال کر اسٹیم پر رکھا اور بریانی کی تیاری کرنے لگی۔

”ممائی جان! عرشہ رو رہی ہے اسے بھوک لگی ہے۔“

”میں آتی ہوں۔“ عدینہ نے ایک بے بسی

اب آفس نہیں جانا ہوتا تھا۔ اس نے ایک سال کی بغیر تنخواہ چھٹی لے لی تھی۔ مگر پھر بھی وہ بوکھلائی ہی رہتی

کوئی روٹین بن ہی نہ پائی، کسی دن ریسٹ کا پلان رکھتی تو عرشہ سونے تک نہ دیتی۔ بھی تفصیلی کام کا پلان کرتی تو وہ پاس سے ہلنے تک نہ دیتی۔

”رانی (میڈ) بھی تو مگر کام والیوں سے گھر سنبھالنے لگے تو گھر کی عورت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے۔

”امی! ذرا پکڑیے گا۔“ عدینہ لپیٹ لپیٹ کے

ساس کو پکڑاتی تو پندرہ منٹ میں ہی آواز آنے لگتی۔

”عدینہ اسے لے جاؤ میرے تو بازو دکھنے لگے ہیں۔“

”یہ آج کل کی لڑکیاں۔ چہ چہ ایک بچی بھی نہیں سنبھالی جاتی۔“ اس کی ساس اسے بوکھلایا دیکھ کے بڑبڑائیں۔

”یہ آج کل کے دادا دادی چہ چہ ایک بچے کو بھی کچھ دیر نہیں سنبھال سکتے۔“ وہ غصے سے دل میں سوچتی۔

عرشہ ایک ماہ کی ہوئی تو اس کے ساس سر نے اس کے پیدا ہونے کی خوشی میں، گھر میں سب بیٹیوں بہوؤں کے لیے دعوت رکھ لی۔ عدینہ کو پتا چلا تو سر ہی پیٹ لیا۔

پہلے کی بات اور تھی مگر اب عرشہ کے ساتھ وہ اتنا کام نہیں کر سکتی تھی اور کوئی بھی اس کے ساتھ مدد کرنے کو تیار نہ ہوتا۔ شمینہ باجی، روزینہ، قارینہ اور شازمہ بھابھی سمیت نئے کپڑوں اور میک اپ سے لتھڑے چہروں کے ساتھ ایک دوسرے سے مذاق کرتیں اور مہمانوں والا پروٹوکول انجوائے کرتیں۔

جبکہ جب تک وہ ریڈی ہو کر آتی سب اٹھنے لگتیں۔ سارا دن وہ ماسیوں والا حلیہ لے رہتی۔ اسے لگتا تھا اب عرشہ ہو گئی ہے تو شاید ساس سر کچھ لحاظ کریں۔ دعوت کم، مہمان پانچوٹ تیں سب کام سب ہی نوٹ مل جل کر کریں مگر بظاہر ایسا کچھ بھی ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

بھری نظر پھیلے ہوئے چمن پر ڈالی اور جلدی جلدی پیاز کاٹنے لگی۔

”عدینہ، یہ عرشہ کو شاید بھوک لگی ہے۔“

شازمہ بھابھی بچی کو اٹھائے ہوئے آئیں۔
عدینہ نے عرشہ کو اٹھایا اور ڈانٹنگ میبل کی کرسی سمیٹ کر بیٹھی۔ شازمہ بھابھی پہ ڈالی ایک نظر حسرت بن کر لوٹی۔ میروں کلر کے سوٹ میں وہ خوب ہی فریش لگ رہی تھیں۔

عرشہ کو اسے جھما کر وہ میبل کی ٹک ٹک کرتے پلٹ گئیں۔ عرشہ سو گئی تو عدینہ اسے لیے اٹھی۔ بیڈ روم میں لٹانے کی نیت لیے چمن سے نکلی ہی تھی کہ شازمہ بھابھی کی بیٹی آئی۔

”چچی! فارینہ پھوپھو آگئی ہیں۔“
عدینہ اٹنے قدموں پلٹی۔ بائیں کندھے پر عرشہ کو لٹایا اور داہنے ہاتھ سے گلاس میں جوس ڈالنے لگی۔ تب ہی صفی اندر آیا تھا۔

عدینہ! لائیں میں کر دیتا ہوں۔“ اس نے جوس کی بوتل پکڑی اور گلاس میں ڈالنے لگا۔
”عدینہ!“ شازمہ بھابھی اندر آئیں۔ صفی کو معنی خیزی سے دیکھا۔

”جی!“ عدینہ پلٹی۔
”فارینہ کا بتانے آئی تھی۔“
”ممائی! آپ لے جائیے پلیز۔“ صفی نے نرے شازمہ کو کوٹھمائی۔

”کچھ اور ہیلپ چاہیے تو بتائیے۔“ صفی فرصت سے کھڑا ہوا۔
”کرلوں گی۔“ عدینہ نے آہستگی سے کہا۔
جن کو خیال احساس کرنا چاہیے وہ تو کرتے نہیں۔“

عباس تک چمن میں نہیں جھانکتا تھا۔ بھائی بہنوں کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہتا۔
”میں عرشہ کو لٹا آؤں۔“ عدینہ ہاتھ آئی، بیڈ پر احتیاط سے عرشہ کو ہٹایا اپنے ہنگ ہوئے میروں خوب صورت اور اسٹائش سوٹ کو حسرت سے دیکھا اور چمن میں آئی صفی وہیں کاؤنٹر پر کھڑا تھا۔

”بتائیں اور کیا کرنا ہے؟“
”صفی، میں کرلوں گی۔ آپ جاؤ۔ سب میں جا کر بیٹھو۔“

”میں اچھی کو کنگ کر لیتا ہوں اب تو بلور خاص پر ٹیکس کرتا ہوں، باہر تو کوئی ماں نہیں ہوگی۔“
”کب جا رہے ہو؟“
”بس ٹیکسٹ ویک؟“

”ٹیکسٹ ویک؟ بتایا ہی نہیں تم نے؟“
”بس سر پر انٹر سمیٹو۔ پہلے اتنا ہی وقت ہو گیا تھا کبھی کیا الیٹو بن جاتا کبھی کیا۔ ابھی سارے معاملے حل ہوئے ہیں۔“

”بہت، بہت مبارک، شمینہ باجی تو اکیلی رہ جائیں گی۔ یا تمہارے بابا کے پاس چلی جائیں گی ایبٹ آباد۔“

”آپ کے سامنے شاید ذکر نہیں ہوا ممانے ادھر تانو کے گھر شفٹ ہو جانا ہے۔“ صفی نے آہستگی سے بتایا۔ عدینہ نے حیرانی سے دیکھا۔
”اچھا..... واقعی؟“ عدینہ ہر بات سے لاعلم تھی۔

”آپ کے پاس اچھا موقع ہو گا درمیان میں دیوار کروادیتے گے پچھلے صحن کا گیٹ استعمال کر لیتا۔ بالکل الگ گھر ہو جائے گا۔ ایسے عید، دعوتوں پہ مہمانوں کی طرح آیا کرنا۔“ صفی کسی سہیلی کی طرح رازداری سے کہہ رہا تھا۔

”شرم تو نہیں آتی۔“ عدینہ نے اس کے کندھے پر چیت لگائی اور مڑی تو سامنے عباس تھا۔
”عرشہ کہاں ہے؟“ اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
”بیڈ روم میں سو رہی ہے۔ کچھ چاہیے؟“

”نہیں۔“ وہ پلٹ گیا۔
”اب بتائیے کیا کیا رہ گیا ہے؟“
”بیف کڑا ہی عطا ہے، چکن تقریباً تیار ہے بریانی کی ساری تیاری مکمل ہے۔“ شازمہ رات کو ہی

بنائے فریج میں رکھ دیا تھا۔ رائے ابھی ہاتھ کے ہاتھ بنا لوں گی۔“ عدینہ نے ہاتھ جھاڑے، گویا کوئی کام تھا

ہی نہیں۔

”اوس کے۔ آپ بریانی دیکھیں اور ہاتھ کے ہاتھ راستہ بنالیں۔ بیف میرے حوالے کریں۔“
”وائی بنالیں گے۔“

”دعوا کرنے والے باہر کپ شپ لگا رہے ہیں۔ ثبوت آپ کے پاس موجود ہے۔“ صفی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

عدینہ نے کڑا ہی کا سامان اس کے حوالے کیا اور بریانی بنانے کے ساتھ ساتھ برتن نکالنے لگی۔ کھانا لاؤنج میں بیٹھ کر ہی کھالیا جاتا۔ بڑے سب صوفے پر بیٹھ جاتے۔ بچہ پارٹی نیچے کارپٹ بچھا لیتی۔ عدینہ تو اتنا تھکی ہوئی تھی کہ سب کو سرو کرنے کے بعد یا کچن میں ہی بیٹھ جاتی یا بیڈ روم میں چلی جاتی۔ شازمہ فارینہ آوازیں لگاتیں۔

”آج میں عدینہ بھابھی! آپ بھی تو ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھائیں۔“

”اتنا ہی احساس ہے تو سہا تھ بیٹھ کر بنوا بھی لیا کریں۔“ وہ لگا ہوں سے زمین پر ہستی۔

شازمہ بھابھی حسب عادت دو تین بار آئی تھیں شہینہ آیا بھی آئیں اور کچن کے دروازے پر ناقدا نہ انداز میں کھڑی رہیں۔

”بس کھانا تقریباً تیار ہے۔“ عدینہ ان کے کچھ دیر کھڑے رہنے سے گھبرائی تھی۔

”یہی تو دیکھ رہی ہوں، کھانا ہی بن رہا ہے ناں۔“ ان کا انداز عجیب غریب لیے ہوئے تھا۔

”کچن میں کھڑے ہو کر اور کیا ہو سکتا ہے امی جان؟“ صفی پورا ان کی طرف گھوما تھا۔

”تم باہر مردوں میں جا کر بیٹھو۔ اور عدینہ! کوئی مدد چاہیے تھی تو مجھ سے کہا ہوتا۔“

آپا! میں کر رہی تھی سب کچھ اور تقریباً ہو ہی گیا ہے۔“ عدینہ آپا کے لہجے سے گھبرائی تھی۔

”یہ برتن لاؤنج میں لیے جا کر رکھے امی!“ صفی نے پائیں تھمائیں تو عدینہ اور گھبرائی۔

”میں کبرلوں کی۔ صفی! جادو تم بھی۔“ عدینہ

آنکھوں میں التجا جبکہ لہجے میں منت تھی۔

دونوں کے جانے کے بعد عدینہ پڑا ہی کی جانب متوجہ ہوئی۔ بس چند منٹوں کی بات تھی سب کھانا تیار تھا۔ عدینہ نے ہنسی سے برتن لگوانے شروع کیے۔

”عدینہ! آپ جاپے ریڈی ہو جائیے۔ میں دیکھتا ہوں۔“ صفی پھر سے نمودار ہوا۔

”کیوں میرے لیے مشکل بناتے ہو؟“ عدینہ روہانسی ہوئی۔

شازمہ بھابھی اور شہینہ باجی کی آنکھوں سے ابھرتے تاثرات سے وہ انجان تو نہ تھی۔

”میں تو آپ کے لیے آسانی چاہ رہا ہوں۔ اور یہ آسانیاں پیدل چل کر آتی ہیں ناں ہی اور کڑا کر۔ یہ ڈھونڈی جاتی ہیں، یہ پیدا کی جاتی ہیں۔

یہ لاؤنج میں جو تھہروں کی آواز آرہی ہے۔ میں چاہتا ہوں ان میں آپ کی بھی ہنسی شامل ہو۔ رنگوں

روشنیوں کی باتیں آپ بھی کریں۔ تہوار، دعوتیں آپ بھی انجوائے کریں۔ رات لیٹتے ہوئے آپ کے

دامن میں دن بھر کی خوش گوار یادیں ہوں نا کہ ٹھکن سے چور وجود۔“

”جیسے تم سوچتے ہو صفی! باقی لوگ ایسا کیوں نہیں سوچتے؟“ عدینہ نے خوش گوار حسرت سے اسے دیکھا۔

”تو آپ ہی ان کو باور کرواد دیجیے۔ ان کو احساس دلایئے۔“ صفی نے اکسایا۔

”احساس دلایا نہیں جاتا، کیا جاتا ہے۔“ عدینہ کے لہجے میں غمی تھی۔

”جہاں کیا نہ جائے وہاں دلانا پڑتا ہے۔ اور احساس دلانا چاہیے بھی۔ فری کی چیزوں، جذبات،

خدمات کی ویلیمیں ہوتی۔“ صفی اس سے متفق نہیں تھا۔

”جائے آپ پیسج کر کے آئیے میں تب تک برتن لگوانا ہوں۔“

عدینہ اس کی شکر گزار ہوتی بیڈ روم کی جانب آئی۔ اپنا خوب صورت میرون رنگ کا سوٹ پہنا ہلکا

چھلکا میک اپ کیا ہال سٹ کیے۔ عرشہ ابھی تک سو رہی تھی۔ وہ ریڈی ہو کر نکلی۔ سب کھانے کے لیے بیٹھ چکے تھے کئی ایک نظریں منسلکی تھیں۔ عدینہ خواہ مخواہ ہی شرمندہ ہو گئی۔

وہ کچن میں کھانا نکال رہی تھی جب شازمہ بھا بھی آئیں۔

”عدینہ، لاؤ میں کھانا نکالتی ہو، تم بیٹھو۔“

”میں نکال رہی ہوں۔“ عدینہ نے مڑے بغیر

جواب دیا۔

”تم ریڈی ہوئی ہوئی ہونا۔“ انہوں نے

جواب دیا۔

”ممائی جان آئیے جو کھانا بنا سکتا ہے، وہ نکال بھی تو سکتا ہے۔“ صفی اندر آیا۔

عدینہ! راستہ اور بریانی لے آئیے۔ باقی ہو چکا۔“ صفی سلاڈ کی پلیٹیں اٹھائے باہر نکلا۔ شازمہ بھی خاموشی سے پلٹ گئی۔

”آپ نے نہ صرف سب کے درمیان آکر بیٹھنا ہے بلکہ کھانا بھی برابر کھانا ہے۔“ صفی بریانی کی ٹرے اٹھا کر لے جاتے ہوئے عدینہ کو تاکید کر رہا تھا۔

”اوکے۔“ عدینہ نیم رضا مندی سے بولی۔ کام مشکل تھا مگر آج یہ بھی کر ہی لیا جائے۔ وہ بریانی کی ٹرے اٹھائے آئی۔ اوپر تو سب جگہ فل تھی وہ بچہ پارٹی کے ساتھ نیچے کارپٹ پر بیٹھی۔

”بھا بھی! میری طبیعت ذرا ٹھیک نہیں تھی۔ مگر نہ میں آپ کے ساتھ ہیلپ کرواتی۔“ فارینہ بولی۔

”آج تو ہیلپ کی خاص ضرورت، نہیں تھی عدینہ کو، صفی تھاناں۔“ شازمہ نے بظاہر مسکرا کر کہا۔ مگر ان کا طعنے سب تک بخوبی پہنچا۔ عدینہ نے نگاہیں اٹھا کر صفی نے آنکھیں بند کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”بیف کڑا ہی مزے کی بنی ہے عدینہ!“ روزینہ بھی بولی۔

”بریانی بھی تو مزے کی ہے۔“ ریاض بھائی بھی بولے۔

”اب یہ پوچھ لیجیے، شکر یہ کس کا ادا کرنا ہے عدینہ کا پامنی کا۔“ شازمہ کی پھر سے زبان پھسلی۔ لاؤنج میں ایک دم سے معنی خیزی خاموشی پھیلی۔

”آج پاکستان کا کوئی اہم میچ تمام مدحرات تو کھانا کھاتے ہی اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے تھے کہ خواتین کی باتوں میں لاؤنج میں تو دیکھنا محال تھا۔

عباس اور صفی بیٹھے ہوئے تھے۔“ میں ابھی آتا ہوں۔“ عباس بھی ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

”آیت! انھیں برتن کچن میں رکھوانے میں ممائی کی ہیلپ کریں۔“ فارینہ نے بیٹی سے کہا۔

”مما.....“ وہ منھ کی

”چھوڑیں فارینہ! صفی ہے ناں۔“ شازمہ

بھا بھی نے کہا۔

”ممائی اگر کوئی ایک بندہ عدینہ کا احساس کر ہی رہا ہے تو اسے اس کا جرم مت بتائیں۔ اسنے بڑے ٹبر کے لیے ہمیشہ وہ اکیلی کھانا بناتی ہے، کبھی کسی کو احساس نہیں ہوا۔ آج اگر میں نے ذرا سا کر ہی لیا ہے تو آپ صبح سے مجھے ٹانٹ کیے جا رہی ہیں۔“ صفی کو بالآخر غصہ آ ہی گیا۔

”میں کیوں ٹانٹ کروں گی ویسے بھی تم کلاس

فیلور ہے ہو، تمہارا احساس بنتا ہے۔ جہاں تک ٹبر کی

بات ہے تو ہم تو امی ابو کے لیے آتے ہیں۔ ٹھیک

ہے، نہیں آیا کریں گے۔“ شازمہ بھا بھی چٹکی میسر۔

”صفی..... تمہاری زبان کچھ زیادہ ہی چلنے لگی

ہے۔“ شمینہ آباغصے سے بولیں۔

”لیکن حق کے لیے چل رہی ہے۔ مم! آپ یہ

بھی تو دیکھیں۔“

”شمینہ آپا ڈرتی تھیں۔ یہ باہر سے کوئی چاند

چڑھا کے نہ آ جائے۔ یہ تو یہیں چاند چڑھا کے جائے

گا۔“ شازمہ بھا بھی کو کون چپ کر داتا۔

صفی باہر نکل گیا۔ عدینہ کی حیرت کو عرشہ کے

رونے کے آواز نے توڑا تھا۔ عباس لاؤنج میں آ رہا تھا۔ جب عدینہ بیڈ روم میں جا بنے کو مڑی تھی۔ عرشہ کو گود میں لے کر عدینہ بیڈ پر بیٹھی۔ پہلے اگر دعوتوں میں جسمانی تصکاوٹ ہوتی تھی تو اس بار وہی بھی تھی۔ کچھ چھستی ہوئی باتیں تھیں۔ معنی خیز لگاہیں تھیں۔

کوئی ایک بھی عدینہ کے حق میں نہیں بولا تھا کوئی ایک بھی عدینہ کے لیے نہیں بولا تھا۔ صفی اور اس کی جان بچان جرم بھی تو صفی کا اس کا احساس کرنا سنگین ترین جرم، اس نے جیولری اتاری اور ویٹ ٹشو سے چہرہ صاف کیا۔

کافی دیر بعد عباس اندر آیا تو اس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی۔

”چلے گئے سب؟“ عدینہ نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا تھا۔

”ہوں۔“ وہ کسی غیر مرئی نقطے کو تنک رہا تھا۔ عدینہ نے عرشہ کو لٹایا اور پیچ کرنے چلی گئی۔

”آج صفی نے تمہاری خوب مدد کی۔“ وہ واپس بیڈ پر آ کر بیٹھی تو عباس کی آواز آئی۔

”احساس کی بات تھی، چلو کسی کو تو ہوا۔“ عدینہ زود ٹھے انداز میں بولی۔

”خدا کرے یہ احساس ہی ہو۔“ عباس بڑبڑایا۔

”تو آپ کے خیال میں یہ احساس کے علاوہ اور کیا تھا؟“ اس کا دل صدے سے ڈھے گیا تھا مگر لہجہ تن کے کھڑا تھا۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے؟“ عدینہ نے اس کی خاموشی پر اس کا کندھا ہلایا تھا۔

”ان سے پوچھو۔ جو باتیں کر رہے تھے۔“

”مجھے آپ کے سوا کسی سے کوئی عرض نہیں۔“

عدینہ نے پاک دامنی کا ثبوت چاہا۔

”اب اپنا آنکھوں دیکھا کسے جھٹلاؤں۔“

عباس سر جھٹک کر اٹھا تھا اور باہر نکل گیا۔ عدینہ نے بے یقینی سے دیکھا۔ آنسوؤں کا ایک ریلا آیا تھا گلے

کی گلٹی نے سانس روکا تھا۔ رات بے یقینی میں بیٹی تھی آنسوؤں سے بھیگی تھی۔ عدینہ نے فیصلے اور سچ جھوٹ کا اختیار وہیں رہنے دیا تھا جو کچھ میں آیا تھا۔ بیک میں بھر لیا تھا۔ باس رکوال کی تھی۔ جب تک سب اٹھے تھے، وہ گھر چھوڑ چکی تھی۔

☆☆☆

اسے یوں واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ دن بھر سوچتی اور رات بھر پچھتاتی۔

صفی نے بھی جانے سے پہلے کال کی تھی۔

”آپ کو جواز نہیں دینا چاہیے تھا شازمہ بھابھی کو۔“

”میں نے آپ کو کتنا منع کیا، مت ہیلپ کرو۔“ عدینہ اس سے بھی جھکھ کر گئی۔

بھابھی کبھار اسے اپنا فیصلہ ٹھیک لگتا۔ کوئی بھی تو اس کی حمایت میں نہیں بولا تھا۔ وہ ان سب کی خاطر تو واضح کرتی تھی وہ ان سب سے کردار کشی کیسے کرواتی؟

سب سے زیادہ گلہ تو اسے عباس سے تھا وہ عدینہ کے بارے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔

ٹھیک ہے اسے غصہ آیا ہوگا تو کیا غصے میں انسان کچھ بھی کہہ دے؟ ہو سکتا ہے اسے بھڑکایا گیا ہو تو بھڑکنے پر انسان کردار کشی کرے؟ شک کرے؟

صفی کے جانے سے پہلے بھی ایک گرینڈ دعوت ہونا تھی۔ وہ ہوگئی ہوگی، شہینہ آپا کے گھر ہوئی ہوگی یا انھیال میں ہی؟

عباس نے اسے کال نہیں کی تھی۔ عدینہ نے بھی کوئی کال نہیں کی۔ جب سب کچھ سوچ کے تھک

ہار جاتی تو اسے خود پہ غصہ آنے لگتا۔

ساری غلطی، سارا قصور اپنا لگنے لگتا اور واپس جانے کو پرتو لگتی۔ دیا آلی سمجھاتیں۔

”یا تو آنا نہیں تھا، آگئی ہو تو۔ اب سکون سے رہو۔ بات کو کسی طرف لگنے دو۔ انتظار کرو۔“ وہ پھر ڈھیلی پڑ جاتی۔ ایسے خود سے جا کر خود کو ارزاں کیسے

کرتی؟؟؟

کل پھر بقر عید تھی عدینہ پھر سے اداس ہو رہی تھی۔ کتنے بڑے لوگ تھے۔ کتنے ہی چھوٹے تھے کسی کو بھی اس کا خیال نہیں تھا۔ آنٹی انکل کو تو اب کیا ہی احساس ہوتا تھا کہ ان کے پاس۔ تو اب تمہیں آپا نہیں۔

صفی کا نمبر بھی عدینہ نے ہلاک ہی کر دیا تھا۔ عرشہ کی کی بھی سی پھلی پہ اس نے مہندی لگائی تھی۔ وہ تھا وجود بے خبر سو رہا تھا۔ ضبط سہتے سہتے بالآخر جواب دے گیا۔ کتنے ہی آنسو بے خبری میں نکل گئے سب دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔ اور وہ بیڈ سے ٹھیک لگائے بیٹھی تھی۔ کبھی ٹھیک لگتی۔

تب ہی موبائل کی ٹون بجی۔ عدینہ نے دور پڑے موبائل کو دیکھا بے دلی سے آئی اور موبائل اٹھایا عباس کی کال تھی، اس کا دل یکبارگی دھڑکا۔ اس نے فوراً کال اٹھائی۔

”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں۔“

”میں بھی ٹھیک ہوں عرشہ کیسی ہے؟ سو رہی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ جی سو رہی ہے۔“

”واپس نہیں آنا تم نے۔“

”میری کسی کو کیا ضرورت؟“ الفاظ نرم تھے،

لہجہ روٹھا ہوا۔

”ضرورت تو اچھی خاصی ہے۔ کل عید ہے گھر پر دعوت ہے سب مہمانوں نے آنا ہے۔ کھانا بنانا ہے تم نے۔“ عباس کے ہونٹوں کے کنارے پر ہنسی شرارت عدینہ کو اسے سامنے نہ پا کر بھی دکھائی دے رہی تھی۔

”اگر صرف کھانا بنانے کا ہی مسئلہ ہو رہا ہے تو میں ادھر سے بنوا کر بیچ دوں گی۔“ اس کی شرارت سمجھتے ہوئے بھی عدینہ برا مان گئی تھی۔

”کھانا سو کر لی ہوئی بھی تو تم چاہیے ہاں۔“

”ڈھنگ سے تعریف کرنا بھی نہیں آتی، الزام

تو اچھا خاصے لٹا لیتے۔“ ایک اور بے پروا ذکر آ۔

”الزام کا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”اور وہ جو کچھ بول گئے تھے۔“

”وہ سوچا ہوا نہیں تھا جو بول گیا تھا۔ معذرت خواہ ہوں۔“

”او کے معاف کیا۔“ عدینہ ہلکی پھلکی ہوئی۔

”بس معاف؟ واپس نہیں آؤ گی۔“

”اگر کوئی لینے آ جائے تو سوچا جا سکتا ہے۔“

عدینہ اٹھلائی۔

”او کے ریڈی ہو۔ میں لینے آ رہا ہوں۔“

”اس وقت؟“

”گئی بھی تو اس وقت تھیں۔“

”وہ صبح کا وقت تھا۔“

”تب بھی سب سو رہے تھے اب بھی سب

سو رہے ہیں۔ وقت سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ عباس کے انداز میں غلٹ تھی۔

”اور ہاں یہ مت سوچنا کہ کاموں کے لیے

لا رہا ہوں۔ کل ویسے بھی مرد حضرات کا زیادہ کام ہے

مگر کھانے کی ذمہ داریاں بھی اس بار مرد حضرات نے

بانٹ لی ہیں۔ باربی کیو ہوگا اور انگلیٹھیاں ابھی سے

سیٹ کر لی گئی ہیں۔“

”صفی نے کہا ہوگا۔“ عدینہ کی بات پر عباس کو

صفی کی لمبی سی ای میل یاد آئی جو اس نے آسٹریلیا جا کر

کی تھی۔ احساس کسی رشتے کا محتاج تھوڑی ہوتا ہے۔

آخر میں اس نے لکھا تھا۔

”سمجھ کا سرا کہیں سے بھی میسر آئے، بات تو سمجھ

آنے کی ہے ہاں۔“ عباس نے ہلکے پھلکے انداز سے کہا۔

”اچھا میں گیٹ سے باہر ہوں آ جائیے۔“

عباس کی بات پر عدینہ نے حیرت سے موبائل کے

ایئر پیس کو گھورا۔ پھر خوش گواریت بھری مسکراہٹ

سے عرشہ کو اٹھایا۔

ایک خوب صوت سے بندھن میں بندھا شخص

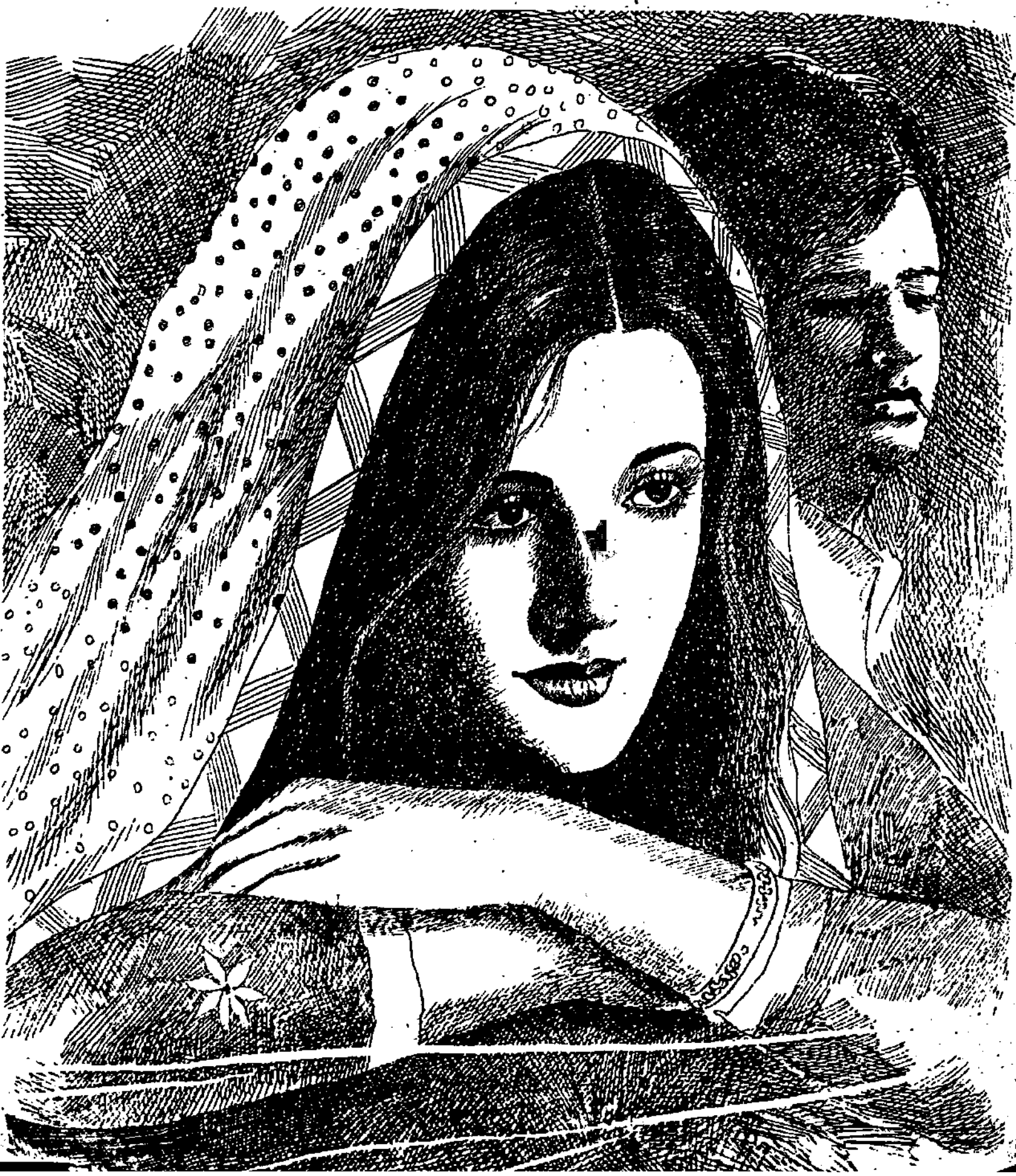
احساس کی خوب صورتی لیے اس کا منتظر تھا۔

☆☆

”اس ناکارہ سلائی مشین سے جانے میری
کب جان چھوٹے گی۔“

گڈی آپا کا غصے سے پارہ ہائی تھا۔ صبح سے ہی
شازمہ کی تکرار گڈی آپا سے جاری تھی۔ ”جب دیکھو
اپنی بیٹی کے کپڑے سلائی ہو رہے ہوتے ہیں۔ میری
مٹی عتایہ کے چار جوڑے ویسے کے ویسے پڑے
ہیں۔“ گڈی سے چھوٹی بہن شازمہ بھی آج

گڈی آپا



1965ء کی جنگ جو کاروبار دھارے، گڈی سے سبقت لے جانے میں مصروف۔

”ساری زندگی زبان درازی کرتا ہی آیا کوئی ڈھنگ کے گن نہ سیکھے، نہ ایسا کون سا مشکل کام ہے سلائی کا جو تیرے بس کا نہیں؟“ گڈی آپا نے شازمہ کے لئے لیے۔

”گڈی! تو ہی ہار مان لے۔ چپ کر جا، درد سے میرے سر سے بھیجا ہر آنے کو ہے، ماں بی نے دونوں بیٹیوں کو سرزنش کی۔“ جب دونوں کو اسی گھر میں رہنا ہے تو بحث کا ہے کی۔ دونوں ایک دوسری پہ اپنا دکھ کیوں نکال رہی ہو۔“ اماں گویا ہوئیں۔

جمال دین کے گھرانے کا شمار کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ پہلی شادی بڑے بھائیوں نے چھوٹی عمر میں کر دی۔ اس کی پہلی بیوی پہلے بچے کی پیدائش پہ چل بسی بچہ بھی مردہ پیدا ہوا تھا۔ دس سال کے بعد بڑی بھانج کی پھر سستی سروس بروئے کار لاتے ہوئے اٹھارہ سالہ سائرہ بیگم، بیگم جمال بن کر جمال حویلی میں آن بسیں۔ عمروں کے فرق کو بھی دونوں نے محسوس نہیں کیا اور اچھی خوش گوار زندگی گزارنے لگے۔

وقت کا پیہر دو سال آگے سر کا اور مسرت نسیم عرف گڈی سائرہ بیگم کی گود میں آ گئی۔ جمال دین مارے خوشی کے پھولے نہیں ساما۔ پورے خاندان میں مشائیاں بانٹیں۔ بڑے بھائی اور بھانج نے مذاق اڑایا۔

”بھالے! تو باؤلا تو نہیں ہو گیا؟ بیٹی کی پیدائش پر اتنی خوشیاں۔“

”نہ پائی! ایسا مت بول۔ بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں دیکھنا میری گڈی ایک دن میرا سر فخر سے بلند کرے گی۔“

گڈی کے بعد جمال دین کے گھر اور بچے بھی پیدا ہوئے لیکن گڈی کی اہمیت میں رتی برابر فرق نہ آیا۔ گڈی بھی بھی بلا کی حسین، اس لئے اس کی تائی

حسد کرتی تھی۔ گڈی پانچویں کلاس میں آئی تو اس کی پھوپھو خیر النساء بیگم ایک دن جمال دین کے سر ہو گئی۔

”دیکھ جمال! تو گڈی میرے حقیقہ کو دے دے۔ میرا لکواک پتر ہے۔ خاندان کی بات خاندان میں رہ جائے گی۔“ خیر النساء نے سچی نظروں سے جمال دین کی طرف دیکھا۔

”آپا ابھی تو گڈی بہت چھوٹی ہے۔ بچے بڑے ہو جائیں پھر دیکھیں گے۔“ دراصل خیر النساء صادق آباد کے ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھیں اور رشتے میں کزن لگتی تھیں۔

خیر النساء تو چاروں سے پڑاؤ ڈالنے اپنا فیصلہ صادر کر کے صادق آباد والی گاڑی میں سر پہ صندوق دھرے روانہ ہو گئیں۔ اماں سوچوں میں غرق، جمال نے مسکرا کر بیوی سے کہا۔

”بھلیے لو کے! کیوں پریشان ہے۔ تیری مرضی کے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔“

☆☆☆

مڈل میں آتے ہی گڈی نے اچھا قد کاٹھ نکالا۔ خاندان کے کچھ اور لوگ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جمال کی سگی بہن نے اپنے بیٹے کا رشتہ ڈال دیا۔ اس بار جمال دین پریشان ہو گیا۔ اس کے بھانجے اوباش ٹائپ کے تھے۔ کسی تقریب میں گڈی کو دیکھ کر اس کا بیٹا فریفتہ ہو گیا۔ حالانکہ اس پھوپھو کی طرف دونوں خاندانوں کا آنا جانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ خیر النساء کی طرف پہنچ گئی اور وہ اپنی تندہ نب بیگم اور شوہر کے ہمراہ جمال دین کے گھر آدھمکی۔

آٹھ دن بیٹھے رہے اور ہاں کروا کے گئے۔ لاڈلی بیٹی کا اتنی دور رشتہ کرنے پہ اماں بھی دل سے راضی نہیں تھیں لیکن شوہر کی ہاں میں ہاں ملائی اور رشتہ پکا ہو گیا۔ دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔ جمال دین کی سگی بہن بیگم بیگم نے شرکت نہ کی اور سازش زندگی کے لیے تاح سن کر لیا۔

حفیظ گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ بڑی تین بہنیں ابھی کنواری تھیں بس اچھا رشتہ ہاتھ سے کل جانے کی غرض سے زینب بیگم نے اپنی بھولی بھالی خیرالنسا کو آگے کر کے جلد حفیظ کی شادی کر دی۔

حفیظ احمد ابھی ایف اے کا اسٹوڈنٹ تھا۔ گڈی کے ساس اور سرسری گھر میں کوئی اوقات نہ تھی۔ پورے گھر کی سرداری زینب بیگم کے ہاتھ تھی۔

جمال دین کا سرسری سا آنا جانا تھا گھر کے ماحول کو اچھی طرح پرکھ نہیں سکا۔ گڈی کی اماں ایسی سادہ لوح خاتون تھیں بھی یہاں آئی نہیں۔ گھر کے ہر فرد کو زینب خرچہ دیتی اور باز پرس کرتی۔ زمینوں سے جتنی آمدنی آتی سب زینب کے پاس۔ زینب کے ساتھ اس کے چار بھائی اور ایک یتیم بھتیجا رہائش پذیر تھے۔ سوائے خیرالنسا

☆ ☆ ☆
ابھی ایک ہی سال گزرا تھا گڈی کے سرانیوں نے شادی کی تاریخیں طے کرنے پہ زور ڈالنا شروع کر دیا۔

”یا جمال، فکر کس بات کی ہے؟ گڈی میٹرک کے پیمپروہاں دے لے گی کون سا پرانے گھر جا رہی ہے۔“

زینب نے پیار بھری دھونس جھائی۔ تاریخ رکھ دی گئی کچھ دنوں بعد گڈی کے سرال والے جیولری، کپڑے وغیرہ کا ناپ لینے آئے ساتھ شو شا چھوڑ گئے۔

”سامان جہیز مت دیں۔ سفر لمبا ہے۔ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔“

”نہ بہن! میں نے کچھ تیاری کر لی ہے باقی کر لیں گے۔“ اماں بولیں۔

”اس کا بھی ایک حل ہے میرے پاس۔“
پھوپھو کی نند زینب بیگم بولیں۔
”وہ کیا بہن؟“ سارہ بیگم تشویش آمیز لہجے میں بولیں۔

”آپ لوگ فرنیچر اور کچھ الیکٹرونکس کا سامان نہ لیں۔ نقد کیش دے دیں، ہم صادق آباد اچھی مارکیٹ سے خریدیں گے۔ بات تو ایک ہی ہے۔ لیکن سامان محفوظ رہے گا۔“ زینب کا لالچ زبان پر آ گیا۔ گڈی کی ماں نے جیولری بستر، کپڑے اور کچھ سامان تیار کر رکھا تھا۔ بار بار مجبور کرنے پہ جمال دین متفق ہو گئے۔

اس سامان کے علاوہ باقی سامان کے لیے نقد کیش ادا کر دیا۔ گڈی کے بھائیوں نے باپ کا ہاتھ پٹایا حالانکہ اکرم اور اسلم ابھی خود بچے تھے، آپا گڈی کی شادی پہ جوش و ولولہ عروج پہ تھا۔

گڈی موسم کی گڑیا بنی۔ گاجری رنگ کے غرارہ سوٹ میں گاجری صادق آباد کی منٹھار بس پہ سوار ہچکولے کھاتی سرال آ گئی۔

☆ ☆ ☆

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ کدوگر

نوزیہ یاسمین



32735021

کے باقی سب کنوارے۔ زینب نے بھی اپنا گھرنہ بسایا۔ شادی کی اگلی رات واپس آگئی اور طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ خود مختار ضدی اور ہٹ دھرم، طلاق کے بعد دوبارہ شادی نہیں کی اور نہ ہی باقی بھائیوں کے گھر بسائے۔

☆☆☆

آہستہ آہستہ گڈی کو احساس ہونے لگا۔ یہاں تو ہر طرف زینب بیگم کی حکومت ہے ناز و نعم سے پٹی گڈی سارا دن کاموں میں گھن چکر بنی رہی شوہر نامدار کالج چلے جاتے۔

”حفیظ! میں نے پچھڑ دینے ہیں داخلہ بھیج دو“ گڈی نے ڈرتے ڈرتے شوہر کو مخاطب کیا۔ ”بس بی بی! پڑھ لیا جتنا پڑھنا تھا کرتا تو ہانڈی چولہا ہے۔ کون سا افسر بن جائے گی۔“ زینب بیگم تنکا کر برس پڑیں۔

اور گڈی نے ساری رات سسکیوں میں گزار دی۔ رہی سہی کسر بڑی دونوں نندیں باجی نصرت اور کشور پوری کر دیتیں۔ گڈی نے ہونٹ سی لیے اور اماں ابا کو بھٹک نہیں پڑنے دی۔

ابھی شادی کو ایک سال ہوا اور زینب بیگم نے شور مچا دیا۔

”آئے ہائے! سال سے اوپر ہو گیا حفیظ کے ساتھ جن کی شادیاں ہو میں باپ بن گئے اور جمال نے یہ بھڑکنا ہمارے لیے باندھ دی۔“ گڈی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

سال میں دو بار میکے آئی۔ ”گڈی کے ابا! گڈی اپنے گھر خوش نہیں لگتی۔“

سائرہ بیگم نے اپنی تشویش ظاہر کی۔ لیکن گڈی نے سب اچھا ہے کہہ کر بات ٹال دی۔ اپنے سے چھوٹی شاہانہ اور شازمہ کو دیکھ کر چپ کر گئی کہ کہیں میرا گھر خراب ہونے سے ان کی زندگی نہ خراب ہو جائے۔ ظلم کی چکی میں پستا گڈی کا مقدر ٹھہرا۔

بہن رحمت ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن

نصیبوں سے لڑ نہیں جاسکتا۔ گڈی پھر سے سسرال چلی گئی ماں باپ کے چہروں پہ سوالیہ نشان چھوڑ کر۔ جمال دین بیٹی کا چہرہ دیکھ کر خود بھی مرجھا سا گیا۔

☆☆☆

گڈی نے زینب بیگم کے اصولوں پر زندگی ڈال دی، شوہر کی ڈور تو پہلے ہی زینب خاتون کے ہاتھوں میں تھی۔

”حفیظ، مجھے پڑھنے دیں۔ گھر کے سارے کام میں کر لیتی ہوں پھر میری پڑھائی پہ اعتراض کیوں؟“

”جو پھوپھو کہتی ہیں۔ اس گھر میں ہوتا وہی ہے۔ اماں کو دیکھ لو، بھی ان کے فیصلوں کے خلاف جانے کی جرات نہیں کی۔“ حفیظ منمنایا۔

”میرے ابو کو اگر پتا چل گیا۔ یہاں میرے ساتھ یہ ہو رہا ہے تو وہ کتنا ہرٹ ہوں گے میں ان کی عزت کی لاج رکھ رہی ہوں۔“ گڈی روئی نہیں لیکن اسے لگتا تھا وہ رو دے گی۔

”میں سمجھ سکتا ہوں، لیکن میں بھی مجبور ہوں میری پوزیشن تمہارے سامنے ہے۔ ابھی میرے پاس کوئی نوکری نہیں پھوپھو کی ہر جائز ناجائز بات ماننا ہماری مجبوری ہے۔“ رات دیر تک حفیظ احمد گڈی کو حوصلہ دیتا رہا۔

اچھے دنوں کے انتظار میں گڈی دن بدن سوکھ کر کاشانی جارہی تھی۔

☆☆☆

ایک دن اچانک چھٹی دوپہر میں، کام کرتی گڈی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ زینب نے کھڑکی کی اوٹ سے دیکھا اور انجان بن کر چارپائی پہ لیٹ گئیں۔

باجی کشور اور نصرت زمینوں پہ کپاس چٹائی کر کے گھر داخل ہوئیں اور محن میں کپڑوں کے تار کے پاس گری گڈی کو اٹھایا۔ شور پہ زینب بیگم کمرے سے وارد ہوئیں۔

”کیا غضب ہو گیا جو اتنا شور مچا رکھا ہے۔
میری طبیعت کا خیال کر لیا کرو۔ ابھی گولی کھا کر
سولی بھی۔“

”گڈی بھا بھی بے ہوش ہو گئیں۔ ڈاکٹر کو بلا
لاؤں؟“ نصرت فوراً بولی۔

”ایسے بی بی، رہنے دے گرمی کا بلکا سا چکر
ہے غنڈا پانی منہ پر پھینکو۔“ زینب کی بے بسی عروج
پر تھی۔

چھوٹی تندہ نو شاہہ دل کی اچھی تھی کسی کی پروا
کے بغیر وہ بھاگ کر گاؤں سے لیڈی ڈاکٹر بلا لائی

”ایسی حالت میں احتیاط کرنی چاہیے۔“
ڈاکٹر بولی۔

زینب بیگم کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھیں۔

”کیا مطلب؟ ایسی حالت؟“

”آپ کی بہو پر یکھٹ ہیں آپ کو نہیں
معلوم۔ اس کا شوہر کہاں ہے؟“

”بھائی! اس وقت یونیورسٹی ہیں۔“ نو شاہہ
بولی۔

پھر نو شاہہ نے بھا بھی کا ہاتھ پکڑا اور کمرے
میں چکھچلا کر لیٹا دیا۔

”آپ اپنے حق کے لیے آواز کیوں نہیں
اٹھاتیں۔“

”کیا بولوں نو شاہہ، جب تمہارے بھائی
میرے ساتھ نہیں کھڑے۔ پھوپھو کے فیصلوں پر

کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔“ گڈی کی آنکھوں میں کی
درا آئی۔

گڈی کا ساتواں مہینہ چل رہا تھا جب اس
کے والدین اسے اپنے ساتھ لینے آ گئے۔

زینب بیگم نے فون کھڑکا کر گڈی کے
والدین کے کالوں میں یہ بات ڈال دی۔

”ہمارے یہاں یہ رواج ہے بہو ویں پہلے
بچے کی پیدائش میسے میں کرتی ہیں۔“ زینب بیگم کی

اس بات کی تائید کرتے ہوئے گڈی کے والدین

اسے اپنے گھر لے آئے۔ گڈی کے کانوں میں
زینب بیگم کی کچھ دنوں پہلے والی باتیں کھٹک رہی
تھیں۔

”دیکھ بی بی! مجھے پوتا چاہیے۔ ہمارے
خاندان کا پہلا وارث بیٹا ہی ہونا چاہیے۔“ خیرالنسا

اس گھر میں اس مقام مرتبے پر اس لیے نہیں پہنچ
پائی کیونکہ اس نے پہلے تین بیٹیاں پیدا کیں۔ پھر

کھنکس جا کر ایک بیٹا پیدا کیا۔ اس کو میں نے بالا
پوسا ہے۔ خیرالنسا نے صرف پیدا کیا ہے۔ اس کی

اگلی ماں میں ہوں۔ ساری زندگی میرا فرماں بردار
رہے گا۔“ سنی سی گڈی کے وجود میں دوڑی۔

☆☆☆

”باجی آگئی!“ سب چھوٹے بہن بھائی
والہانہ انداز سے گڈی سے لپٹ گئے۔

”باجی آپ! جلدی کیوں نہیں آتیں؟ مجھے
شاہانہ آ پانکھانیاں نہیں سناتیں۔“

آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے چھوٹا بھائی
صائم گڈی سے لپٹ گیا۔ کی گڈی کی آنکھوں میں

جھللا گئی۔

”اب بہت سارے دن آپ ہمارے ساتھ
رہیں گی نا۔۔۔۔۔؟“

”جی شازمہ سوالیہ نشان بنی گڈی آیا سے
مخاطب تھی۔“ ”بہت سارے دن رہوں گی۔“

گڈی نے مسکرا کر صائم اور شازمہ کے سر پر ہاتھ
پھیرا اور اپنے کمرے میں آ کر اک سکون محسوس

کیا۔

صبح فجر کی نماز پڑھ کر گڈی اماں کے پاس آ
گئی۔

”کیا بات ہے گڈی؟ کوئی خوشی تیرے
چہرے پر مجھے نظر نہیں آتی، تو اپنے گھر میں خوش تو

ہے، حفیظ تیرا خیال رکھتا ہے۔“

”ٹھیک ہوں اماں!“ آنکھوں کے گوشے
پانیوں سے نہاب بھر گئے۔ ماں کا دل کٹ کر رہ گیا
جو خدشات تھے آج گڈی کی آنکھوں نے سچ

اماں کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ مٹی کی ہانڈی میں لکڑی والے چولہے پہ بنے کریلے گوشت ساتھ میں گڈی کے پسندیدہ گڑ والے چاول۔

”آپا! اب میں بھی گڑ والے چاول بنا لیتی ہوں، اماں نے مجھے سب سکھا دیا ہے۔“
بھلی بہن شاہانہ خوش خوشی بتا رہی تھی اور جمال دین اپنی بیٹی کے کمر درے ہاتھ جو بھی سفید اور نرم و ملائم ہوا کرتے تھے۔ نکلے جارہا تھا۔ بمشکل دو انونے منہ میں ڈالے اور تمکین کسی اک گھونٹ گھونٹ اتار رہے تھے۔

☆☆☆

صبح سے گڈی کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اماں نے گاؤں کی ہیلتھ ورکر کو بلوایا۔ اس نے بڑی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا کہا۔۔۔ دوسووں اور تکلیف میں پور پور ڈوبی مسرت نسیم ہسپتال پہنچ گئی۔۔۔ ننھے بچے کی قفقاریوں سے گڈی بیدار ہوئی۔ ڈری سکھی۔ نرس ہاتھوں میں ننھا وجود تھا۔

”مبارک ہو! ماشاء اللہ سے بیٹی ہوئی ہے۔“
اور گڈی کو یوں لگا پورے ہسپتال کی چھت اس پہ آگری۔

☆☆☆

سائرہ بیگم نانی بن گئیں اور جمال ناتا۔ خوشی سے دونوں کے چہرے ہنستا رہے تھے۔

”دیکھو گڈی! یہ ننھی بچی پریم ماں بن گئی ہو۔“
”ماں..... آں میں بھی آج ماں بن گئی۔“
ایک عجیب پر کیف احساس اپنی جنت کو گود میں لے کر گڈی زار و قطار روئے جارہی تھی۔ فرط اشتیاق سے سینے سے لگائے جانے لگتے لمحے بیت گئے۔

”میں ابھی حفظ احمد کو فون کرتا ہوں۔“
”نہیں اب! نہیں ابھی نہیں.....!“ ہندیانی کیفیت گڈی پہ طاری ہوئی۔
”یوں بھئی وہ باپ بن گیا۔ اسے اس

ثابت کر دیے۔ منہ پر دوپٹہ دھرے اماں کتنی دیر سسکتی رہی۔ بیٹیوں کے دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں ماؤں کے جگر چھلنی کر دیتے ہیں۔ ابھی رات ہی تو گڈی اماں کی گود میں سر رکھ کر پوچھ رہی تھی۔

”اماں، کیا میرے ہاں بیٹا ہی ہوگا.....؟“

پھوپھو زینب کا ساٹ لہجہ اور دمکلی۔
”اگر بیٹی پیدا کی تو گڈی، اس گھر کے دروازے پہ دوبارہ مت آنا۔“ سسرال میں صرف اس کی ساس خیر النساء کے علاوہ کوئی ہمدرد نہیں تھی کہ شوہر بھی زینب بیگم کے اشاروں پہ چلتا ہے۔ خیر النساء کی حیثیت تو اس گھر میں نوکروں سے بھی گئی گزری تھی۔ رشتہ مانگنے صرف قاریلی کے لیے ہی خیر النساء کو اہمیت دی گئی تھی ان کا اصل مقام گڈی نے وہاں دو سال گزار کر اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

شام کو گڈی حویلی کی چھت پر آ گئی۔ میرے بابا کی حویلی، دیواروں پہ ہاتھ پھیرتے آہیں بھرتی رہی۔ ”میں تو یہاں کی راج دلاری تھی۔ اللہ جی! کیسے نصیب پائے میں نے۔“

آہٹ پہ پیچھے مڑ کر دیکھا صائم چپ چاپ گڈی آپا کو گتے جارہا تھا۔

یہ تو میری وہ گڈی آپا نہیں جو مجھے اٹھایا کرتی تھی۔ اس کے پاس رات رات بھر کہانیاں سنا کرتا تھا۔ ننھے سے دماغ میں طوفانوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آپا تو ہر وقت ہلکھلائی پھول پرندوں سے گھیلی، محن میں رونق لگائے رکھتی تھی۔ اپنی دوست نسرین کے ساتھ گڈی گڈے کے کھیلوں میں مگن۔ سلیقہ شعار، ذہین و فہم گڈی آپا اب یہ اجڑی لاش۔

”گڈی آپا! رات ہونے والی ہے آئیں ننھے چلتے ہیں ابھی زمینوں سے آگئے ہیں سب پہلے کی طرح ساتھ میں کھانا کھاتے ہیں۔“
گڈی نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائی اور صائم کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔

وقت یہاں ہونا چاہیے تھا۔“
 ”ابا، گھر جا کر بتا دیں گے۔“
 ”جیسے تو کہے پتر.....!“

اطلاع ملنے پر گڈی کے سرال میں بالکل خاموشی۔ گہری چپ ابا نے فون پر حفیظ احمد سے پوچھا۔

”بیٹا! آ جاؤ تیری بیٹی کا نام رکھنا ہے۔“
 ”انگل کوئی سا بھی رکھ لیں ہمیں آنے میں کچھ دن لگیں گے زینب پھوپھو ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم کچھ دن میں چکر لگائیں گے۔“
 راہ نکلتے نکلتے تیس دن بعد منی پری کو نانا اور ماموں نے زوباریہ کی شناخت سے نوازا دیا۔

☆☆☆

پھر ایک دن اچانک اطلاع دیئے بغیر جب زوباریہ سوا مہینے کی ہو گئی، زینب بیگم، ہمراہ زوباریہ کی کشور پھوپھو اور نام نہاد والد حفیظ احمد دوستے کھلونے کچھ گھٹیا سے تحائف سمیت آن دھمکے۔ اک شور، طوفان سا بھانت بھانت کی آوازیں۔ سینہ کو پی کرتی زوباریہ کی پھوپھو اور حفیظ احمد کی پھوپھو۔

”آئے ہائے! ہمارے سب ارمانوں پہ پانی پھر کیا کیسے چاؤ سے ہم نے بیٹے کی خریداری کی نصرت نے اپنے ہاتھوں سے سویٹر بنا، جینتے کے لیے اور دیکھو آئی کیا پھر وہی بیٹی.....“

اس گارے مٹی سے بنے کچے مکان میں رہنے والے ایمان کے کچے ہی نکلے۔ واویلا کرتے یہ نہیں سوچا کہ ہم بھی پیشیاں ہی ہیں۔ اور کسی بیٹی کی ہی یہ تخلیق ہے۔

گڈی کسی مجرم کی طرح ایک کونے میں ایستادہ۔ حفیظ احمد خاموشی کا لبادہ اوڑھے جو سکھا کر لایا گیا تھا صوفہ پہ بیٹھا نظریں جھکی اور تائی اماں کی زہر آلود مسکراہٹ۔

”بہن زینب اب بس بھی کرو اتنی دور سے سفر کر کے آئی ہو آؤ میرے ساتھ کچھ آرام کر لو۔“

تینوں نفوس تائی کی رہنمائی میں اس کے پورشن میں داخل ہو گئے۔

”ابا آپ یہاں دیوار کے ساتھ کیوں بیٹھے ہو۔“

”کتنے صبر والی ہوا تے عرصہ سے اذیت میں مبتلا ہو۔ ابا ہوں تمہارا، کیوں پرایا کر دیا۔“

”نہیں ابا.....! میں بہت خوش رہی ہوں۔“
 ”تمہارا نام میں نے مسرت رکھا۔ پر خوشیاں نہ دے سکا۔ یہ کیسا فیصلہ کیا میں نے تیرا مقدر بگاڑ دیا۔“

”آپ دنیا کے سب سے اچھے ابا ہو۔ میں کہہ رہی ہوں نا۔“

”میری پھول سی بچی رل گئی۔ کبھی غور سے دیکھا ہے پہلے والی گڈی اور یہ کون ہے.....؟ تیرے بچپن کی پہلی چوٹ میں آج تک نہ بھولا اور اب وجود لہو لہان زندہ لاش کی مانند۔ تیری کلائی جس پر چوڑیاں کھلتی تھیں۔ آج روح زخموں سے نڈھال۔ میں باپ ہوں مجھ سے بہتر اپنی گڈی کو کون جانتا۔ اب وہی ہوگا جو تیرا فیصلہ ہو گا۔“

”ابا، میں وہاں نہیں جاؤں گی پھوپھو زینب بہت ظالم ہیں۔ اور پھر میں نے بھی فیصلہ کر لیا اب گھٹ گھٹ نہیں جیوں گی مجھے اپنے ابا کی تربیت پہ فخر ہے۔“

”آج خلع کے کیس والے سپر پر سائن کرتے گڈی کے ہاتھ نہیں کانپے اس کے اس فیصلے میں اس کے ساتھ کھڑے تھے، اعتماد بڑھ گیا۔ جہیز کے نام پہ مولی بھاری رقم پھوپھو کیسے ہضم کر سکتی تھی۔“

ایک دو بار صبح کی کوشش پہ تائی اماں نے زینب بیگم کو اور بڑا داد دے کر بری عورت ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ابا دنیا سے رخصت ہو گئے اور گڈی کو باقی بہن بھائیوں کی ذمہ داری سونپ گئے۔

☆☆☆

آہستہ دورِ غمی رہتا

نگاہوں کے سمندر کو بڑھ ڈھانپ کر رکھنا
 کہ اس کو لوگ پڑھتے ہیں
 لبوں کو بھیج کر رکھنا
 کہ شکوے اور شکایت کا کوئی موسم نہیں ہوتا
 یہ جو دل ہے بہت ہی خوب صورت ہے
 مگر اُلجھا ہوا دل ہے
 بہت آقا پروردہ
 یہیں ساکن برستا ہے
 اسی میں روگ پلتے ہیں
 تم اپنے دل کی حق کو ہمیشہ ان لکھا رکھنا
 کسی بھی بدگماں موسم کی دوسط میں بھی مت لکھنا
 کبھی تم ان کہے سینوں کو تعبیر میں بنالینا
 کبھی تم آئینہ رکھنا پھر اس سے گفتگو کرنا
 سدا شاداب ہی رہنا
 کبھی غمگین نہ ہو جانا
 یہاں سب کی نگاہ بد تمہیں گھائل ہی کر دے گی
 یہ دنیا ہے
 گدھوں کی بادشاہت ہے
 تمہیں جو فوج چھینکے گئے
 ہراساں ہو نہ جانا
 بہت ہی دل نشیں ہو کر بہت انجان ہو جانا
 ہمیشہ دورِ غمی رہنا
 سنو تم دورِ غمی رہنا

ناہید عزی

سکون سے طن سے فراغت کی راحت سے بھی گئے
 تجھے گتوا کے... بھری کائنات سے بھی گئے

جدا ہوئے تھے مگر دل کہیں نہ ٹوٹا تھا
 خفا ہوئے تو ترے التفات سے بھی گئے

پلے تو نیل کی گہرائیاں تھیں آنکھوں میں
 پلٹ کے آئے تو موجِ فزات سے بھی گئے

خیال تھا کہ تجھے پلے کے خود کو ڈھونڈیں گے
 تو مل گیا ہے تو خود اپنی ذات سے بھی گئے

بچھڑ کے خط بھی نہ لکھے اداس یادوں نے
 کبھی کبھی کی ادھوری سی بات سے بھی گئے

و شاخ شاخ چلکے ہوئے بدن محسن
 مجھے تو مل نہ سکے تیرے ہاتھ سے بھی گئے
 محسن نقوی

سنگی سنگی

”اے پیاری لڑکی! میں اپنے دل کے سادہ ورق پر تمہارا نام تحریر کر سکتا ہوں؟“
”ضرور کر سکتے ہیں، لیکن براہ کرم اسے شائع مت کیجیے گا۔“ سیکریٹری نے شرماتے ہوئے کہا۔

نہند

ایک خاتون نے اپنے شوہر کو چوروں کے ہاتھوں بٹے دیکھ کر بڑی کومد کے لیے پکارا۔ ”بھالی ذرا جلدی آنا، میرے شوہر کو چار آدمی مل کر پیٹ رہے ہیں۔“
بڑوی سویا ہوا تھا ہڑا کر اس نے ذرا سی آنکھ کھولی اور وہیں سے لیٹے لیٹے جواب دیا۔
”چار آدمی کم ہیں جو مجھے بھی بلارہی ہو۔“

شرط

ایک عورت نے ایک وکیل سے پوچھا کہ ”طلاق لینے کے لیے کیا شرائط لازمی ہوتی ہیں؟“
وکیل نہایت سنجیدگی سے بولا۔
”طلاق لینے کے لیے آپ کا شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔“

مبالغہ

”کیا آپ کا نیا ملازم واقعی بہت قابل ہے۔“
ایک صاحب نے اپنے دوست سے پوچھا۔
”ارے صاحب! اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے اسے تو اگر آپ مشین میں ملک ٹیک بنانے کے لیے کہیں گے تو وہ سب چیزیں جگ میں ڈالنے کے بعد کئی دن تک اس آس پر جگ پڑے کھڑا رہے گا کہ شاید زلزلہ آئے اور ملک ٹیک خود بخود بن جائے۔“ ان صاحب نے غصے میں جواب دیا۔

مدد

دو عمر رسیدہ خواتین ایک بڑی کہنی کے دفتر میں داخل ہوئیں جب ڈائریکٹر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ”ہماری تنظیم بھنگی ہوئی خواتین کی مدد اور اصلاح کا کام کرتی ہے۔ کیا آپ اس کام کے لیے چندہ دینا چاہیں گے؟“
”میں چندہ ضرور دوں گا مگر آپ کے توسط سے نہیں ڈائریکٹ ان خواتین کو دینا پسند کروں گا۔“ ڈائریکٹر نے جواب دیا۔

حیرانی

شادی کے بعد میاں بیوی صحت افزا پہاری مقام پر بنی مون منانے گئے تو ہوٹل کے منیجر نے نام پوچھے بغیر اندراج کر لیا۔ یہ دیکھ کر بیوی بہت حیران ہوئی اور کہنے لگی۔
منیجر صاحب! آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم ہوا؟
منیجر بولا۔ ”محترمہ! آپ کے شوہر ہر سال ہمارے ہی ہوٹل میں بنی مون منانے آتے ہیں۔“

ذہانت

ایک پٹھان سے کسی نے پوچھا
”خان جی عقل بڑی کہ بھیئیں؟“
پٹھان نے اس کی طرف غور سے دیکھا اپنی ٹوپی اتار کر سر کھجایا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”یار پہلے تاریخ پیدائش تو بتاؤ۔“

احتیاط

ایک پبلشر نے اپنی سیکریٹری سے کہا۔

شکوہ جہ اولیٰ حوالہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی آدمی اپنے بھائی کے پیغام نکاح پر، نکاح کا پیغام نہ بھیجے۔“ فوائد و مسائل:

☆ جب کسی عورت کے لیے اس کے گھر والوں سے بات چیت ہو رہی ہو اور رشتہ طے پا جانے کی امید ہو تو دوسرے آدمی کو اس عورت کے لیے بات چیت شروع نہیں کرنی چاہیے۔

☆ اگر محسوس ہو کہ ابھی عورت نے اس مرد کو قبول کرنے کا فیصلہ نہیں کیا اور اس کی طرف واضح میلان نہیں تو دوسرا آدمی بھی پیغام بھیج سکتا ہے تاکہ عورت فیصلہ کر سکے کہ اس کے لیے ان دونوں میں سے کون سا مرد زیادہ مناسب ہے اور اس کے سرپرست بھی معاملے پر بہتر انداز سے غور کر سکیں۔

☆ اس ممانعت میں یہ حکمت ہے کہ مسلمانوں کے باہمی معاملات میں بگاڑ پیدا نہ ہو اور آپس میں ناراضی پیدا نہ ہو۔

(سنن ابن ماجہ ۱۸۶۸)

حضرت عمرؓ نے فرمایا

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ آدمی کے برا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

مسلمان کے عیب چھپانا

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ ایک لڑکی سے برا کام ہو گیا جس کی اسے شرعی سزا مل گئی پھر اس کی قوم والے ہجرت کر کے آئے اور اس لڑکی نے توبہ کر لی اور اس کی دینی حالت اچھی ہو گئی۔ اس لڑکی کی شادی کا پیغام اس کے چچا کے ہاں آیا تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے اس کی بات بتائے بغیر شادی کرتے تو یہ بھی ٹھیک نہیں، امانت داری کے خلاف ہے اور اگر بتا دے تو یہ بھی ٹھیک نہیں، ستر مسلم کے خلاف ہے۔ اس کے چچا نے یہ بات حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو بتائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا (بالکل نہ بتاؤ اور) اس کی ایسے شادی کر دیجیے تم اپنی نیک بھلی لڑکیوں کی کرتے ہو۔

(حیاء الصحابہ، حصہ دوم)

علم کا احترام

امام مالکؒ سے خلیفہ ہارون رشید نے درخواست کی کہ اس کے لڑکوں کو امام مالکؒ کی آکر پڑھا دیں۔ امام صاحب نے محل جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

”جس کو شوق ہو، اس کو خود آنا چاہیے۔“

لہذا خلیفہ وقت ہارون رشید اپنے بیٹوں خلیفہ امین اور مامون کو لے کر خود آیا۔ وہاں بے شمار طلباء

حضرت عمر کا زہد

حضرت ابو حازم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ کے ہاں گئے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ٹھنڈا شوربا اور روٹی رکھی اور شوربے پر تیل ڈال دیا تو حضرت عمرؓ نے کہا۔

”ایک برتن میں دو سالن (ایک شوربا اور دوسرا تیل) میں مرتے دم تک ایسے سالن کو نہیں چکھ سکتا۔“

موجود تھے۔ خلیفہ کہنے لگا۔
 ”اس بھیڑ کو الگ کر دیجیے۔“

امام مالک نے جواب دیا۔
 ”دو افراد کے فائدے کے لیے تمام طلباء کا نقصان نہیں کیا جاسکتا۔“
 چنانچہ شہزادوں کو بھی عام طلباء کے ساتھ پڑھنا پڑا۔

عقل و دانش کی باتیں

بعض اوقات اللہ کا بندے کی درخواست کو قبول نہ کرنا بندے پر شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے۔
 ☆ دین کی اصل عقل، عقل کی اصل علم اور علم کی اصل صبر ہے۔ لہذا صبر کا دامن ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑو۔

(شیخ عبدالقادر جیلانی)

دوسروں کی مدد

عالمی شہرت یافتہ نفسیات دان ڈاکٹر کارل منیگر نے ایک مرتبہ کہا تھا۔ ”اگر تمہیں علم ہو کہ کسی شخص کا نروس بڑیک ڈاؤن ہونے والا ہے تو تم اسے کیا نصیحت کرو گے؟“

سامعین کو توقع تھی کہ ڈاکٹر منیگر کہے گا کہ اسے کسی نفسیاتی معالج کے پاس جانا چاہیے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ اس نے کہا۔ ”میں اس شخص کو نصیحت کروں گا کہ وہ شہر کی دوسری جانب جائے۔ کسی ضرورت مند کو ڈھونڈے اور اس کی مدد کرے۔ ایسا کرنے سے اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

رضا کار بنو، اس سے تم میں اپنے قابل قدر ہونے کا احساس جنم لے گا۔ جس طرح تمہیں توقع ہے کہ دوسرے تمہاری مدد کریں اسی طرح دوسروں کی مدد کرو گے تو تم میں طمانیت کا احساس پیدا ہوگا۔ صلے کی توقع کے بغیر دینے سے انسان کی عزت نفس بڑھ جاتی ہے۔

صحت مند شخصیت کا حامل فرد نا صرف حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے بلکہ دینے کا بھی۔

بار بار غلطی دہرانا

پاکل پن کی ایک تعریف یہ ہے کہ انسان بار بار ایک ہی کام کرتا ہے اور مختلف نتائج کی توقع رکھتا ہے۔ تم جو کام کر رہے ہو اگر اسے جاری رکھو گے تو تمہیں وہی کچھ حاصل ہوگا۔ جو کچھ تمہیں حاصل ہو چکا ہے۔

عمدہ کام

مائیکل انجلو ایک مجسمہ پر کئی دن سے کام کر رہا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر بار بار دیر تک کام کر رہا تھا۔ ایک دیکھنے والے نے سوچا کہ وہ غیر اہم کام کر رہا ہے۔ اس نے مائیکل انجلو سے پوچھا کہ ”وہ اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے؟“ مائیکل انجلو نے جواب دیا۔

”کامیاب چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ابھرتی ہے اور کامیاب کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔“
 اکثر لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی کام آپ نے کتنی دیر میں کیا تھا لیکن یہ یاد رکھتے ہیں کہ آپ نے کس عہدگی سے کیا تھا۔

راز کی بات

ایک شخص عبدالملک بن مروان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔

”آپ سے کچھ راز کی بات کہنا چاہتا ہوں۔“
 عبدالملک نے اپنے مصاحبوں سے غلطیے کا کہا۔ وہ سب لوگ اٹھ گئے تو آپ نے اس شخص سے کہا۔

”دیکھو، میری مدح نہ کرنا۔ میں اپنے آپ کو خوب پہچانتا ہوں۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ جھوٹا بخیر سزا پائے میرے پاس سے بچ کر نہیں جاسکتا اور نہ کسی کی لگائی بھائی کرنا کیونکہ چنل خوری سب سے بڑا جرم ہے۔ اب کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“
 وہ شخص کچھ نہ بولا۔ اٹھ کر چلا گیا۔

☆☆

خدا کے رسول کے گامِ مبارک

ٹوبہ قطب..... کراچی
نہ جانے کتنے محاذوں پر جنگ تھی میری
بس ایک وعدہ نبھانے میں اپنے گھر جاتا
حبیبہ خان..... مانسہرہ

دن ڈھل گیا تو آئے وہ ملنے کے واسطے
یارب ہماری عید ہوئی بھی تو شام کو
رقیہ احمد..... لاہور

ہر کسی کے لیے کہاں ہوتی ہیں عید کی خوشیاں
سر نہیں لاتا ہے کہاں سب کے لیے عید کا چاند

سعدیہ طیب..... فیصل آباد
ہر طرف گل کھلیں مسرت کے
تم جو آؤ تو عید ہو جائے

ماریہ خان..... لاہور
عید کا چاند ہے ہر سمت ہے گہما گہما
آنا چاہوں میں تیرے پاس تو آؤں کیسے
میری ہر سانس امانت ہے تیری یادوں کی
ٹوٹ کر اس سے زیادہ تجھے چاہوں کیسے
فاکیمہ سہیل..... کراچی

روشنے والے اگر اجازت ہو
عید کے روز ملنے آجاؤں
اقصی اکبر..... لاہور

کبھی تو خواب میں آؤ کہ عید کا دن ہے
رخ جمال دکھاؤ کہ عید کا دن ہے
فرح..... ایبٹ آباد

یوں تیری چاہتیں سنچالی ہیں
جیسے عیدی ہو میرے بچپن کی
زرناب بیل..... تینو پورہ

عید کا چاند نظر آئے گا جس دم تجھے کو
میں تیرے وصل کی اسے دوست دعا مانگوں گا

کون فل میراں..... تینو پورہ
میں ہوں تیرا خیال ہے اور چاند رات ہے
دل درد سے غم حال ہے اور چاند رات ہے
شرین فضل میرا..... چچو کی لمبیاں

تارے اترے جب پھیلا یا دامن کو
عید کے چاند میں دیکھا میں نے ساجن کو
شائستہ نسرین..... اسکیم 33 کراچی

میں نے اک عمر کے خوابوں کو تیرے نام کیا
اپنے احساس کو کر میرے حوالے تو بھی
میں بھی دل میں تری تصویر چھپائے رکھوں
اپنے ہونٹوں سے میرا نام مثالے تو بھی

ریحانہ وقار..... حیدر آباد
تجھے کھوکھو کے سوچتا ہوں، میرے دامن طلب میں
کوئی خواب ہے تو کیوں ہے، کوئی آس ہے تو کیوں ہے
بھی پوچھ اس کے دل سے کہ یہ خوش مزاج شاعر
بہت اپنی شاعری میں جو اداس ہے تو کیوں ہے

رضوانہ وقاص..... ہری پور
پھر کہیں دور سے اک بار صدا دو مجھ کو
میری تنہائی کا احساس دلا دو مجھ کو
تم تو چاند ہو، تم کو میری ضرورت کیا ہے
میں دیا ہوں کسی چوکھٹ پر جلا دو مجھ کو

عبیدان..... کراچی
اک تبسم ہزار شکوؤں کا
کتنا پیارا جواب ہوتا ہے

مریم واحد..... پشاور
رات گہری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے کر بھی سکتے تھے
تم جو پھڑے تو یہ بھی نہ سوچا
ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے

قلیج کجھ دکنی

ایوب علیہ السلام کے سات لڑکے اور سات لڑکیاں تھیں۔ جو سب آپ پر آنے والی آزمائش کے دنوں میں انتقال کر گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی آزمائش ختم کی، تو انہیں مزید اولاد عطا فرمائی۔ روایت کے مطابق ان کی تعداد ستائیس تھی۔

”جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو پیغمبرانہ آزمائش میں مبتلا فرمایا، تو ان سے سب کچھ چھین لیا گیا۔

حتیٰ کہ طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہو گئیں اور جسم کا کوئی عضو صحیح سالم نہ رہا، سوائے دل و زبان کے، جن سے وہ ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہتے اور نہایت صبر کے ساتھ مصروف عبادت رہتے۔ پھر ان کا مرض اتنا طویل ہو گیا کہ کوئی ہم نشین بھی ساتھ نہ بیٹھتا تھا۔ دوست، احباب بھی وحشت کرتے، یہاں تک کہ انہیں شہر سے باہر ایک مقام پر ڈال دیا گیا۔ سب نے ان سے قطع تعلق کر لیا، سوائے ان کی ایک بیوی کے، جو دن رات ان کی خدمت میں مصروف رہتیں۔ حتیٰ کہ جب تنگ دستی حد سے بڑھ گئی اور تمام عزیز، رشتے دار، دوست احباب نے منہ موڑ لیا تو بھی اس صالح خاتون نے حضرت ایوب علیہ السلام کی خدمت و نگہبانی میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

کہا جاتا ہے کہ ”حضرت ایوب علیہ السلام پہلے انسان ہیں جنہیں چپک اور دیگر جلدی بیماریاں لاحق ہوئیں۔ روایت میں ہے کہ آپ کے پورے جسم پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے تھے اور یہ بھی کہ ”حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم سے گوشت تک جھڑ چکا تھا، صرف ہڈیاں اور پٹھے باقی رہ گئے تھے۔ بیوی باریک ریت لے آئیں اور ان کے نیچے بچھا دیتیں، تاکہ جسم

حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری اور بے مثال صبر

قرآن مجید میں ذکر ایوب پروردگار عالم نے حضرت ایوب علیہ السلام کو پختگی دین اور صبر و استقامت کے ضمن میں ایک امتیازی مقام عطا فرمایا۔ جو ان کی شخصیت کا حصہ بن کر رہتی دنیا تک کے لیے ضرب البثل بن گیا۔ ان کے صبر و شکر کی قرآن کریم نے تعریف کی اور ان کے کمال صبر پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ حضرت ایوب علیہ السلام کا تذکرہ قرآن کریم کی چار سورۃ مبارکہ میں آیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ فرشتوں نے حضرت ایوب علیہ السلام کی بہت تعریف کی، جس پر شیطان کو بہت حسد ہوا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ.....

”مجھے ان کے جسم اور مال و اولاد پر ایسا تسلط عطا کر دیا جائے، جس سے میں ان کے ساتھ جو چاہوں، سو کروں۔“

اللہ تعالیٰ کو بھی حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش مقصود تھی اس لیے شیطان کو یہ حق دے دیا گیا اور اس نے حضرت ایوب علیہ السلام کو اس بیماری میں مبتلا کر دیا۔

بیماری کی حالت میں حضرت ایوب علیہ السلام کے دل میں شیطان طرح طرح کے وسوسے ڈالاکرتا تھا۔ (واللہ اعلم)

حضرت ایوب علیہ السلام بہت امیر و کبیر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مال و دولت، شان و شوکت، محلات و جائیداد، لوکر چاکر اور کثیر اولاد سے نوازا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضرت

بعض مفسرین کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو جس بیماری میں مبتلا فرمایا، اس کی نوعیت سے متعلق نہیں بتایا گیا۔ جسم میں کیڑے پڑ جانا یا گوشت کا جھڑنا، اسرائیلی روایات کا حصہ ہے (واللہ اعلم)۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی شدید تکلیف کے پیش نظر ان کی اہلیہ نے کہا کہ ”اگر آپ اپنے پروردگار سے دعا کریں تو وہ آپ کو ان مصائب سے نجات عطا فرمادے گا۔“ جواب دیا ”میں ستر برس تک صحیح سالم رہا تو کم از کم اللہ کے لیے کچھ برس تو صبر کر لوں۔“

شیطان طیب کے روپ میں:

امام احمد بن حنبلؒ نے ”کتاب الزہد“ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ ”حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کے زمانے میں ایک بار شیطان ایک طیب کی شکل میں ان کی بیوی کے پاس آیا۔ انہوں نے اسے طیب سمجھ کر حضرت ایوب علیہ السلام کے علاج کی درخواست کی، تو شیطان نے کہا کہ ”میں اس شرط پر علاج کروں گا کہ اگر انہیں میرے علاج سے شفا ہو جائے تو یوں کہہ دیں کہ ”تو نے شفا دی“ میں اس کے علاوہ کچھ اور نذرانہ نہیں چاہتا۔“

بیوی نے پورا واقعہ حضرت ایوب علیہ السلام سے بیان کیا۔ واقعہ سن کر انہوں نے فرمایا ”بھلی مائیں! وہ طیب کے روپ میں شیطان تھا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دے دی تو میں تجھے سو گچیاں ماروں گا۔“ دراصل آپ کو اس بات سے سخت رنج پہنچا تھا کہ ان کی بیماری کی بدولت شیطان کا حوصلہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ ان کی اہلیہ سے ایسے کلمات کہلواتا چاہتا تھا جو ظاہرًا موجب شرک تھے، مگر کہ تاویل سے شرک نہ ہوں۔ یہ ایک واقعہ بھی ازالہ مرض کے لیے دعا کا باعث بنا۔

آسمان سے تصدیق:

ابن ابی حاتمؒ اور ابن جریرؒ نے فرمایا کہ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اللہ کے پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام کو اٹھارہ سال مصیبتیں آزمائشیں کھیرے رہیں پھر انہیں قریب والے، دور والے، سب چھوڑ گئے۔ سوائے ان دو شخصیات کے جو آپ کے خاص بھائی تھے۔ وہ آپ کے پاس صبح و شام آتے تو ایک مرتبہ ایک نے دوسرے کو کہا۔“

”تو جانتا ہے کہ اللہ کی قسم، شاید ایوب جیسا گناہ جہاں والوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔“

ساحمی نے دریافت کیا کہ ”وہ کیا ہے؟“

کہا کہ ”دیکھو انہیں اٹھارہ سال ہو گئے ہیں ان کی بیماریاں دور نہیں ہوئیں اور اب تک اللہ نے ان پر رحم نہیں فرمایا اگر ایسی بات نہ ہوتی تو رب ان کی بیماریوں کو دور فرمادیتا۔“

پھر دونوں شام کو حضرت ایوب علیہ السلام کے پاس گئے تو اس شخص سے رہا نہ گیا اور وہ حضرت ایوب سے اس بات کا ذکر کر بیٹھا۔

ابن ابی حاتمؒ فرماتے ہیں کہ ”حضرت عبید بن عمیرؓ سے مروی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے دو بھائی تھے، وہ دونوں ایک دن آپ کے پاس آئے تو آپ کے زخموں کی بو کی وجہ سے قریب نہ آ سکے اور ذرا دور کھڑے ہو گئے۔ پھر ایک نے دوسرے سے کہا کہ

”اگر اللہ تعالیٰ، ایوب علیہ السلام میں کوئی بھلائی دیکھ جائے، تو ان کو اس طرح امراض میں مبتلا نہ کرتا۔“ اس بات سے حضرت ایوب علیہ السلام کو اس قدر تکلیف ہوئی کہ پہلے کبھی کسی سے نہ ہوئی۔

چنانچہ آپ نے فوراً بارگاہ رب العزت میں دست التجا بلند کیے۔

”اے اللہ! تجھے علم ہے کہ میں نے کبھی کوئی

رات سیر ہو کر نہیں گزاری اور میں جانتا ہوں کہ بھوکے کا کیا مرتبہ ہے، تو میری تصدیق کر۔“ آسمان سے تصدیق ہوئی، جسے دونوں بھائیوں نے سنا۔ پھر فرمایا۔

”اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میرے پاس کبھی دو قمیصیں نہیں رہیں اور۔ میں مفلس کا مرتبہ جانتا ہوں، تو میری تصدیق فرما۔“ پھر آسمان سے تصدیق ہوئی اور دونوں بھائیوں نے سنا۔ پھر کہا۔

”اے اللہ! تجھے تیری عزت کا واسطہ“ اور یہ کہتے ہوئے سجدے میں گز پڑے اور فریاد دواتجا کرتے رہے۔“ (قصص ابن کثیر صفحہ نمبر 309)

حضرت ایوب علیہ السلام کی سخت ترین آزمائش کو ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ اس عرصے میں دنیا کی کوئی طاقت، کوئی ایذا، مصیبت و پریشانی ان سے صبر و شکر کے کلمات نہ چھڑوا سکی۔ شکوہ و شکایت اور جزع و فزع صبر کے منافی ہیں جن کا اظہار حضرت ایوب علیہ السلام نے بھی نہیں کیا۔ البتہ دعا صبر کے منافی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور ان سے کہا کہ زمین پر پیر مارو جس سے ایک چشمہ جاری ہو گیا اور اس چشمے کا پانی پینے سے اندرونی بیماریاں اور غسل کرنے سے ظاہری بیماریاں دور ہو گئیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ دو چشمے تھے، ایک سے غسل فرمایا اور دوسرے سے پانی پیا، لیکن قرآن کے الفاظ سے پہلی بات کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی ایک ہی چشمہ تھا۔

”حضرت ایوبؑ قضائے حاجت کے لیے نکلتے تھے تو ان کی اہلیہ ان کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتی تھیں۔ ایک دن وہ دیر سے آئیں۔

اسی اثناء میں رب عزوجل نے حضرت ایوب علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنا پاؤں مارو، یہ ٹھنڈے اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ تمہارے نہانے اور پینے کے لیے ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام دیر تک اس پانی سے نہاتے رہے، پانی جسم پر پڑتا جاتا تھا اور توانائی آتی

جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر صحت مند ہو گئے۔

ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے جنت سے ایک جوڑا بھجوایا تھا جسے پہن کر اور اپنی جگہ سے ہٹ کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ اتنے میں ان کی اہلیہ تشریف لائیں اور انہیں پہچان نہ سکیں۔ انہوں نے آپؑ ہی سے پوچھا۔

”اے اللہ کے بندے! یہاں ایک آفت زدہ شخص ہوتا تھا وہ کہاں گیا؟“ حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا۔

”میں ہی ایوب ہوں۔“

انہوں نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے بندے! آپؑ مجھ سے مذاق کرتے ہیں؟“

حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا۔

”میں ہی ایوب ہوں۔ میرے پروردگار نے مجھے میرا جسم لوٹا دیا۔“

جب آپؑ صحت یاب ہوئے تو ایک طرف سعادت مند، خدمت گزار بیوی تھی، دوسری طرف سو کوڑوں کی قسم بھی پوری کر لی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کی پریشانی دور کرنے کے لیے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ترجمہ:

”اور اپنے ہاتھ میں ٹنگوں کا ایک مٹھا۔ (جھاڑو لے کر ماروے اور قسم کے خلاف نہ کر۔) سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اسے بڑا صابر بندہ پایا۔

وہ بڑا نیک بندہ تھا اور بڑی ہی رغبت رکھنے والا۔“ (سورۃ ص آیت نمبر 44)

حضرت ایوب علیہ السلام کی ان خدمت گزار اہلیہ کے نام پر مورخین میں اختلاف ہے۔ کسی نے ان کا نام لیا بنت میثا ابن یوسف لکھا ہے تو کسی نے رحمت بنت ابراہیم ابن یوسف علیہ السلام۔ (واللہ اعلم)

(قصص ابن کثیر، معارف القرآن، قصص الانبیاء)

۲۵۸

بقیہ خط آپ کے

ترس آتا ہے۔ خالد زبیدہ کا دسترخوان میں انہوں نے نیکی کا کام شروع کیا۔ جوان کے مرنے کے بعد بھی نیکی کا عمل جاری رہا۔ اصل صدقہ یہی ہوتا ہے جو مرنے کے بعد بھی جاری رہے۔

آہ نیم کش میں نہیں پڑھتی ہو۔ مجھے اس کہانی کی سمجھ میں نہیں آتی اور انٹر سٹنگ بھی نہیں لگی۔ ”بہترین فیصلے“ نے ہنس دیا۔ چاہت کے انداز میں شکر ہے مائرہ کی عاشق سے جان چھوٹ گئی۔ عورت شکی مرد کے ساتھ کبھی زندگی نہیں گزار سکتی۔ چار بالشت کا فاصلہ افسانہ خیالی سا لگا اس میں کوئی خاص سبق نہیں تھا۔

گنگا کنارے فی الحال اچھی جارہی ہے مجھے لگتا ہے نعیمہ ناز سلطان 14 اگست تک کے حالات لکھیں گی (ہا ہا) فضیلت بیگم کی کبیر کے بارے میں غلط سوچ ہے۔ ضروری نہیں جس طرح کا باپ ہو اسی طرح کا بیٹے کا مزاج ہو۔ پچھلے ماہ کے شروع میں میری امی جان کا آپریشن ہوا تھا۔ الحمد للہ خیر سے ہو گیا ہے۔ پورا مہینہ مہمان آتے رہے امی جی کی عیادت کے لیے۔ اب مہمان کچھ آنا کم ہوئے ہیں۔ میں بھی پچھلے ماہ سے دوکیشنل ٹریننگ سنٹر سے کمپیوٹر کورس کر رہی ہوں۔ وہاں آٹھ بجے جاتی ہوں اور چار بجے واپس آتی ہوں۔ واپس آ کر گھر کے کام اور پڑھائی میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ کمپیوٹر کورس اس وجہ سے کر رہی ہوں آنے والا دور کمپیوٹر کا ہوگا۔ بندے کو چلانا لازمی آنا چاہیے۔ آپ سترہ مارچ کو میری سالگرہ ہے۔ میں اٹھارہ سال کی ہو جاؤں گی۔ سالگرہ مناتے تو نہیں ہیں لیکن بس وش کی جاتی ہے ہمارے درمیان آپ سب مجھے وش کریں مجھے خوشی ہو گی۔ اٹھارہ سال کی آج کے لیے کوئی نصیحت۔

ج: پیاری اقراء! آپ کو سالگرہ مبارک ہو اللہ تعالیٰ خوشیاں اور کامیابیاں عطا فرمائے۔ آپن نصیحت ایک نہیں دو کریں گے۔ کبھی کسی کا برانہ چاہیں اس کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ دوسری نصیحت اپنا کام دیانت داری اور خلوص کی ساتھ کریں اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیں۔ اللہ تعالیٰ

کبھی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔

اچھی بات یہ ہے کہ آپ بہت ذہین ہیں خط سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ آپ اتنی کم عمر ہیں۔

فرخندہ سلیم..... ملتان

شعاع کی تمام قارئین کو میٹھی عید بے حد مبارک ہو۔ اگر میرے تبصرے کوئی انجان پڑھے شاید تو سمجھے کہ صرف تعریفیں ہی ہیں مگر اب جب کوئی خامی ہی نہیں تو کیا تنقید کروں، سب ہی اچھا چل رہا ہے جو دلچسپ ہے اور وقت کے لحاظ سے ہے۔

سرورق پہلے برے لگتے تھے۔ مگر اب وہ بھی اس قدر پیارے ہوتے ہیں۔

فروری کے شعاع کا سرورق میرے پاس الفاظ نہیں کہ مجھے بے حد پسند آیا اتنا نفیس بلکہ رنگ کا سر پر آنچل رمضان کی وجہ سے بالوں میں پھول اور جوڑا بہت ہی کمال تھا اور مجھے تو ہلکے رنگوں میں یہ کریم رنگ بہت پسند ہے۔

”دھوپ درپچہ“ اب کافی دلچسپ کہانی ہو گئی ہے با آسانی قسطیں سمجھ میں آ جاتی ہیں اس قسط میں بہت سی چیزیں کلیر ہو گئیں۔

گنگا کنارے ایک حسین دور کی حسین سی داستان نعیمہ کے قلم سے۔ کہانی کو پڑھتے ہوئے دل کرتا ہے کاش میں اس زمانے میں جا سکتی۔ کتنی مکمل کہانی ہے نا، ہر چیز، کام، بات، انداز سب اس زمانے کا بہت مزہ آ رہا ہے جی جی کر پڑھ رہی ہوں۔ اتنے باوقار الفاظ ”دوسرے جی سے ہے“ کتنا اچھا تھا سب۔ ذہن کا کردار بہت دلچسپ ہے جو شہزادی کی طرح ہے۔ ہر کردار اپنی جگہ فٹ ہے مگر لگتا ہے آنے والے وقت میں دل خون کے آنسو روئے گا کہ ہجرت قریب ہے۔ رضیہ بٹ کا ناول بانو یاد آ جاتا ہے۔ یہ موضوع ہی ایسا ہے جتنا پڑھا جائے، لکھا جائے کم ہے۔

تیرے بعد افسانہ مثبت اور خود اعتمادی میں اضافہ کرتا بہت اصلاحی رہا۔ مہوش عروج کا افسانہ صدقہ جاریہ کہنا درست ہوگا جو انسانیت پر کتنی اچھی سوچ دے رہا تھا۔ واقعی دل کا سکون خدمت خلق میں ہے۔ میں خود یہ سوچتی ہوں کہ واقعی جانے کے بعد اچھے الفاظ میں یاد رکھا جانا

اصل کا سہا ہا ہے۔

نادیہ جہا فقیر کا بیٹا دن بعد افسانے کے سنگ آئیں جس میں دو ہری ساس اور لند کو اچھا سبق سکھایا گیا۔ آسیہ رئیس خان کی سہیل اور آدم کی دلکش سی داستان اور عدنان و عثمان کی ہادقار محبت اور عنایت جہاں کا جہاد و جلال بھرا کردار جس میں کتنے رنگ ہیں یہ سب پڑھتے ہوئے وقت اچھا گزرتا ہے۔ آسیہ کو پڑھتے ہوئے بھی خالص انداز اور طرز کی خوشبو آتی ہے نعیم کی طرح۔

”اپنوں کے درمیان“ ناولٹ پڑھ کر سکون سا ہوا اپنا پرانا وقت یاد آیا۔ دادی کا کردار سب سے زیادہ پسند آیا کہ فرشی شلوار والا قصہ دلچسپ لکھا۔

”چاہت کے رنگ“ افسانہ ایک قلم خالی کی اپنی بھانجی سے متعلق اچھے فیصلے کو ظاہر کرتی تعمیری تحریر تھی۔ یہ بھی جگہ ہے کہ اکثر بیٹے اپنے باپ پر ہوتے ہیں۔

قلمیہ رابعہ کا افسانہ سب ماؤں کو سکھارہا تھا اچھے سے کہ کیسے بچوں کی اچھی تربیت کرنی ہے۔

اس بار حمیرا علی کا ناول پورے ڈائجسٹ میں ٹاپ پر تھا جس کا اپنا ہی ایک الگ تجسس بھرا انداز اور الفاظ کا چٹاؤ تھا اور پلاٹ بھی اچھا رہا۔ ہیروئن کا انڈیا سے پاکستان آنا۔ کرداروں کے نام کافی منفرد تھے اور مشکل بھی۔ شفاف نام کی طرح اچھا کردار تھا۔ فارسیں اور دوسرا نام مشکل تھے مگر کردار اچھے تھے۔ مطلب رائٹر نے نہیں بتایا، میں بتا دیتی ہوں۔

فرامین عربی اصل : تیز فہم ، بصیرت رکھنے والا۔

شارمین عربی اصل : راستہ یا اصول مقرر کرنے والی۔

شفان عربی/فارسی نسبت : شفا یا آرام دینے والا۔

رج: پیاری فرخندہ اتھرنے کے بارے میں کیا کہیں۔ آپ تو اب شعاع کا حصہ بن گئی ہیں۔ ہر ماہ اتنے خوب صورت اور جامع فلمسٹی ہیں کہ ہمیں تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

رضوانہ وقاص کراچی ہری پور سے شریک محفل ہیں

سب کو روضان مہارک۔ ہنستا مسکراتا شعاع تین تاریخ کو ملا اور مادل بہت ہی پسند آئی ہے۔ سفید کپڑوں میں بالوں کا جوڑا ہاتھ کا دل بنا ہوا بہت ہی اچھا لگا۔

”پہلی شعاع“ پڑھا۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ ملدیہ ماؤں میں آگ لگی۔ ٹی وی پر ہر جگہ ایک ہی خبر یہ جو مجھے فون کرتی ہیں۔ کراچی سے زلزلہ آئی جن کا نانا لکھا ہے۔ ان کے بیٹے کی دکان تھی۔ کھلونوں کی، سامان دکان سب کچھ جل گیا۔ اور شکر ہے ان کا بیٹا بچ گیا۔ ”محمد و نعت پڑھی۔“ ”پیارے ننی کی پیاری باتیں“ واقعی پیاری ہوتی ہیں۔ ”فواد خان“ سے ملاقات ذرا اچھی نہیں رہی۔ جو لوگ آپ کو انٹرویو بنا پسند نہیں کرتے نہ لیا کریں۔ ”دستک“ بھی اچھی نہیں رہی چلیں یہ پتا چل گیا ہے۔ علی عباس آغا علی کا کزن ہے۔ آپ کے بھائی کا نام بھی آغا علی اور بھائی علی سکندر۔ ان فنکاروں کے انٹرویو لیتے ہیں تو پوری ٹیلی کی تصویریں بھی لیا کریں ماں۔ حسن خان۔ دانش تیمور۔ ”ابہ خان۔ آقان وحید، ہمایوں سعید۔ حرامانی۔ اور بھی بہت ہیں ان کے انٹرویو لیں۔

”دھوپ درپچ“ پڑھا نا مہدی کیسی ماں ہے جو کوئل کو یہ باتیں سکھا رہی ہے۔ حارث کوئل کی وجہ سے گھر سے نکالا گیا۔ حارث نے کوئل کو پسند کیا اور قصور وار اس کی ماں ٹھہرائی گئی۔ حارث کو سمجھ آئے گی لیکن دیر ہو چکی ہوگی۔ فائزہ کی سوتیلی ماں بہت ہی بری لگی کیسی ماں ہے۔

”تیرے بعد“ والدین فوت ہو جائیں یہ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ”خالہ زبیدہ کا دسترخوان“ اچھا لگا۔ غریب لوگوں کی مدد کرنی چاہیے۔ ”بہترین فیصلہ“ فرزانہ بیگم اور یہاں کے ساتھ اچھا ہوا۔ ”اپنوں کے درمیان“ فرشی شلوار کا سن رکھا ہے۔ لیکن پتا نہیں کیسی ہوتی ہے۔ ہنسی آگئی جب دادی نے اتنے پیار سے دانیہ سے پوچھا کیوں رو رہا ہے میرا بچہ۔ اسے بھی فرشی شلوار پہننی لگی۔ ایشی پھوپھو جیسی ہولی چاہیے، پھوپھو، امرت جیسی ملک ”چاہت کے انداز بہت اچھا لکھا۔ خالہ نے من کے لیے اچھا سوچا۔ ”موزو تو سارے من کے ہیں۔“ تاجور جیسی مائیں بھی ہوتی ہیں۔ جو نہ اپنا گھر بسنے دیتی ہیں اور نہ دوسروں کا اور بیٹیوں کو بھی اپنے جیسا بنانا چاہتی لگی۔ اور خود اپنے ہاتھ سے مار ڈالا۔“

تجھ سے بھی دُفریب" قاتلہ رابعہ نے اچھا لکھا۔ رحاب کی طرح میں بھی اپنے بچوں کے ساتھ کرتی ہوں لیکن بچے اپنی مرضی کرتے ہیں۔ رحاب نے یہ ہی سمجھا کہ اس کے جانے پر بچے اداس ہوئے لیکن ڈسٹرب نہیں ہوئے بلکہ انجائے کرتے رہے رحاب کو واپس آ کر دھچکا لگا۔ کہ بچے تو اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ سیرامید نے نئے سال پر بہت اچھا لکھا ہے۔ "موسم کے پکوان" پڑھے امی کو بولتی ہوں جو ڈش اچھی لگتی ہے بنا دیتی ہیں میری امی جیسا کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔

رمضان کی بھی خوشی ہے۔ اللہ کرے روزے رکھ لوں لیکن ناکلہ، بشارت بھائی اور عدنان آرہے ہیں بہت خوشی ہے سولہ کو راولپنڈی اسٹیشن اتریں گے لینے جائیں گے ان شاء اللہ۔

ج: پیاری رضوانہ.....! بہت خوشی ہوئی آپ نے محفل میں شرکت کی اللہ آپ کو صحت دے اور آپ رمضان کے روزے رکھ سکیں۔ ویسے آپ بیمار ہیں تو آپ روزہ چھوڑ سکتی ہیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نصرت جبین ملک..... خوشاب یوں تو شعاع کا ہر شمارہ ہی خاص ہوتا ہے مگر ماہ فروری کا شمارہ میرے لیے انتہائی خاص تھا کیونکہ اس میں میرا افسانہ پبلش ہوا، اس نوازش کے لیے میں آپ کی بے حد ممنون ہوں اب ہو جائے تبصرہ اس شمارے کی ان تحریروں پر جو میں اب تک پڑھ چکی ہوں۔ "اپنوں کے درمیان، میں خبریں اعجاز نے شروع میں جو جملے اور نوک جھونک فرشی شلوار پر دکھائی وہ مرہ دے گئی تو اسی ناولٹ کا اختتام دو خاندانوں کے ملاپ پر ہوا تو خوشی ہوئی۔

نادیہ جہانگیر "بہترین فیصلہ" میں مدیحہ بیگم نے اپنے گھر کے تحفظ اور سلامتی کے لیے بہترین فیصلہ کرانے میں کامیاب رہیں۔

"خالہ زبیدہ کا دسترخوان، کو مہوش نے نئے منظر نامہ میں لکھا اور اچھا پیش کیا۔" حیرے بعد "دعا ایوب کی دل کو چھو لینے والی تحریر بھی اگر ہم اپنے اندر موجود انسان کی بھی سننا شروع کر دیں تو ہماری زندگی کے بہت سارے مسائل اپنے ہاتھوں سے حل کر سکتے ہیں۔ ڈائجسٹ کے

ہاتی سلسلے بھی دلچسپی سے بھرپور ہیں۔

پیاری نصرت.....! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ شعاع کی تحریریں آپ کو پسند آئیں۔ بہت شکریہ۔

کراچی سے تسلیم کوثر شریک محفل میں لکھا ہے اس بار تو شعاع ہمیں 28 تاریخ کو ہی مل گیا اتنی جلدی ملنے پر خوشی ہوئی۔ فوراً آپ کی پیاری دل پسند بزم میں پہنچے۔ ماشاء اللہ افسانے ناول سب ہی زبردست لگے مگر حمیرا علی کا دلکش ناول موڑ تو سارے من کے ہیں بے حد اچھا مکمل جامع تحریر، بہترین کہانی سے دل خوش کرو یا طویل ہونے کے باوجود بھی شروع سے آخر تک دلچسپی برقرار رہی۔ بس یوں تجھے کہ ہمیں دل سے پسند آیا ہے۔ حمیرا کو بہت مبارک باد۔

مریم عزیز کا دھوپ درپچہ بھی اچھا لگ رہا ہے لگتا ہے، تھوڑی سی کہانی آگے بڑھی ہے یقیناً ان کا خوب صورت ناول شاہکار ناول میں شامل ہو جائے گا۔

بات ہے اپنا جائز حق لینے کے لیے بہادر بننا بہت ضروری ہے ورنہ تو لوگ جینے بھی نہ دیں۔ اسی طرح خالہ زبیدہ کا دسترخوان کو مہوش عروج نے بہت خوب سجایا ان کی اچھی سی نصیحت یا سبق آموز کہانی دل سے پسند آئی۔

اور سب سے مزید مافسانہ نادیہ جہانگیر کا بہترین فیصلہ لگا لیا لیکن بھی رشنا جیسی نایاب بہو تو نصیبوں والوں کو ملتی ہے۔ آج کل کے دور میں تو نیہا ٹائپ کی بہوئیں اور فرزانہ بیگم جیسی بیٹی کو سپورٹ کرنے والی امائیں بہت ہیں، اللہ ان سب کو ہدایت دے۔

اور نصرت جبین ملک کے چاہت کے انداز کا جواب نہیں خالہ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ان کی کہانی بے حد اچھی تھی۔ چار بالشت کا فاصلہ کوئی خاص نہیں لگا رفعت فاطمہ سے معذرت۔

قاتلہ رابعہ کی اسٹوری تجھ سے بھی دُفریب ہیں اچھی لگی بلکہ حقیقت سے قریب لگی۔ آج کل کے بچے چکا چوند سے متاثر ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی کسی کو پاد نہیں کرتا بس اچھی اعمال اور نیکیاں ہی تمہارے ساتھ جانی ہیں۔

پیاری تسنیم.....! آپ نے ہماری محفل کو رونق بخشی، اس کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ آپ کا فیصلی تبصرہ

بہت اچھا لگا۔

حسینہ یاسین مصباح نے کوٹ چٹھہ سے لکھا ہے
میں کرن، شعاع اور خواتین کی خاموش قاری ہوں
اور اس وقت سے ہوں جب الفاظ بھی ٹھیک سے پڑھنا
نہیں آتے تھے پڑھنے کے ساتھ لکھنے کا کب سے شوق
ہونے لگا تھا ہی نہیں چلا بڑی بہن آپلی سب اور پھر چھوٹی
بہن چاندنی کو بتایا تو انہوں نے شعاع میں بھجوا کے دم لیا
اور پہلے الگ کہانی ہے کہ چھوٹے بھائی محمد ابرار کی کتنی منتیں
کرتی پڑیں تب جا کے وہ کہانیاں ڈاک میں دے آیا۔
پیاری حسینہ آپ کی کہانیاں قابل اشاعت نہیں۔
آپ کو مزید محنت کی ضرورت ہے۔

صائمہ گل نے مردان سے لکھا ہے

نومبر سے جو مکتوبوں اور شادیوں کا جو سلسلہ شروع
ہوا ہے اب کہیں جا کر رکا ہے۔

آج تو پکا ارادہ کر لیا کہ جو ہوسو ہو آج ہی خط لکھ کر
کل پوسٹ کرانا ہے میاں صاحب کو کال ملائی۔ کل خط
پوسٹ کر دیں گے۔

”ہاں ہو جائے گا۔“ میاں جی کام میں مصروف۔
گندم کی فصل اپنے جو بن پر ہے۔ دو ماہ بعد گندم
کاٹنے کے قابل۔ اپریل کے اینڈ یا مئی کے اشارت میں
ان شاء اللہ۔

پہلی شعاع پڑھا ”گل پلازا“ والا واقعہ دل
دہلانے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم کرے۔ آمین۔

رمضان کے حوالے سے سروے ندارد۔ ”حمہ
ونعت“ اور پیارے نبی کی باتوں سے مستفید ہوئے۔ ”ناٹا
جوڑا“ خیر سے ہماری پیدائش سے پہلے کی داستان ہے۔
ویسے ناٹا جوڑا کے لیے ہمارے ہاتھ میں بھی کھجلی ہو رہی
ہے۔ لیکن اگر سب کچھ سچ لکھ دیا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے
گی۔ اس لیے رہنے دیتے ہیں۔ ہا ہا۔

فنکاروں سے زیادہ ہمیں رائٹرز سے ملنا پسند ہے۔
وہی دیا کریں۔ بہنوں کی محفل میں خوب رونق لگی۔ نسیم کوثر۔
پیاری سی سلٹی مسرت۔ مسرت حسن، رضوانہ وقاص، صدف
ناصر، فرخندہ سلیم، زرینہ خانم اور عدینہ لغاری ان سب بہنوں
سے شعاع کے ساتھ ساتھ اور خواتین کے سلسلے آپ کا

بارہی خانہ میں شرکت کی پر زور فرمائش ہے۔
سلٹی مسرت نے ماں ”پر کچھ لکھنے کی رائے دے کر
ہمارے دل کی بات کہہ دی۔ ان شاء اللہ بہت جلد آپ
”صائمہ گل کی امی جان“ کو پڑھ لیں گی۔

قادیانہ جی ”تھینک یو اللہ میاں“ از کرمل اشفاق حسین
کا تعارف دے کر آپ نے دل خوش کر دیا۔ جینٹل مین
سیریز میری لیورٹ میں سے ہے۔ ”چار آدمی“ کی تلاش
جاری ہے دیکھتے ہیں کب مستفید ہوتے ہیں۔ فروری کی
دھوپ میں بیٹھے دھوپ درپے میں جھانکا۔

زیل کو کچھ زیادہ ہی معصوم دکھایا جا رہا ہے۔
ویسے یہاں ”انگنا پھول“ والی ارم یاد آ جاتی
ہے۔ کتنا پیارا کردار تھا نا ارم کا نہ حد سے زیادہ معصوم نہ
زیادہ چالاک۔

آخر میں سب سے اہم بات جو میں کب سے بہت
چاہ رہی ہوں مدت ہوئی دیکھیں منظر پر کوئی تحریر نہیں
آئی۔ گاؤں دیہات کی خوش گوار محسوس، تازہ کھجلی دیکھ
گئی میں بنے پرائیوں کی مہک، لسی بلوٹی اہل، گاؤں کے
کنویں سے پرانہ جلائی ہستی مسکراتی پانی بھرتی
دو شیرازیں۔ کھیت میں مل جوتے تیل کے گھٹے میں
پڑے گھٹنے کی ٹخن ٹخن۔

گاؤں کا امام مسجد، اسکول ماسٹر یہ سب کچھ ستہ سحر
انجیز ہوتا تھا۔ مصنفین سے درخواست ہے اس طرف بھی
توجہ دیں۔

باقی تمام رسالہ زبردست تھا۔ بیوٹی بکس کے
مشورے پسند آئے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ گائے کا
خالص دودھ دستیاب ہے۔ وہی ہمارا کھینز بھی ہے نائٹ
کریم بھی کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ چہرہ چمک
اٹتا ہے۔

ج: پیاری صائمہ.....! آپ کا تفصیلی تبصرہ تعریف
وتغیہ بہت دلچسپ خوب صورت ہے بہت شکریہ۔

☆☆

موسم کے پیکوان

واصفہ سہیل

پر چھوہاروں کی گارنشنگ کر کے سرو کریں۔

عید شیر خور با

ضروری اشیاء:

کریمل سویاں

ضروری اشیاء:

ایک کپ	سویاں
ڈیڑھ لیٹر	دودھ
ایک کپ	چینی
حسب ضرورت	پستہ
حسب ضرورت	بادام
آدھا چائے کا چمچ	الائیچی پاؤڈر
حسب ضرورت	کھی

ترکیب:

ایک بھاری پیندے کی دہی میں تھوڑا سا کھی ڈال کر ہلکی آنچ پر گرم کر کے اس میں چینی کو ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔

جب پکھل کر سنہری ہو جائے (زیادہ نہ پکائیں ورنہ کڑوا پن آجائے گا) تو اس میں دودھ ڈال کر چمچ چلائیں تاکہ ابلے نہیں۔

مسلل چمچ چلائیں تاکہ چینی کس ہو جائے اس کے بعد سویاں ڈال کر پکائیں اور چمچ چلائی رہیں۔ سویاں گل جائیں اور گاڑھی ہونے لگیں تو الائیچی پاؤڈر ڈال کر آنچ سے اتار لیں۔

سرونگ باؤل میں نکال کر ٹھنڈا کریں اور پستہ بادام سے گارنش کر کے فریج میں رکھ کر خوب ٹھنڈا کرنے کے بعد پیش کریں۔

وائٹ چکن بریانی

اشیاء:

دو کلو	دودھ
ایک کپ	سویاں
آدھا پاؤ	چینی
آدھا کپ	چاول
آدھا پاؤ	فلاقتدیا کھویا
دس عدد	چھوٹی الائیچی
حسب ضرورت	کھی
حسب پسند	پستہ
حسب پسند	بادام
دو چائے کے چمچ	کیوڑا
چھ عدد	چھوہارے

ترکیب:

ایک دہی میں دودھ گرم کریں۔ اس میں چاول ابال کر مسل کر ڈالیں اور پکائیں۔ ایک پیں میں تھوڑا سا کھی گرم کریں۔ اس میں سویاں ڈال کر بھون لیں۔ سویاں بھی دودھ والے کسچر میں ڈال کر پکائیں۔ جب جوش آجائے تو آنچ کم کر دیں۔ دودھ کے گاڑھا ہونے تک پکائیں۔ اس کے بعد چینی اور کھویا، فلاقتدیا چورا کر کے ڈالیں کچھ دیر پکانے کے بعد بادام، پستہ ڈال دیں۔ کھی گرم کریں۔ الائیچی ڈال کر فرائی کریں۔ فرائی کرنے کے بعد سویوں میں ڈال دیں۔ آخر میں کیوڑہ ڈال کر چولہے سے اتار لیں۔ سرونگ باؤل میں نکال کر ٹھنڈا کر لیں، چھوہاروں کو پانی یا دودھ میں اتنا پکائیں کہ چھوہارے گل جائیں۔ چھوہاروں کے بیج نکال دیں۔ شیر خور با

چاول

پیار

دہی

ادرک لہسن

ہری مرچ پیسی

تیل

پسا گرم مسالہ

ٹماٹر

ثابت زیرہ

سونف

پیار زیرہ

نمک

پسی کالی مرچ

جائفل جاوتری

لیموں

آلو بخارہ

ہری مرچ

پودینہ

ترکیب:

ایک کلو

ایک کلو

تین عدد

ایک پاؤ

ڈھائی چمچ

آٹھ عدد

ایک پیالی

ایک چمچ

پانچ عدد

ایک چمچ

آدھا چمچ

آدھا چمچ

حسب پسند

ایک چمچ

آدھا چمچ

دو عدد

آٹھ عدد

آٹھ عدد

آدھی گھٹی

اشیاء:

قیمہ

بھنے چنے

ثابت لال مرچ

کالی مرچ

لونگ

دار چینی

کباب چینی

چھوٹی الائچی

بڑی الائچی

پیتا

ادرک لہسن

دھنیا

پیاز

زیرہ

لال مرچ

نمک

ہلدی

جائفل جاوتری

دہی

ترکیب:

ایک کلو

دو کھانے کے چمچے

آٹھ عدد

ایک چمچ

پانچ سے چھ عدد

ایک کلو

پندرہ دانے

چھ عدد

ایک عدد

تین چمچے

تین چمچے

دو چمچے

دو عدد

ایک چمچ

ڈیڑھ چمچ

ایک چمچ

ایک چمچ

آدھا چمچ

آدھا کپ

قیمہ باریک لیں اس میں سالے ملا کر چار گھنٹے رکھ دیں پوری رات بھی رکھ سکتے۔ ایک برتن میں آدھا کپ گھی میں پیاز کو باریک کاٹ کر براؤن کر لیں پھر قیمہ شامل کر دیں اور مستقل ہلاتے رہیں۔ پھر ڈھک کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ دس منٹ بعد گھی اوپر آجائے تو اتار لیں۔ کوئلہ کی دھونی بھی دے لیں مزیدار برنس روڈ کے وحید کے کباب تیار ہیں باریک کچھے دار پیاز، ادرک اور پودینہ کے ساتھ پیش کریں۔ پوری پرائیڈ یا چپاتی کے ساتھ مزہ دیتا ہے۔

تیل میں تین عدد پیاز براؤن کر لیں۔ بقیہ تیل میں چکن پسی ہوئی ہری مرچ، پسا گرم مسالہ ٹماٹر زیرہ پسی سونف نمک ڈال کر تیز آج پر پکائیں کالی مرچ ایک چمچ پسا ہوا زیرہ ڈال کر پکنے دیں۔ چکن گل جائے تو دو عدد ٹماٹر بھی ہری مرچ، باریک کٹا لیموں تلی پیاز پودینہ کو مکس کر کے اس چکن پر پھیلا دیں۔ چاول ایک کٹی چھوڑ کر ابال لیں۔ اب چکن کا جو مسالا ہے اس پر چاول پھیلا دیں اور دم پر رکھ دیں دو منٹ کے لیے ٹھوڑا سا کیوڑہ چھڑک دیں۔ مزے دار وائٹ بریانی تیار ہے۔

برنس روڈ کے وحید کے سیخ کباب

☆☆



اور خشک ہونے پر نیم گرم پانی سے دھولیں۔
آخری مرحلہ موچر انرنگ کا ہے۔
☆ ایلو دیرا کا جیل یا ناریل کا تیل ہلکے ہاتھوں
سے لگائیں۔

مٹی کیور

☆ ایک پیالے میں نیم گرم پانی لیں، اس میں
ایک چمچ نمک، اور تھوڑا سا برتن دھونے والا لیکوڈیا ہلکا
صابن ڈال دیں کس کریں اور دس سے پندرہ منٹ
اس میں ہاتھ بھگوئیں۔
☆ ایک چمچ چینی میں چند قطرے لیموں کا رس
ملا کر ہاتھوں پر پانچ سے تین منٹ مساج کریں۔
☆ اب تھوڑا سا شہد لگا کر پانچ منٹ کے بعد دھولیں۔
☆ آخر میں ناریل یا زیتون کے تیل سے
ناخنوں اور ہاتھوں کا مساج کریں۔

پیڈی کیور

☆ ٹب میں نیم گرم پانی ڈالیں اس میں ایک چمچ نمک،
ایک چمچ بیلنگ سوڈا ڈال کر پندرہ بیس منٹ پیر بھگوئیں۔
☆ چینی اور لیموں ملا کر ایریڈیوں اور انگلیوں پر
رگڑیں، سرسوں یا ناریل کے تیل سے مساج کریں
اور موزے پہن لیں۔

گلابی ہونٹ

☆ لیمو کا رس اور شہد ملا کر ہونٹوں پر لگائیں۔
یہ سیاہی دور کرنے میں مددگار ہے۔
☆ ایک چائے کا چمچ چینی اور شہد ملا کر ہلکے ہاتھ سے
ہونٹوں پر مساج کریں۔ یہ مردہ جلد کو صاف کرتا ہے۔
☆ گلاب کی پتیوں کو پیس کر دودھ میں ملا کر
ہونٹوں پر لگانے سے رنگت گلابی ہوتی ہے۔

☆☆

گھر پر عید کی تیاری

اس عید پر آپ گھر میں موجود قدرتی اشیاء سے
اپنی جلد کے نکھار کا کام بخوبی انجام دے کر فاضل
اخراجات سے بچ سکتی ہیں۔

چہرے کا فیشل

سب سے پہلا مرحلہ کلینزنگ یعنی چہرے کی
صفائی کا ہوتا ہے۔
☆ دو کھانے کے چمچے کچا دودھ لیں، اس میں
صاف ستھری روئی ڈبو کر چہرے اور گردن پر لگائیں
پھر چند منٹ ہلکے ہاتھ سے مساج کریں، اس کے
بعد نیم گرم پانی سے دھولیں۔
☆ دو کھانے کے چمچے گلاب کا عرق لیں اور
روئی کی مدد سے چہرے پر لگائیں پھر کاشن کے کسی نم
کپڑے سے چہرے کو اوپر کی جانب آہستگی سے
صاف کریں۔

دوسرا مرحلہ اسکرُب کا ہے۔

☆ ڈیڑھ چمچ (کھانے کا) بیسن میں تھوڑا سا دودھ
ملا کر پیسٹ سا بنائیں پھر اپنے چہرے پر لگائیں خشک
ہو جائے تو ہلکے ہاتھ سے رگڑیں، یوں مردہ خلیے جھڑ جائیں
گے۔ یا ایک چمچ چینی میں ایک چمچ شہد اچھی طرح کس
کر کے پھرے پر لگائیں ہلکے ہاتھ سے تین سے پانچ منٹ
مساج کریں پھر سادے پانی سے دھولیں۔

تیسرا مرحلہ فیس ٹیک کا ہے۔

☆ ایک چمچ دہی میں ایک چمچ بیسن اور چٹکی بھر
ہلدی ملا لیں۔ چہرے پر لگائیں اور پندرہ بیس منٹ
بعد دھولیں۔

☆ ایک انڈے کی زردی میں چٹکی بھر ہلدی، دو
تین قطرے بادام کا تیل کس کر کے چہرے پر لگائیں